

غراتین اور دوشیزاؤں کیلئے اکیسویں صدی کا منفرد ماہنامہ

رضا ڈائجسٹ

MARCH
2016

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PDFBOOKSFREE.PK

ماڈل: صائمہ انصار
میک اپ: روزہ بی بی پاپل
فوتو گرافی: سہیل رضا

ردائے اجسٹ

چیف ایڈیٹر
مسالہ محمود

ایڈیٹر
سقی محمود جعفری
نشانہ بریک، قراچہ جعفری
E-Mail: trazjehri@out.com
نشانہ UAE، عجم علی جعفری
E-Mail: eajjehri@omninet.net.ae
نشانہ سن، قراچہ آصف خان



VIRTUAL LIBRARY
pdfbooksfree.pk

سلسلے وار ناول

تجھ سے مانگوں میں تجھ کو شازیہ مصطفیٰ ۱۰
چل اڑ جاں تیری باری عائشہ ذوالفقار ۲۱۸

مکمل ناول

تہائیوں کے شہر میں اقراء چننا ۳۸
اک خواب کا نیلا پھول کھلے نائلہ طارق ۹۶
ایقان علی ۱۵۶

ناولٹ

سرفصل سکوت جاناں ثناء کنول ۶۲

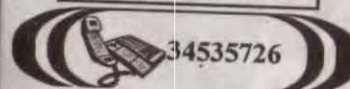
مارچ 2016ء

جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 3

قیمت 60 روپے

ذریعہ سالانہ بین الاقوامی رجسٹری

720 روپے



34535726

پبلشر وائیٹر صالی محمود نے این حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۱۹/۱ ڈی بلاک 2۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

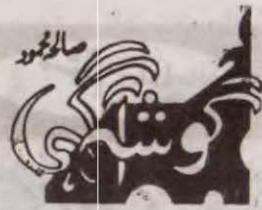
انتباہ:

ماہنامہ ”ردا“ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈراما کی تکمیل اور سلسلے وار کی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چھپڑی کی ایف آئی آر درج کرانے کا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ ”ردا“ شکایتیں۔“

مستقل سلسلے

ردائے جنت صالی محمود ۷ سندھیے
ردا کی ڈائری صدف سعد ۲۳۲ کچن
ذرا پھر سے کہنا شہلا مشائق ۲۴۴ سنگھار
خوشبو نورین ملک ۲۴۰ اشعار
اس ماہ میں نورین ملک ۲۳۶ دوستوں کے نام پیغام
۲۴۷ صالی محمود
۲۵۴ ثریا اقبال
۲۵۷ شہلا مشائق
۲۳۴ نورین ملک
۲۵۱ ادارہ





نئی ساعتوں کے ساتھ آپ سے مخاطب ہے۔ آپ کے سہیلے ہمیں تروتازہ کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے آنے سامنے آ بیٹھے ہیں۔ زندگی کے خوشگوار لحاظ ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں۔ جہاں ہم ایک دوسرے سے شیر کرتے ہیں وہیں ذات باری تعالیٰ سے دعاؤں کی استدعا بھی ہوتی رہتی ہے۔ لحاظ پھر ایک دوسرے سے چھڑ جاتے ہیں اور ہم پھر ایک دوسرے سے آ ملتے ہیں۔ خوشیوں بھری شام اور یہ دن جو ہم فروری کے پچھلے پہر میں چھوڑ آئے ہیں آگے کا سفر پھر جاری و ساری ہے۔

محبتوں اور ہماری چاہتوں میں آپ سب آباد رہتے ہیں۔ خوشیاں ڈھونڈنے کے لیے فاصلوں کو نہیں قرب کو ڈھونڈتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم کینہ اور حسد سے جب بچتے ہیں تو ہمارا قلب پاک ہوتا ہے۔ پاکیزگی اللہ کو پسند ہے جسم اور روح کی پاکیزگی بھی یہ ہے کہ ہمارے جسم سے زیادہ ہماری روح تروتازہ رہتی ہے۔ جسم ایک مادی شے ہے۔ روح ایک حقیقی عنصر جو قائم اور دائم ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ ہم روح اور قلب کی پاکیزگی کے ساتھ ایک دن اٹھائے جائیں گے۔ اس یقین کے ساتھ زندہ رہیں کہ ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی روح کو پاک و صاف رکھنا ہے۔ قلب انسانی میں جو سوسے ہوتے ہیں وہ ہمیں نقصان سے فریب اور فائدے سے دور کر دیتے ہیں۔ سچی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی روح کے اندر خود کو دیکھ سکتے ہیں۔

بس ایک چھوٹی سی بات کہ اپنے آپ کو ہر برائی سے بچائے رکھیے اگر گرد رہنے والوں سے محبت اور خوشی کا اظہار کیجیے۔ ضد، غصہ، حسد، ذہنی بیماریاں ہیں ان سے بچتے اور خود کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ان بیماریوں سے دور رہیے۔

ماہ مارچ کا ردا آپ کو کیسا لگا یہ ضرور لکھئے گا۔ سندیلے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ ہمیں اپنی آرا سے آگاہ کیجیے۔

آپی

ایمان اور اس کے مسائل
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمان وہ آدمی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ آدمی ہے جس سے لوگوں کے خون اور مال محفوظ ہوں۔“ (ترمذی، نسائی، ابن ابی ہریرہ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جو وعدے کا خیال نہیں کرتا اس کے دین کا کوئی اعتبار نہیں۔“ (بیہقی، ابن ابی ہریرہ)

کبیرہ گناہوں اور نفاق کی علامات کا بیان
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کوئی آدمی زنا کرتا ہے تو اس (کے جسم) سے اس کا ایمان نکل کر اس کے سر پر سائے کی مثل رہتا ہے اور جب وہ اس فعل سے رک جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف واپس لوٹ آتا ہے۔“ (ترمذی، ابن ابی ہریرہ)

ایک یہودی نے اپنے سامعی سے کہا کہ آؤ اس نبی (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلیں تو اس کے سامعی نے اس سے کہا کہ انہیں نبی نہ کہو۔ اگر اس نے تم سے یہ الفاظ سن لیے تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی وہ خوشی سے پھولے نہیں سانس لے گے) چنانچہ وہ دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح احکامات کے بارے میں سوال کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم اللہ کے

ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو۔ جس جان کو اللہ تعالیٰ نے قتل کرنا حرام قرار دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کرو۔ کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لیے (اس پر غلط الزام لگا کر) حاکم کے پاس نہ لے جاؤ۔ چادو نہ کرو، سود نہ لھاؤ۔ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت نہ لگاؤ۔ میدان جنگ سے نہ بھاگو اور اسے یہودیوں! تمہارے لیے خاص حکم یہ ہے کہ ہفتہ کے دن (حکم الہی سے تجاوز نہ کرو۔) (یہ سن کر) ان دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو چومنا اور فرار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر تمہیں میری پیروی سے کون سی چیز روک رہی ہے؟“ انہوں نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ نبوت کا سلسلہ ہمیشہ نبی کی اولاد میں چلنا رہے۔ لہذا ہمیں خطرہ ہے اگر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے۔ (ترمذی، نسائی، ابن صفوان بن عسال)

(وضاحت: یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تذکرہ موجود تھا انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا اس طرح یقین تھا جس طرح کسی کو اس کی اولاد اپنی ہونے کا یقین ہوتا ہے مگر حسد اور بغض کی وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔ داؤد علیہ السلام کی دعا یہودیوں کی اپنی گمراہی ہوئی بات تھی انہوں نے ایسی دعا نہیں کی تھی اس لیے کہ انہوں نے خود تورات اور زبور میں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا پڑھ رکھا تھا۔)

وسوسہ کا بیان

ایک صحابی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے دل میں ایسے خیالات پاتا ہوں کہ زبان سے ان کے اظہار کے بجائے جل کر کونڈہ ہو جاتا مجھے زیادہ پسند ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کا شکر ہے جس نے ان خیالوں کو وسوسوں تک محدود رکھا۔“ (اور انہیں یقین و عمل کا حصہ نہیں بننے دیا)۔ (ابوداؤد۔ عن ابن عباس)

تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

(وضاحت: تقدیر کے معنی مقدار مقرر کرنا ہے۔ اصطلاح شریعت میں افعال مخلوق (مخلوق کے اچھے یا برے کاموں) کے بارے میں مالک ارض وسمانے جو کچھ لکھا ہے وہ تقدیر کہلاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تقدیر اللہ رب العزت کا علم مستقبل ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ تقدیر کے بارے میں پانی جانے والی انجنوں کا سبب اس کے صحیح مفہوم سے عدم واقفیت ہے۔ معنی و مفہوم سمجھ لینے کے بعد اس کی بابت کوئی اشکال باقی نہیں رہتا یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ انسان اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لیتا ہے اور اس کے انتہائی محدود علم کے باوجود بعض اوقات اس کی رائے اور اندازہ سو فیصد درست ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کا علم اس قدر وسیع اور نہ ختم ہونے والا ہے کہ اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل غائب اور حاضر، دن اور رات، روشنی اور تاریکی جیسی اصطلاحات بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے سامنے ہر چیز کی کتاب کی طرح ہے اس وسیع اور لامحدود علم کی بدولت مخلوق کے بارے میں اس کی لکھی ہوئی تقدیر بھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسی وسیع علم کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے عمل کرنے سے

پہلے ہی اس کے حساب (کھاتے) میں لکھ دیا ہے کہ یہ انسان اچھے یا برے اور کیا کیا کام کرے گا اور اس کی جزایا سزا کیا ہوگی۔ ہادی کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”ایک آدمی مسلسل نیک کام کرتا ہے یہاں تک کہ بالکل جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے پھر اچانک وہی آدمی تقدیر کے مطابق برے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ دوزخ میں چلا جاتا ہے اسی طرح ایک آدمی برے کام کرتا ہے اور دوزخ کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے پھر وہ اچانک تقدیر کے مطابق اچھے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔“ (صحیح بخاری کتاب القدر)۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتے ہیں کہ کون کب اور کیا عمل کرے گا وہ اپنے وسیع علم کی بدولت یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ گناہ گار انسان آخر کار توبہ کر لے گا اور نیک عمل کرنے لگے گا اور اسی (اچھے عمل) پر اس کا ہوگا یا یہ نیکی کرنے والا بالآخر نیکی کا دامن چھوڑ کر گناہوں کی طرف راغب ہو جائے گا اور اسی برائی کی حالت میں اس کا خاتمہ ہوگا۔

تقدیر کے بارے میں یہ تاثر انتہائی گمراہ کن ہے کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے اور وہ اپنی مرضی اور اختیار سے کچھ نہیں کر سکتا حالانکہ نیکی اور برائی کی راہ اختیار کرنا انسان کا اپنا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی جبر نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک استاد امتحان سے پہلے اپنے شاگردوں کے بارے میں اندازہ لگاتا ہے کہ فلاں پاس ہوگا فلاں فیل ہوگا اور اگر استاد کا اندازہ درست ثابت ہو جائے تو یہ ہرگز نہیں کہا جاسکے گا کہ یہ استاد کے اندازے کی وجہ سے پاس یا فیل ہوئے ہیں۔ پاس یا فیل ہونا اس کے اپنے عمل کی وجہ سے ہے جس طرح استاد کا اندازہ لگنا شاگردوں کو پاس یا فیل ہونے پر مجبور نہیں کرتا اسی طرح اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے بارے میں اپنے علم مستقبل کی وجہ سے تقدیر لکھنا انسانوں کو کسی کام پر ہرگز مجبور نہیں کرتا ہے۔ ☆

تجہ سے مانگ کر میں تجہ کر

شہر یار نے بھی خاصی توجہ سے فلیٹ سجا کے رکھا تھا۔
”آپ کی ڈیوٹی کب سے اسٹارٹ ہے؟“



”کل سے جوائن کرنا ہے چھٹیاں بھی ختم ہو گئی ہیں۔“ وہ اس کی پشت پر آ گیا۔

”ارے کیا کرتے ہیں مجھے ناشتہ تو بنانے دیں۔“

”تم اس صلیے میں گھومتی رہو گی تو میری نیت خراب ہوتی رہے گی۔“ وہ معنی خیزی سے بول رہا تھا۔

”آپ بھی بس..... ایسے۔“ اس نے زبردستی شہر یار کو ہٹایا۔

”یار! اپنی بیوی کو پیار کر رہا ہوں۔“

”پیار و محبت کا بھی وقت ہوتا ہے۔“ وہ شرمائی تھی۔

”ہمارے پیار و محبت کے ہر وقت ہی ہیں تاکہ تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ میں یہاں لا کے تم پر توجہ نہیں دے رہا۔“

”ہاں اپنے مطلب کی باتیں یاد رہتی ہیں۔“ ناشتہ تیار کر کے وہ ڈائننگ ٹیبل پر لگا چکی تھی۔

”ایسی بھی بات نہیں ہے تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ آج میں تمہیں گھماؤں گا پھر اوں گا۔“ وہ سلاکس



کھانے لگا۔

”مجھے حجاب سے فون پر بات کرنی ہے۔“

”آکے رات میں آرام سے کریں گے ابھی تو تم جلدی سے تیاری کرو۔“ اس نے حکم دیا۔ حسی حجاب سے پوچھنا چاہتی تھی ضرر ان سے صلح کر لی کہ نہیں کیونکہ وہ یہاں آنے سے پہلے کافی لمبا لکچر دے کے آئی تھی وہ بھی تو شہر یاری کی محبت پاکے بہت خوش تھی۔

☆.....☆

مریم کی خالہ نے ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ فاران کے گھر والوں کا مقابلہ کرتے۔ مرضی علی نے بھی انہیں زیادہ کچھ کرنے سے منع کیا تھا۔ بارات میں بھی صرف گھر کے افراد ہی آرہے تھے۔ ویسے پر خاصا اہتمام تھا۔

”لگتی تیاری اور کرنی ہے آپ لوگوں نے تو تو یہیں بجا دیئے۔“ اشرف علی خاصے برہم ہو رہے تھے۔

”ارے لڑکیوں کہاں ہو؟“ نزہت نے ہال کمرے سے سب کو آواز دی۔

”امی! میں تو تیار ہوں ماہ رخ اور چچی جان بھی آ رہی ہیں۔“

”خوشنما کا پتا کرو وہ تیار ہوئی یا نہیں۔“ نزہت اسے کچھ دنوں سے اہمیت دینے لگی تھیں۔ جوہم حیرت و انبساط میں مبتلا ہو کے انہیں دیکھنے لگی جو فان ملکر کی نفیس کامدانی والی ساڑھی میں سو برگ رہی تھیں۔

”میرا منہ کیا تنک رہی ہو، دیکھ کے آؤ اسے۔“ ساتھ ہی انہوں نے اسے ڈپٹ کے حکم دیا اور خود باقی لوگوں کی تیاری دیکھنے اندر آچکی تھیں۔ جوہم نے خوشنما کو خوش ہو کر بتایا تھا۔ وہ بھی مطمئن اور خوش ہوئی تھی۔

ریڈ جدید اسٹائلش ڈریس میں وہ جیولری میک اپ میں اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ پیشم کڑھے ہوئے گرتے شلوار میں ملبوس ڈینٹ لگ رہا تھا، وہ فنی دفعہ اسے چوری چوری غور سے دیکھ رہا تھا۔ خوشنما اس کی یہ حرکت کئی دفعہ نوٹ کر چکی تھی۔

فاران بھی شیر وانی کلاہ میں شہزادوں سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

شاہدہ اور مرضی علی سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا کہہ رہے تھے۔

خوشنما بھی اپنے ڈریس کو سنہالتی ہوئی آگے آگے جا رہی تھی۔

”ذرا آرام سے، کہیں گرنہ جانا۔“ پیشم کی شوخ سی آواز نے اسے پزل کر دیا۔

”چلو میری گاڑی میں بیٹھو۔“ وہ گیٹ سے باہر اس کا ہاتھ پکڑے لے جا رہا تھا۔

”ارے اس نے نوے نوے کو تو دیکھو۔“ مہراں کی بھی رگ ظرافت پھڑکی۔

خوشنما نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ سارے ہی ساتھ نکل پڑے تھے۔

فاران مرضی علی کے ساتھ بیٹھا تھا گاڑی کو بہت خوب صورت سجایا گیا تھا جو پیشم نے ہی سجائی تھی۔

”کتنا خوش لگ رہا ہے فاران۔“ پیشم نے رشک بھری نگاہوں سے دیکھا۔

وہ پہلو بدل کے رہ گئی اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

”ظاہر ہے خوش کیوں نہ ہو اس کی بیوی جو خوش ہوگی اسے پاکے۔“ خوشنما کی فہمائش نگاہ نے اسے گھورا۔

”ہر کوئی آپ کی طرح تھوڑی ہی ہوگا، اپنی شادی سے سب خوش ہوتے ہیں۔“

”اے بیوی تم اب مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔“ گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھال کے اس کے قاتل حسن کو آنکھوں میں کب سے جذب کر رہا تھا۔

خوشنما کا بھی دل آج مختلف انداز میں دھڑک رہا تھا۔ پیشم کی شوخیاں خوشنما کے روڈ رویے کی وجہ سے بھی کم نہیں ہو رہی تھیں۔

آگے پیچھے گاڑیاں روانہ ہو چکی تھیں۔

”میں الزام نہیں لگا رہی جو حقیقت ہے وہ بول رہی ہوں۔“ ماتھے پر لگی بندیا اس کے چہرے کو اور دلنشین بنا رہی تھی۔

”حقیقت تو یہی ہے کہ میں تم سے سچی محبت اور پیار کرنے لگا ہوں۔“ وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا سب کی گاڑیاں آگے جا کے الگ الگ ہو گئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک کا ایک جھوم تھا۔ ساتھ چلنا محال تھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ منمنائی۔

”تم تو لگتا ہے جب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا جب ہی یقین کرو گی۔“

”اللہ نہ کرے کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں دھیان سے گاڑی ڈرائیو کریں۔“ خوشنما تو یہ سب تصور بھی نہیں کر سکتی وہ پیشم سے پیار کرنے لگی تھی اس کی ایسی باتیں روح فرسا تھیں وہ اپنے منہ سے اقرار کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

”بیوی والا انداز ہے۔“

”بیوی ہوں تو انداز بھی وہی ہوگا۔“ وہ پورے راستے درود شریف اور آیہ انکری کا ورد کرتی رہی اور پیشم سے بات کرنے سے گریز کیا کیونکہ وہ مسلسل الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا اور وہ ایسی کوئی بد مزگی نہیں چاہتی تھی۔ سب کچھ اتنا اچھا ہو گیا تھا اسے سب اچھا لگنے لگا تھا۔ بڑی مامی کا رویہ بھی اس کے ساتھ اچھا ہوتا جا رہا تھا۔

☆.....☆

”کیا بات ہے صبح سے لوگوں کو فرصت ہی نہیں ہے۔“ ضرر ان نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی ذرا خفگی سے کہا۔

”جی ایسی کوئی بات نہیں ہے، نوشین اور کرن کی مٹکی کے فنکشن کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی تھکن ہو گئی ہے۔“ وہ عذر پیش کرنے لگی۔

”مٹکی ہوئے بھی آج تیسرا دن ہے۔“ وہ لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔

”آپ کے بھائیوں نے خود گھر اتنا پھیلا یا ہے اسے بھی سمیٹنا تھا۔“ وہ بالوں کو جوڑے کی طرح پلیٹ کے اس کے برابر ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”سب کچھ اتنا اچھا ہو گیا ہے مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا۔“ حباب کو تو یقین نہیں ہو رہا تھا۔

”ہاں تو ہے،“ ضرر ان نے بھی تائیدی سر ہلایا۔

”دونوں کے منگیتر بھی اچھے ہیں۔“ فیلی اچھی ہے۔“ حباب کو یہ زیادہ خوشی تھی کہ لوگ اچھے تھے اور نوشین کی جو سوچ بھی اس کے مطابق ملے تھے۔

”اچھا اگر آپ ان تمام باتوں سے فارغ ہو گئی ہوں تو ادھر بھی بات کر لیں۔“ ضرر ان نے لیپ ٹاپ کا

حباب جزبزی ہوگئی تھی وہ کچھ دیر تک ایسے ہی اسے دیکھتی رہی پھر مسکرانے لگی۔
”اچھا آئی ہوں کچھ دیر میں۔“

”جاؤ جاؤ۔“ وہ روٹھ کے لیٹ گیا تھا۔ حباب جانتی تھی اسے کیسے منانا ہے۔

☆.....☆

رخصتی بارہ بجے سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ بارات بھی واپس جلدی ہی آگئی تھی سب ہی چیلنج کر کے فری ہو گئے تھے۔

”تم جا کے ذرا مریم کے کمرے میں یہ کھانے کا سامان رکھ آنا اس کی خالہ بتا رہی تھیں اس نے کچھ کھایا پیانہ نہیں ہے۔“ نزہت نے اسے مخاطب کیا جو ایزی سے قمیض شلوار میں ملبوس سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔

”جی اچھا۔“ خوشنما تو حیران ہی رہ گئی نزہت نے اسے آج یوں مخاطب جو کیا تھا۔

”ارے اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو بیٹا۔“

”آپ اتنے عرصے بعد مجھ سے اتنے اچھے انداز میں جو بولی ہیں۔“ خوشنما صاف گومزاج کی تھی۔ اس نے آہستگی سے یہ کہہ دیا۔

”بیٹا! میں ہی غلطی پر تھی جو تم سے غلط رویہ رکھتی رہی اور ہشتم بھی دیکھو مجھ سے دور ہو گیا جانے غصے میں اسے کیا کیا کہہ دیا۔“ نزہت واقعی بہت شرمندہ تھیں اگر مرثیٰ علی انہیں نہیں سمجھاتے تو وہ سب کے ساتھ غلط کرتی رہتیں۔

”مامی آپ ایسا نہیں سوچے آپ تو ہماری بڑی ہیں۔“

”بڑے ایسے ہوتے ہیں اپنے بچوں کو ہی برا بولتے ہیں اور دیکھو میرے بڑے بول ہی میرے آگے آئے ہیں فاران کی شادی.....!“

”مامی آپ ایسی بات نہ کریں آپ فاران بھائی کی شادی سے خوش ہیں؟“

”ہوں میں خوش ہوں کیونکہ ہمیں اولادوں کی خوشی میں خوش رہنا چاہیے فاران نے اچھی لڑکی سے ہی شادی کی ہے یہ میرے دل کو سکون ہے۔“ ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

”ارے جی آپ چائے بنا رہی ہیں یا پائے بنا رہی ہیں ہشتم بھائی پوچھ رہے ہیں۔“ مہراں کچن میں ایک دم سے آگیا۔

”ہاں ہاں لے کے آرہی ہوں۔“

”تم چائے کو چھوڑو میں بنا لوں گی تم بس مریم کے پاس چلی جاؤ۔“ انہوں نے اسے ہدایت دیں۔ وہ پھر مریم کے کھانے کے لوازمات کی ٹرے لے کر اوپر جانے لگی۔

ہشتم کی نگاہ اس پر اٹھی اسے چائے لانے کو کہا تھا وہ اوپر جا رہی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”یہ لے کے، فاران بھائی کے روم میں، مریم کے لیے کھانا و قہرہ ہے۔“ اس نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

”جلدی سے آؤ۔“ وہ ساتھ ہی ہدایت بھی دینے لگا پنک کاٹن کے ایمبرائیڈری کے کپڑوں میں وہ ابھی

رخ ادھر کیا۔

سامنے اسکرین پر شہر یار اور حسیٰ نظر آئے۔

”ارے شہر یار ماموں، حسیٰ آنٹی کیسی ہیں؟“ وہ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر فوراً مسرت سے گویا ہوئی۔
”ہم تو الحمد للہ خیریت سے ہیں تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔“ حسیٰ کی خوشی سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز آئی

وہ ویسے بھی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

”ہم بھی ٹھیک ہیں۔“ حباب نے ہنس کے ہی جواب دیا۔

”حسیٰ آنٹی! آپ تو بہت پیاری ہوگئی ہیں۔“

”ارے کیا تم لوگ یہ باتیں کرنے بیٹھ گئے یہ بتاؤ وہاں سب ٹھیک تو ہے اور خوش خبری ہے کوئی۔“

ضمیر ان نے تو حباب کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اپنی مسکراہٹ دہائی۔

”کیا ہے! آپ تو شروع ہو جاتی ہیں۔“ اسے شہر یار اور ضمیر ان کی موجودگی میں حسیٰ آنے لگی۔

”میں نے تو سچ نہیں سنا۔“ ضمیر ان اسے تنگ کرنے لگا۔ کافی دیر تک ان لوگوں کی باتیں ہوتی رہیں۔

شہر یار نے ہی خدا حافظ کہا تھا ورنہ تو حسیٰ اور حباب کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

”حسیٰ آنٹی! تکی خوش اور پیاری لگ رہی ہیں۔“

”خوش اور پیاری تو آپ بھی ہیں۔“ ضمیر ان نے آنکھوں میں خمار لیے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا۔

”میں ان کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ جھینپ گئی۔

”میں تمہاری بات کر رہا ہوں جان من۔“ اس پر شوخیاں سوار ہونے لگیں۔

”ارے کیا کرتے ہیں مجھے اسنے کام کرنے ہیں۔“

”بھڑا میں گئے تمہارے کام ابھی صرف میری بات ہوگی۔“ وہ اسے اپنے پہلو میں گرا کے گویا ہوا۔

”آپ ضرورت سے زیادہ شوخ نہیں ہو گئے؟“ حباب کو وہ حیران ہی کر رہا تھا۔

”میں ایسا ہی شوخ ہوں وہ تو تم نے ہی خاطر میں نہیں لیا۔ وہی سوگ منائی رہیں ہماری شادی ایسے کیوں

ہوگئی۔ ارے وہ تو بھلا ہو چند امیاں کا جو انہوں نے ہمیں ملا دیا۔“

”چند امیاں نے نہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ملایا ہے۔“ فوراً فحش کی۔

”نگر سب تو وہی بنے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو ملا دیا میں تو صرف تمہیں سوچتا تھا مگر کبھی یہ نہیں

سوچا تھا کہ میرا اور تمہارا رن ٹھی ہوگا۔“ اس نے حباب کے جانے کے تمام راستے مسدود ہی کر دیئے۔

”میرے خیال میں مجھے اٹھنا چاہیے ابھی رات کا کھانا بھی بنانا ہے۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”تمہیں کیا ہوا رات کام یاد آتے رہتے ہیں۔“ وہ بھنا گیا۔

”آج اگر آپ نے چھٹی کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں سارے کاموں کی چھٹی ہے۔ ابو جلدی کھانا

کھاتے ہیں آپ کو پتا ہے میں اس لیے جلدی کھانا بنا لیتی ہوں۔“ وہ وضاحت دینے لگی۔

”امی سے بولوں گا آدم کی بھی جلدی شادی کریں تاکہ تم کاموں کا بہانہ کم بناؤ۔“

”آپ تو بچ میں ناراض ہو گئے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”جاؤ یہاں سے اپنے سارے کام انجام دے لو، میرا کام ہی انجام نہیں دینا۔“ وہ واقعی خفگی دکھاتا ہوا دور

ہو کے لیٹ گیا۔

تک اسی میک اپ میں تھی کتنی حسین لگ رہی تھی بیشم کو اپنے نفس کی لگام کو تھامنا آج بہت مشکل لگ رہا تھا وہ بھی ان سب کے درمیان آ کے بیٹھ گیا۔

فاران نے اسے بغور دیکھا جیسے کسی بات کو جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کیا بات ہے کچھ بات ہوگئی؟“

”نہیں..... کچھ نہیں۔“ وہ جھنجھلا کے کھڑا ہو گیا۔

”اور سن جا تو اپنے روم میں اور میری والی کو بھیج۔“

”اوا چھا اب سمجھا جلن ہو رہی ہے۔“ اس نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ واقعی بہت کھسیا ہوا تھا۔

”یہ سب تیری ہی حرکتوں کا نتیجہ ہے۔“

”اچھا، اچھا بس اپنی فکر کرو بے چاری ابھی سے ڈری بیٹھی ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔“ وہ اس کے قریب ہو گیا۔

”جب ہی کھانا وغیرہ کھا کے نہیں آئی ہے تمہاری محترمہ۔“

”وہ تو ہر لڑکی شادی والے دن کھا کے نہیں آتی ہے۔“ فاران ایسے بولا جیسے سب کے متعلق جانتا ہو۔

”تم دونوں کن جھگڑوں میں پڑے ہو۔“ شاہدہ کافی دیر سے دونوں کو اچھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

”چائے کا انتظار کر رہا ہوں وہ ابھی تک نہیں آئی۔“ بیشم جھٹ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

”چائے آ چکی ہے تم لوگ ہی لڑنے میں لگے تھے۔“

سارے لوگ ہال کمرے میں جمع تھے اور اپنی اپنی خوش گپیوں میں لگے تھے۔ نزہت سب میں چائے سرو

کر رہی تھیں۔

”اتھو تم لوگ اور اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

فاران سر جھکانے لگا جب کہ بیشم پہلو بدل کے رہ گیا۔ نزہت مامی سے کب اس کی بات چیت تھی۔ کتنی

دور ہوگئی تھیں اور آج انہوں نے اسے چائے دی اس پر تو حیرانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

”امی ابھی جارہا ہوں ذرا چائے پی لوں۔“

”چائے اپنے ساتھ اوپر لے جاؤ بہت دیر ہوگئی ہے۔“ صبح سب کو پھر کل کے فنکشن کی بھی تیاری کرنی

ہے۔

بیشم چائے کے سب لے رہا تھا۔

”امی کل تو اس کا بھی ولیہ ہے۔“

”میرا اتنا پرانا ولیہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اٹھ گیا۔

نزہت اس کی خفگی سمجھ رہی تھیں اور دیکھ رہی تھیں انہوں نے اسے بالکل فاران کی ہی طرح سمجھا تھا۔ پتا

نہیں انہیں کیا ہو گیا تھا کہ ان میں فرق کرنے لگی تھیں۔

”امی! بیشم کے ساتھ آپ نے اچھا نہیں کیا۔“

”تم اس کی فکر نہیں کرو وہ بھی میرا بیٹا ہے سنبھال لوں گی۔“ بیشم اوپر جا رہا تھا نزہت کو احساس تھا انہوں

نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔

”تم جاؤ ورنہ تمہارے ابو ڈانٹیں گے پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے میں ان لوگوں کو بھی سونے کے لیے بھیجتی ہوں۔“ وہ جلدی جلدی سب سے اٹھنے کا کہنے لگیں۔

”آج لگی ہے نا مجھے اپنی بڑی بہو اس گھر کی بڑی۔“ مرتضیٰ علی بہت خوش تھے۔ نزہت نے پہلی کی طرح

اپنا انداز کر لیا تھا۔ بڑی بن کے سب کو لے کے چل رہی تھیں۔

”سنو! شاہدہ کل بیشم کے روم کا بھی کرتا ہے۔“

”جی بھابھی! مگر وہ بیشم اور خوشنا.....! وہ دونوں تو کبھی نہیں مانیں گے۔“

”یہ لوگ جب کمرے سے نکلیں گے تو تم اشرف سے کہہ کر کروانا وہ دو تین بندوں کو لگا دے گا جلدی کمر

سیٹ ہو جائے گا۔“

”اچھا دیکھتی ہوں کیونکہ ولیہ کے فنکشن میں بھی تو پہنچنا ہوگا۔“

شاہدہ کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ بیشم اور خوشنا تو کسی طرح بھی نہیں مانیں گے۔

سب ہی اٹھ کے اپنے اپنے روم میں چلے گئے تھے۔ بیشم کب سے اس کا انتظار کر رہا تھا مگر لگتا تھا وہ

جان بوجھ کے نہیں آرہی تھی۔

”پتا نہیں کب تک یہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی۔“ وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ اسے کسی لڑکی سے پیار ہوا تھا اور پیار بھی اس لڑکی سے جو اس کی بیوی ہی تھی، کبھی

اس نے دوسری طرف سوچا ہی نہیں تھا وہ خود حیران تھا کیسے وہ کسی لڑکی کا ایسا دیوانہ ہو سکتا ہے۔

کتنی بار وہ محبت کا یقین دلا چکا تھا مگر لگتا تھا وہ ابھی بھی بے اعتبار ہی تھی۔

وہ اس سے کیسے اسے مانگے کہ وہ اپنا آپ اپنے دل سمیت اس کے حوالے کر دے۔

”اس وقت جھٹ سے دروازہ کھلا تھا وہ اندر آئی تھی۔ اسے عشاء کی نماز بھی پڑھنی تھی۔ باقی کی نمازیں

قضا پڑھنی تھیں۔ دو گھنٹے لگ کے میک اپ اترتا وہ ڈرینگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے پہلے

بالوں کا میز اسٹائل کھولنے لگی۔

بیشم ایسے بن گیا جیسے سو رہا ہو وہ اپنے کام انجام دیتی رہی اور وہ لیٹا رہا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی

تھی۔

خوشنا بھی نماز وغیرہ سے فارغ ہو کے اسی حلیے میں آ کر لیٹ گئی۔ آج اسے نزہت مامی کا مخاطب کرنا

بہت اچھا لگتا تھا اس نے تو اپنے دل سے سب کو معاف کر دیا تھا مگر اس شخص کی جانب پہل کرتے ہوئے وہ ہچکچا

رہی تھی۔

☆.....☆

آج پھر ذرا کرم صاحب نے راشدہ کو اچھی طرح احساس دلایا تھا۔ وہ ندامت سے سر جھکا کر رہ گئی تھیں۔

رضوانہ نے کتنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا ان کی ایسی باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے بیٹے سے ان کی بیٹی کا رشتہ

جوڑا تھا۔

”راشدہ! تمہیں تو ایسی عورت کو سلام کرنا چاہیے تم سب کے ایسے سلوک کی وجہ سے بھی تم سب سے اچھا

برتاؤ ہی رکھتی ہیں۔ تمہاری امی نے کون سی کسر چھوڑی تھی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر سے نکالا اور

تم نے ان بچوں کے باپ کو زبردستی اس گھر میں رکھا صرف اپنی ہمارا دج سے جلن اور حسد کی وجہ سے کہ ان

لگتا تھا وہ لینے کے لیے ہال کمرے میں جا رہا تھا۔ گھر کے سب ہی افراد ویسے کی تیاریوں میں لگے تھے۔

”کیا ہوا؟ شرم طبعیت خراب ہے؟“

نہت کی آواز پر فوراً ہی مڑا تھا۔ نہت کا ایسا شہد آگیاں لہجہ.....! سماعت اور بصارت یقین نہیں کر رہے تھے۔

”جی بس ایسے ہی۔“ وہ نارمل انداز میں بڑے صوفے پر لیٹ گیا۔

”ادھر آؤ چپک کر آؤ۔“ انہوں نے اس کا ماتھا چھوا واقعی اسے ہلکا سا بخار تھا۔

”تم کیوں گئے، مہران اور فاران کو بلوا لیتے۔“

”جی..... جی۔“ وہ تو جیسے سکتے میں آگیا کتنے دنوں بعد بڑی مامی اپنے پہلے جیسے لب و لہجے میں اس سے بات کر رہی تھیں۔

”اٹھو چل کے اپنے کمرے میں آرام کرو۔“ انہوں نے حکم دیا۔

”میرا کمرہ تو چھوٹی مامی نے، پتا نہیں کیوں لاک کر دیا ہے۔“

”ہاں وہ تمہارے کمرے کی صفائی وغیرہ کروانی ہے۔“ وہ جھٹ گیا ہوا نہیں۔

”روز ہی صفائی ہوتی ہے آج ہی کیا ضرورت پیش آگئی۔“ وہ جھٹھلایا ہوا بھی ہو رہا تھا۔

”تم بابا جان کے کمرے میں چلے جاؤ کچھ آرام کرو گے تو رات میں فریش رہو گے مریم اور خوشنما تو پارلر گئی ہیں۔“ انہوں نے بتایا۔

”پیشم کو وہ پہلے جیسی فکر کرنے والی لگیں جب بھی وہ تھکا مارا گھر آتا تھا تو وہ اسی طرح کرتی تھیں۔“

”نہیں میں اپنے کمرے میں ہی بہتر قیل کروں گا۔“ وہ مرتضیٰ علی کے کمرے میں جانے سے انکار کرنے لگا۔

”ارے آج بابا جان کے کمرے میں چلے جاؤ۔“ وہ اسے ڈپٹ کے گویا ہوئیں۔

پیشم انہیں یہ بتانا بھی مناسب نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس نے اپنی تیاری بھی کر لی ہے اس نے انگلی بند جانے کی تیاری بھی کر لی تھی اس کی روانگی تین دن بعد کی تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا تھا کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جائے گا تو خوشنما کو اس کا احساس ہونے لگے گا۔

وہ اٹھ کر جانے لگا تھا کہ نہت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”بیٹھو ادھر، بات سنو میری۔“ وہ چونک گیا بڑی مامی کے انداز میں پہلے جیسی اپنائیت تھی۔

پیشم تو خود بھی بہت دن سے ان سے بات کرنا چاہ رہا تھا وہ جو اس سے ناراض اور اٹھڑی رہتی تھیں

”ناراض ہو بیٹا؟“

”جی.....؟“ اس نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

وہ بڑے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

”بیٹا ماں سے بھی ناراض نہیں ہوتا۔“

”ماں چاہے اولاد سے ناراض رہے۔“ پیشم کے لب و لہجے میں شکوہ اور خفگی درآئی۔ اسے کتنا دکھ تھا بڑی

مامی کے ایسے سرد رویے سے وہ اس کی طرف دیکھتی تک نہیں تھیں۔

کے بیٹے ہوئے تھے اور تمہاری بیٹیاں۔ راشدہ میں نے تو کبھی بھی تمہیں احساس نہیں دلایا تھا کہ بیٹیاں ہی کیوں ہو رہی ہیں ارے یہ سب اوپر والے کی رضا سے ہو رہا ہوتا ہے۔ شکر ادا کرو ہماری اولاد تو ہے کچھ لوگوں کو تو یہ بھی میسر نہیں۔“ ڈاکر صاحب نے آج راشدہ کے ضمیر کو اچھی طرح چھنچھوڑ کے رکھ دیا تھا۔

راشدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے کیونکہ ان کا دل بھی بہت ملامت کر رہا تھا۔

”راشدہ دوسروں سے خوش ہوا کرو جن وحسد میں خود کو جاہ نہیں کرو کیونکہ اس سے نقصان اس کا نہیں تمہارا ہوگا اور دیکھ لو تم نے جن وحسد میں اپنی اور اپنی بیٹیوں کی شخصیت تک خراب کی یہ تو اوپر والے کا احسان ہے جو میری بیٹیاں سنبھال گئیں نوشین کو عقل آگئی۔“

”بس کرس اور کتنا مجھے میری نظروں میں گرائیں گے میں کب سے خود سنبھال رہی ہوں۔“

”تم سنبھالتی رہو گی اس وقت تک جب تک تم بھابھی سے عین بھائی سے معافی نہیں مانگو گی۔“

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے بھابھی سے معافی مانگنی ہی ہوگی ورنہ میں روز مرنی رہوں گی میں کبھی بھی بھابھی سے خوش نہیں ہوں۔“

”تم نے عین بھائی کو یہاں رکھ کے اور ظلم کیا۔“

”میرے تو آگ لگی تھی کسی طرح بھی بھابھی خوش نہیں رہیں۔“ راشدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے دل سے اپنے جرم کا اعتراف کرنا دل و دماغ کو سکون پہنچا رہا تھا۔

”کسی کا کچھ نہیں بگڑتا ہے نقصان اپنا ہی ہوتا ہے۔ میں نے بھی گھر پر اور اپنی بیٹیوں پر توجہ نہیں دی۔“

وہ لب کچل رہی تھیں۔ رضوانہ نے تو کبھی کسی کے ساتھ براہی نہیں کیا تھا جب ہی آج وہ اتنی خوش اور آسودہ تھیں صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑا تھا۔

ان کے بچے اتنے لائق فائق اور تمیز دار تھے اتنا عرصہ باپ کے باوجود بھی وہ اپنے باپ سے عزت سے ہی ملے تھے اور اب تو عین احمد کا بھی وہ بہت خیال کرنے لگے تھے۔

”راشدہ! زندگی میں درگزر سے کام لیا کرو کبھی کسی پر یہ نگاہ نہیں رکھا کرو کہ کون کیا کر رہا ہے بلکہ اپنے اوپر نگاہ رکھا کرو تم کیا کر رہی ہو اور لوگوں کے ساتھ تم کیسا برتاؤ کر رہی ہو کیونکہ دوسروں کی خامیاں نکالنا آسان ہے اپنے اور غامیاں برداشت نہیں، اگر تم دوسروں کی خامیوں کو انور کرو گی تو تمہاری لوگ خامیاں انور کریں گے۔“ ڈاکر صاحب انہیں بڑے مدبرانہ انداز میں سمجھا رہے تھے۔ راشدہ کو بھی عقل آگئی تھی۔

☆.....☆

ویسے کے فنکشن کا سارا انتظام ایک خوب صورت سے ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ سارے انتظامات میں اشرف علی مصروف تھے۔ پیشم بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کا تھک کے برا حال تھا۔ وہ اپنی کرسی سیدھی کرنا چاہ رہا تھا۔ سر میں بھی بہت درد ہو رہا تھا ایسا لگ رہا تھا اسے بخار ہو رہا ہے۔

”چھوٹی مامی کسی سے کہہ کر میرے لیے چائے اور سلاکس بنوادیں۔“ پیشم نے غور سے نہیں دیکھا کہ کچن میں شاہدہ نہیں نہت ہیں۔

نہت نے چونک کے اس کے تھکے تھکے وجود کو دیکھا وہ اپنے سر کو بھی دبا رہا تھا۔

”پیشم.....!“ انہوں نے اسے پکارا۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو فاران سے بھی میں ناراض رہی مگر وہ مجھ سے ناراض نہیں رہا۔“
 ”وہ آپ کا گناہ ہے آپ نے اسے معاف بھی کر دیا جب کہ میری تو کوئی غلطی بھی نہیں تھی میں نے اپنی مرضی سے شادی بھی نہیں کی نانا جان کی مرضی سے ہنسی خوشی اس لڑکی سے شادی کر لی جو انہوں نے میرے لیے منتخب کی تھی۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولتا ہوا نزہت کو شرمندہ کر گیا۔
 ”مامی! آپ نے میرے ساتھ اور میری بیوی کے ساتھ ہمیشہ طنز یہ رویہ رکھا اس کا تصور یہ کہ وہ غریب گھر کی لڑکی ہے کیا غریب لڑکیوں کو کوئی عزت نہیں ہوتی؟“
 ”بیٹا میں تو.....؟“ نزہت سے آگے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

وہ ٹوٹا اور کھرا ہوا تھا۔
 ”فاران نے کسی لڑکی کو پسند کر لیا تو اس کی بھی ذمہ داری مجھ پر.....! مامی میرا تو کوئی قصور نہیں۔“
 ”پیشم بیٹا! بس کرو میں خود کی ہی نظروں میں گر گئی ہوں۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 ”میں پتا نہیں کیا کیا الٹی باتیں سوچنے لگی تھی۔“
 ”مامی! میں تو آپ کا اپنا تھا، آپ نے پھر بھی مجھے لمحے بھر میں پر اپا کر دیا تھا۔ آپ نے خوشنما کی بھی اتنی بے عزتی کی اس کا کیا قصور تھا؟“ پیشم صاف گو قسم کا بندہ تھا وہ ان سے ساری باتیں کہنا چاہتا تھا۔ ”کسی کا غریب ہونا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے؟“

”بیٹا! مجھے معاف کر دو پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ انہوں نے پیشم کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
 ”پلیز مامی! ہاتھ جوڑ کے مجھے گناہ گار نہ کریں، میں آپ کی اولاد کی طرح ہوں اور اپنی ماں کو یوں ایسے ہاتھ جوڑتا نہیں دیکھ سکتا۔“ اس نے نزہت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔
 ”بس کرو بیٹا میں اپنی ہی نظروں میں گر چکی ہوں۔ تم تو میرے بچے تھے پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا تم پر ہی غصہ نکالتی رہی تبھی بڑا بن کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ مجھے بابا جان اور تمہارے ماموں جان نہیں سمجھاتے احساس نہیں دلاتے تو شاید میں اپنے بچوں سے دور ہی ہو جاتی۔“ انہوں نے پیشم کے ماتھے پر چار کیا۔
 ”ہم بڑوں کو بھی چاہیے بچوں کی پرابلم کو سمجھیں ان کے دوست بن کے رہیں ہر بات کو سن کر کریں۔“
 نزہت کو اپنی غلطیوں کا شدت سے احساس ہو گیا تھا۔
 ”تم سب میرے بچے ہو دیکھنا اب تم لوگوں کو اپنی ماں سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ انہوں نے مسکرا کے کہا۔

”مامی میں انگلیڈ جا رہا ہوں۔“

”کیا.....!“ وہ حیران رہ گئیں۔

”میرے خیال میں یہ ضروری ہے۔“

”زیادہ الٹی سیدھی کوئی بات نہیں.....! ابھی شادی ہوئی ہے تمہاری، میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“

انہوں نے ڈپٹ کے کہا تھا۔

”ارے نزہت کب تک تیاریاں چلیں گی۔“ ارتضیٰ علی وہاں چلے آئے تھے۔

انہوں نے ان دونوں کو یوں خاموش دیکھا تو چونک گئے۔

”خیریت تو ہے؟“

”سب خیریت ہے اسے سمجھا رہی تھی تھوڑا آرام کرے کیسا منہ نکل آیا ہے۔“ وہ بالکل ماؤں کے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

”نزہت یہ تم ہی ہو؟“

”جی میں ہی ہوں اور مزید شرمندہ نہ کریں۔“ وہ جھپٹ گئی تھیں۔

”ماموں جان! بڑی مامی پہلے والی مامی کی طرح بن گئی ہیں۔“ وہ خوش ہو کر بتانے لگا۔

”شکر ہے یہ غلط فہمی کے یاد دل تو چھٹ گئے ورنہ جانے کتنے دن اور گزر جاتے۔“

”اچھا سنو مجھے اور بھی کام ہیں۔ پیشم جلدی جاؤ تم بھی تیاری کرو۔“ وہ اس کی پشت پر تھپکی دے کے آگے بڑھ گئی تھیں۔

”ارتضیٰ علی اور پیشم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے تھے۔ سب کچھ ہی اتنا اچھا ہو گیا تھا پیشم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بس اسے خوشنما کی فکر تھی جو ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکی تھی۔ سب ہی کتنے خوش تھے وہ بھی اگر اس سے راضی ہو جائے تو زندگی میں رنگ ہی آ جائیں۔

نانا جان کے روم میں وہ تیار ہوا تھا۔ مریم اور خوشنما بھی تیار ہو کے آگئی تھیں۔ پیشم نے ابھی تک خوشنما کو نہیں دیکھا تھا۔

☆.....☆

ذاکر صاحب نے ان سب کورات کے کھانے پر بلایا تھا۔ نوشین، کرن اور نوین نے کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے راشدہ کی امی کو بھی بلایا تھا۔ راشدہ نے خود کو بہت ملامت کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے سیدھی سچی اور گھر کی باتیں کر کے ان کے ضمیر کو جگا دیا تھا ورنہ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ کبھی انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہیں اور آج رضوانہ نے انہیں معاف کر کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا اپنی ساس سے بھی وہ ہمیشہ خوشدلی سے ملتی تھیں۔ ان کے ساتھ تو سب نے ہی برا کیا تھا۔ کسی سے بھی حرف شکایت ہونٹوں پر نہیں لانی تھیں۔

”آج مامی! آپ سب کھانا لگ گیا ہے۔“ نوین ان سب کو ڈرائنگ روم میں بلانے آئی تھی۔

”دم کی مسکراتی نگاہ ابھی ضرور تھی مگر پھر منزل کی کھانسی نے دوسری طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”گھر میں غصے والے بنے رہتے ہیں یہاں زبردستی مسکرا کے دیکھا جا رہا ہے۔“ منزل نے اٹھتے وقت سرگوشی میں اسے چھیڑا تھا۔

”فضول مت مانکا کرو۔“

سب ہی بڑے گھرے میں کھانے کے لیے جا رہے تھے۔ دسترخوان پر خاصا اہتمام تھا، نوشین تو آگے بڑھ بڑھ کے میز بانی بھجھا رہی تھی۔ وہاں تو وہ ہنسی مسکراتی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”بھابھی! آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہے یا نہیں؟“

”ارے رضوانہ بار بار بول کے شرمندہ کر رہی ہو۔“ رضوانہ نے انہیں گلے سے لگالیا۔

”تم نے کچھ کیا ہی نہیں تو کیوں معافی مانگتی ہو۔“

”بھابھی آپ جتنا ظرف تو ہمارا کسی کا بھی نہیں ہے۔“ وہ رو رہی تھیں مگر ان کے یہ آنسو ندامت اور شرمندگی کے تھے۔

عتیق احمد بھی سر جھکائے بیٹھے تھے ان کی امی کی تو ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کچھ بولیں کیونکہ رضوانہ کے ساتھ زیادتی کرنے میں ہاتھ انہی کا تھا۔ بہو اور بیٹے کو الگ کرنے والی وہی یہی تھیں ان کے بچوں کو کبھی پیار ہی نہیں دیا۔

”ارے بھئی ہم لوگ یہاں مل بیٹھنے کے لیے آئے تھے۔ یہ کیا افسردگی کا ماحول کر دیا۔“ ضمیر ان نے ماحول کی افسردگی کو دور کرنے کو کہا۔

”ضمیر ان بیٹا یہ معافی طلبی بہت ضروری تھی کیونکہ بھابھی نے جو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اس کا ہم میں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ ڈاکر صاحب نے قدر سے توقف کے بعد کہا۔

”ہاں ڈاکر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ غلط تو میں ہی کرنے والی تھی بیٹے اور بہو کو میں نے ہی الگ کیا۔“ عتیق احمد کی امی نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

عتیق احمد نے حیرانگی سے انہیں دیکھا کیونکہ ان کی ماں نے شروع سے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ کبھی انہیں سمجھایا نہیں تھا۔

”مجھے کسی سے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیونکہ میرا شوہر میرے پاس آ گیا۔ میرے بچوں کو ان کے باپ کی شفقت مل گئی میں سب بھول گئی میری ہی کہیں غلطی اور گناہ ہوں گے جو مجھے مزا ملی۔“ رضوانہ نے ان سب کی شرمندگی مٹائی۔

”نہیں بھابھی! یہ تو آپ ہم سب کو معجز کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔“ راشدہ کی آواز بھر گئی۔

”رضوانہ! مجھے بھی معاف کر دینا میں ہی اچھی ماں نہیں بن سکی اور تم سب سے اچھی ماں ہو جو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے اپنے بچوں کی اچھی تربیت کی چاروں بیٹوں کو ہمیشہ اچھی باتیں ہی سکھائی ہیں۔“ ان کی ساس نے ان کی اس خوبی کو سراہا۔

”مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔“ رضوانہ خود آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”آج لگتا ہے کسی فلم کی اینڈنگ کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔“ منزل نے شوشی سے کہا تاکہ ماحول کی تلخی اور افسردگی ختم ہو جائے۔

”ارے بھئی بس بھی کریں ہمیں پور کر رہے ہیں آپ سب۔“

”بیٹا میں نے خود آج کا دن رکھا تھا تاکہ ساری تلخیاں اور غلط فہمیاں ہم سب دور کر لیں اب جب کہ ہمارے بچے آئندہ دنوں میں نئی زندگیاں شروع کرنے والے ہیں۔“ ڈاکر صاحب نے کہا۔

کرن اس دوران سب کے لیے چائے لے آئی تھی۔

آدم تو ٹی وی والے روم میں بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا نوین اس کے سامنے جھجک رہی تھی۔

”کیا بات ہے میری شکل بہت ڈراؤنی ہے جو چھپ رہی ہو۔“ نوین کو اس نے مخاطب کیا جو اندر والے روم میں جا رہی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ رک گئی۔

”آپ کے لیے چائے لاؤں؟“

”چائے چھوڑو، ادھر آؤ۔“ آدم بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا کرتے ہیں سب اندر بیٹھے ہیں۔“ وہ گرمی شوق سے گھبرا گئی۔

”میں تمہیں کھاتھوڑی جاؤں گا، بات تو سنو۔“ وہ آگے بڑھا۔

نوین بھاگنا ہی چاہتی تھی مگر آدم کی گرفت نے اسے روک دیا۔

”ویسے تو بہت بولتی ہو آج کیا ہوا؟“

”آپ کے سامنے نہیں بول سکتی۔“ وہ پنک کاٹن کے کپڑوں میں شرمائی گھبرائی پیاری لگ رہی تھی۔

”مگر مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اور بہت ضروری تمہارا ٹھیکس۔“

”ٹھیکس کس لیے؟“ وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

”ابو کو سمجھانا، جو آج وہ ہمارے پاس آ گئے کیونکہ آج یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے کہ ہم سب یوں مل گئے۔“ آدم نے دل سے اس کی ان اچھائیوں کو سراہا تھا۔

”مجھے بھی یہ سب کرنے پر جو اکسایا آپ کے سر داؤر نا کو روڑے کی وجہ سے کیونکہ آپ ہم سب سے اسی لیے اکھڑے اکھڑے رہتے تھے۔“ اس نے آدم کی آنکھوں میں دیکھا۔

”وہ تو میں بس ایسے ہی۔“ وہ بچل ہوا۔

”امی نے، نانی جان نے، ماموں جان نے آپ سب کے ساتھ غلط کیا اور انہیں جگانا بہت ضروری تھا۔“ وہ بول رہی تھی۔

”پچھے سے حباب کے کھنکھانے کی آواز پر دونوں ہی اچھل گئے۔

”واؤ..... تم دونوں تو بات بھی کرتے ہو۔“

”کیوں ہم بات نہیں کر سکتے۔“ آدم جھینپ گیا۔

”میں تو یہی جانتی تھی تم دونوں بھی بات ہی نہیں کرتے ہو گے۔“

”بھابھی! نوین کو بتا دیں آدم بھائی انہیں فیشن اور میک اپ کی دکان کہتے ہیں۔“ منزل نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

”کیا! نوین غصے سے چوٹ گئی۔

”ارے وہ تو مذاق میں کہتا تھا۔“ حباب نے ہی وضاحت دی۔

”آپ بھی تو آدم خور بنے رہتے تھے۔“ نوین نے بھی حساب برابر کیا۔

نہ بدست قہقہہ لگا منزل اور آدم کا۔ ضمیر ان طلحہ اور نوشین بھی آگئے تھے۔ اتنے میں رضوانہ کے جیٹھ جھٹانی اپنی جگہ کی کے ساتھ آگئے تھے۔ گھر میں پھر ایک رونق اور محفل جگ گئی تھی۔

اندر طلحہ کے رشتے کی بھی باتیں ہو رہی تھیں مگر ابھی یہ نوجوان پارٹی کو نہیں بتایا گیا البتہ حباب کو اندر بلایا گیا تھا۔

”نوشین تم تو بھی امریکہ فلائی کر جاؤ گی۔“ آدم نے مسکرا کے کہا۔

”میں ایسی نہیں کرن بھی۔“ وہ مسکرا کے بولی تھی۔

”ویسے ایک بات بتاؤ تم نے میک اپ کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟“ آدم چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے گویا ہوا۔

”منزل اور نوین کی ہنسی چھوٹ گئی کیونکہ وہ دونوں اس کی شرارت سمجھ گئے تھے۔

”بد میز شرم آتی چاہیے بڑی ہوں تم سے مذاق اڑاتے ہو۔“ اس نے آدم پر کشمکش برسانے شروع

کر دیے تھے۔ ان سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

☆.....☆

ولیسے کا فنکشن شاندار تھا جو سب سراہ رہے تھے۔ اسٹیج بھی اصلی پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ بڑی سی روش پر کارپٹ اور سائیڈل پر پھولوں کے گلے رکھے ہوئے تھے۔ برقی فنتوں سے پورا ہال جگمگا رہا تھا۔ نزہت اور شاہدہ مہمانوں کو ریسیو کر رہی تھیں۔ کافی لوگ مدعو تھے۔ مریم اسٹیج پر بیٹھی تھی اور اسے سب ہی گھیرے ہوئے تھے۔ خوشنما دین بنی سب سے مل رہی تھی۔ ابھی تک ہیشم اور اس میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی وہ دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گولڈن اور فان گلر کا ہنگا اس پر میچنگ طلائی جیولری اور میک اپ میں وہ حسین شہزادی لگ رہی تھی۔ سب ہی تعریفیں کر رہے تھے۔ اس کے میکے سے بھی لوگ آگئے تھے جن کو نزہت نے بڑے پرتپاک انداز میں ویکم کہا تھا۔

رمانا تو حیران رہ گئی تھی۔
”ارے یہ ہیشم بھائی کی ممانی تو بدل ہی گئی ہیں۔ اتنے اچھے لہجے میں ہم سے بات کی ہے مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔“ رمانا نے ایمن سے سرگوشی میں کہا تھا۔

جاوید احمد کو مرتضیٰ علی نے بلالیا تھا وہ لوگوں سے ان کا تعارف کروا رہے تھے۔
”آپ کی کدھر ہیں نظر ہی نہیں آرہیں۔“ ایمن اسے ہی ڈھونڈنے کے لیے پوری گید رنگ میں نگاہ دوڑانے لگی تھی۔ ارے یہ کیا ہیشم بھائی کے ساتھ کچھ لوگ ادھر ہی آرہے تھے۔ ”ایمن جھنجھل کے بیٹھ گئی تھی۔“
”رمانا مجھے لگ رہا ہے شعر بھائی کی فیملی ادھر ہی آرہی ہے۔“

”کہا..... کہاں۔“ وہ تو گھبرا گئی۔
اتنے میں وہ لوگ واقعی ادھر ہی آگئے تھے۔ شمیم نے ان سب سے سلام دعا کی تھی۔ رمانا تو گھبرائی شرمائی ہو رہی تھی۔ اشعر کی ایک پر شوخ نگاہ نے اس کا طواف کیا تھا وہ پر پل سوٹ میں لائٹ میک اپ کے ساتھ پیاری لگ رہی تھی۔ اشعر کی امی اور بھابھی بھی تھیں۔

”آئی یہ اشعر کی بھابھی ہیں اور یہ اسر بھائی ہیں۔“ ہیشم نے تعارف کروایا۔
”اشعر لڑکی تو پیاری ڈھونڈی ہے۔“ بھابھی نے رمانا کی تعریف کی وہ جھینپ گئی۔ اشعر کے بھائی اور بھابھی بھی اس کی امی سے معافیاں مانگ کے ان کے پاس ہی آگئے تھے اور یہ اشعر کے لیے خوشی کی بات تھی اس نے ہیشم کو کال پر بتا دیا تھا۔

”ہیشم! اپنی بیگم سے تو ملو ادو۔“ بھابھی کو خوشنما سے ملنے کی بھی بے چینی تھی۔
”جی، کیوں نہیں۔“ وہ اسے بلانے کے لیے چل دیا۔ ابھی تک اس نے خوشنما سے بات نہیں کی تھی۔ وہ اسے نزہت مامی کے ساتھ نظر آگئی تھی۔

”تمہاری امی اور بہنیں بلا رہی ہیں۔“
”وہ کدھر ہیں؟“ خوشنما انہیں ہی تلاش کر رہی تھی۔

”آؤ چلو۔“
ہیشم کو وہ اپسر کوئی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔ ہر ایک کی نگاہ ان پر اٹھ رہی تھی۔ ہیشم بلیک ڈز سوٹ میں ڈینٹک اور ڈینٹ لگ رہا تھا۔ مووی کیمروں کی اسکرین مختلف راہداریوں پر لگی تھیں ہر کوئی نمایاں ہو رہا

تھا۔

”یہ ہیں ہماری بیگم۔“ ہیشم نے شوخی سے کہا۔ بھابھی تو گلے ہی لگ گئی تھیں شمیم نے بھی خوشنما کو گلے لگا کے پیار کیا۔

”آئی آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔“ ایمن نے اس کے کان میں کہا تھا۔

اشعر کی امی نے بھی اسے ڈھیروں پیار کیا اور دعائیں دی تھیں۔

اتنے میں فاران نے ان دونوں کو فوٹویشن کے لیے بلایا۔

”یار! میں بالکل نہیں تم اور مریم اپنا کرواؤ۔“

”زیادہ بکواس نہیں کرو۔“ فاران نے زبردستی ان دونوں کو گھیر کے ان کا بھی فوٹویشن کروایا۔

خوشنما پورا وقت ہی شرمائی شرمائی رہی کیونکہ رومینک پوز کا اس نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا ہیشم کو اسے دیکھتے رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ خوشنما کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ڈنر کے بعد لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے تھے۔ مریم کی طرف سے اس کی خالہ کی فیملی ہی آئی تھی اور کوئی تو اس کا عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ شاندار اور پروقار تقریب کا اختتام رات گئے ہی ہوا تھا سب ہی تھکے تھکے اپنے اپنے کمروں میں جا رہے تھے۔

خوشنما کو اپنا یہ وزنی ڈریس سنبھالتے ہوئے چلنا مشکل لگ رہا تھا۔

”ہیشم بھائی! آپ بھابھی کو پکڑ کے لے جائیں دیکھیں سیرھیاں چلنا تک مشکل ہو رہا ہے۔“ جوہم سے رہا نہیں گیا تو وہ بول پڑی۔

”ہیں اگر زیادہ خیال ہے تو تم لے جاؤ۔“ وہ اپنے ہاتھ پیروں کو ڈھیلا چھوڑ کے ہال کمرے میں ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”میں چلی جاؤں گی۔“ خوشنما نے جھٹ کہا وہ سمجھ رہی تھی ہیشم زبردست ناراض ہے۔

”بھابھی! آپ چلیں میں چلتی ہوں۔“ اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

”ہاں جی! کھن لگاؤ پتا ہے نا اشعر کی بھابھی نے تمہیں اپنے بھائی کے لیے پسند جو کر لیا ہے۔“

”ہیشم بھائی ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ وہ جھینپ گئی۔ اشعر کی بھابھی کو جوہم پسند آگئی تھی انہوں نے جھٹ نزہت سے کہہ بھی دیا تھا۔

”جو بھی بات ہو۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

خوشنما ہیشم کے اے سے شوخ انداز کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

”اے لڑکے ادھر کیوں بیٹھا ہے اٹھو اپنے کمرے میں جاؤ۔“ نزہت نے اسے ڈپٹ کے کہا۔ وہ ہڑبوا کے رہ گیا جوہم، خوشنما کو اوپر تک چھوڑ آگئی تھی۔

”وہ مامی.....! جا رہی رہا تھا۔“ وہ اٹھا۔

”مامی! اشعر کی بھابھی نے آپ سے جوہم کے لیے بات کی ہے؟“

”ہاں کی ہے میں نے کہا تھا جب مناسب لگے وہ آجائیں۔“ نزہت کو جوہم کی فکر تھی یہ بھی ان کی فکر دور کی تھی۔

”تم جاؤ شاباش۔“ وہ ہیشم کو توجہ اور پیار دے رہی تھیں جو وہ اتنے دن اس سے بے رخی برت چکی تھیں۔

سب کچھ ہی اچھا ہو گیا تھا اور بیٹم کو بھی جو ہم کی فکر تھی وہ کسی طرح تو سرخرو ہوا۔ سوچنا ہوا اندر آیا تو وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پورا بیڈروم اصلی پھولوں سے سجا ہوا تھا۔

اسے اب سمجھ آیا تھا اسے بیڈروم سے بے دخل کر کے کیا کیا ہو رہا تھا۔ اسے یہ سب دیکھ کر غصہ ہی آ گیا جب اس کی بیوی کو اس کا ہی خیال نہیں تو ان سب چیزوں کی بھی ضرورت کیا ہے اسے ایسا لگ رہا تھا یہ سب سجاوٹ اس کا دل جلا رہی ہو، اس نے اس وقت خود پر کنٹرول ہی رکھا کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے خوشنما اس سے اور زیادہ بدظن ہو جائے اور پھر ویسے بھی اس نے ان سب باتوں کا حل بھی تو تلاش کر لیا تھا اسے کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہونا تھا، شاید خوشنما کو اس کا خیال آجائے، وہ ایسی زندگی سے تھک گیا تھا وہ بھی نارمل زندگی گزارنا چاہتا تھا جہاں صرف اور صرف خوشنما ہو اور وہ اس کا خیال رکھے، وہ تو کب سے محبت اور پیار کے لیے ترسا ہوا تھا اس نے پہلی دفعہ کسی کو اتنا چاہا تھا اور چاہا بھی اسے جو اس کی بیوی تھی اسے تو اس بات کی بھی حیرانی تھی جیسے وہ اس کے دل میں جگہ بناتی تھی۔ ورنہ تو اس نے پہلی رات جو اس کے ساتھ سلوک کیا تھا وہ کوئی لڑکی بھی برداشت نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے اسے ہمیشہ عزت ہی دی تھی اور اب تو اسے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔ بس خوشنما بھی جو ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکی تھی۔

کیا اس کے اندر سے دل ٹوٹ گیا تھا پورا وقت فتنشن میں وہ بے دلی سے ہی رہا تھا۔ بظاہر خوشنما سب کے سامنے بہت خوش نظر آ رہی تھی ورنہ حقیقت میں وہ اس کے ساتھ کب خوش تھی۔ ”کیا زندگی میری ایسی ہی بے مصرف گزرے گی؟“ وہ سوچتا ہوا وارڈروب کی طرف بڑھ گیا تھا اسے اس فارل سے ڈریس سے آزاد ہونا تھا وہ فنی اور جسمانی طور پر خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، اس نے یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سمجھ گیا کر رہی ہے اور کدھر ہے پورا بیڈروم پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چیخ کرنے واش روم میں چلا گیا تھا۔

خوشنما نے کافی دیر تک اس کے پرسوج چہرے کو بغور دیکھا تھا اور اسے اچھی طرح اندازہ تھا وہ اسے ہی سوچ رہا تھا۔

خوشنما کو اس کا خیال بھی آ رہا تھا وہ اپنی ساری مصنوعی ناراضی دور بھینکنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت دن بیٹم کا امتحان لے لیا تھا۔ وہ ذرا بھی اس کے رویے سے اکتایا نہیں تھا بلکہ اسے پکا یقین تھا ایک دن وہ اسے ضرور معاف کرے گی۔

اس نے ابھی تک اپنے کپڑے چنچ نہیں کیے تھے اس کا بھی دل چاہ رہا تھا بیٹم اس کے روپ کی تعریف کرے، آج اس کو بہت احساس ہو رہا تھا پورے فتنشن میں فاران اور مریم کتنے خوش تھے اور فاران کیسے اس کا خیال کر رہا تھا۔ محبت انسان کو کتنا بدل دیتی ہے۔

اور خوشنما بھی خود کو بھی تو بدلا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی بیٹم سے نفرت نہیں کر سکی تھی۔ اولین شب کی بے عزتی کے باوجود بھی وہ اسے چاہنے لگی تھی شاید اس لیے کہ بیٹم نے اپنی ساری غلطیوں کے اعتراف جو کیے تھے اور اپنی محبت کا بار بار اظہار کر کے یقین دلایا تھا۔

واش روم کا دروازہ کھٹ سے بند ہوا تو وہ اچھل گئی۔ ”یہ ہے کدھر جو مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔“ بیٹم کو اس کا خیال آیا۔

بیڈ کے اندر جھانکا وہاں بھی نہیں تھی۔

خوشنما سمجھ گئی وہ اسے ڈھونڈ رہا ہے وہ اور پردوں کی سائیڈ پر ہو گئی جہاں ٹی وی ٹرائی پر رکھا تھا۔

اب بیٹم ڈرائنگ روم کے پورٹن میں آ گیا وہ اسے نظر آ ہی گئی۔

”ادھر کیوں کھڑی ہو؟“ وہ اس کے ماورائی حسن میں کھونے لگا۔

”وہ میں یہ ٹھیک کر رہی تھی۔“ زبردستی ٹی وی کی ٹرائی پر ہاتھ مارنے لگی۔

”جھوٹی مجھے بتا رہی ہے انا کا جھنڈا اونچا رکھے گی جھٹکے نہیں، میں بھی دیکھتا ہوں کب تک۔“ وہ مزہ لگایا۔

خوشنما لمبی سانس بھر کر رہ گئی۔ یعنی وہ اسے ایسے روپ میں دیکھ کر بھی نہیں چونک رہا تھا۔

وہ بیڈ سے سارے پھولوں کی لڑیوں کو ہٹانے لگا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ اپنا لہنگا دونوں ہاتھوں سے سنبھالتی ہوئی آگے آئی۔

”نظر تو آ رہا ہوگا کیا کر رہا ہوں۔“

”مگر کیوں کر رہے ہیں بڑی مامی نے جوایا تھا۔“

”غلط کمرے میں بھوادے اسے صرف فاران کے روم میں ہی بچنا تھا، کیونکہ دو محبت کرنے والوں کا ملن وہاں ہوا ہے یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ اس نے سب کچھ اتار کے نیچے ڈال دیا۔ خوشنما لب کھینچنے لگی وہ اس کے غصے کو سمجھ رہی تھی۔

”میں کون سا تم سے پیار کرتا ہوں۔“ وہ ایزی سے سیٹھی کلر کے قمیض شلوار میں ملبوس ڈشنگ لگ رہا تھا۔

”میں لاکھ یقین دلاتا ہوں تم میرے ساتھ یہی سلوک کرو گی، مجھے ایسی پھولوں کی سجاوٹ چاہیے بھی نہیں۔“ وہ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

”ظالم! آج تو اتنی حسین لگ رہی ہے کہ دل کر رہا ہے صرف اپنی کروں اسے کہیں نہیں جانے دوں۔“ آنکھ بند کر کے وہ حسرت بھری آہیں بھر رہا تھا۔

”میں پرسوں روانہ ہو رہا ہوں۔“

”کہاں؟“ وہ چونک گئی۔

”انگلینڈ کا وزٹ ہے وہاں کچھ میٹنگز ہوں گی پتا نہیں کب واپسی ہو تم اپنے امی ابو کی طرف چلی جانا تمہیں ویسے بھی میری ضرورت تو ہے ہی نہیں اس لیے بے کار لوگوں کو چلے جانا چاہیے۔“

خوشنما تو حواس باختہ ہی ہو گئی یہ بیٹم کیا کہہ رہا تھا ایسا رد عمل وہ تو صرف تنگ کر رہی تھی۔

”میں زبردستی تمہیں باندھ کر رکھنا نہیں چاہتا تمہارا جو فیصلہ ہو مجھے بتا دینا۔“ وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا اور اس کی طرف دیکھنے سے بھی اجتناب برت رہا تھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اس کے قریب بیڈ پر ہی آ گئی۔

”فیصلہ تم سمجھتی ہو اس زبردستی کے رشتے میں خود کو باندھ کر رکھنا خود کو اذیت دینا ہے۔“ بیٹم کو اندازہ ہو گیا تھا اس کی دنیا ڈول گئی ہے۔

”ہاں اب لگا ہے تیر نشانے پر مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا مگر اتنی جلدی گھبرا جائیں گی۔“ وہ اس کی

کیفیت سے محفوظ ہونے لگا۔
”پلیز لائٹ وغیرہ آف کر دینا، مجھے نیند آرہی ہے کل مجھے ویسے ہی بہت کام ہے۔“ وہ کروٹ لے کے

لیٹ گیا۔

”آپ ایسے کیسے کر سکتے ہیں میرے ساتھ۔“
”جو تم چاہتی ہو ویسا ہی کر رہا ہوں، اس میں بھی تمہیں اعتراض ہے، میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، بے عزتی کی جانے کیا کیا مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں تو اس کی سزا ہے کہ تمہیں اور مجھے الگ ہو جانا چاہیے۔“ وہ بولے جارہا تھا خوشنما کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”اپنا فیصلہ صبح تک سنا دینا گڈ نائٹ۔“ وہ پھر چپ ہو گیا۔
خوشنما اس کی پشت کو دیکھے گی۔ وہ اتار بخور اور لمول ہو گیا تھا کہ فیصلے کا اختیار بھی اسے سوئپ دیا وہ کوئی زبردستی نہیں کر رہا تھا مگر خوشنما یہ سب نہیں چاہتی تھی وہ اسے چاہتی تھی۔

☆.....☆

حسین بیگم اپنے سونے کی چیلری کا کاس بیٹا کو دے رہی تھیں۔

”اماں! آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟“ بیٹا تو حیران تھیں۔

”رکھ لو اسے یہ میں ارومہ کے لیے دے رہی ہوں اس کی شادی پر دینا۔“

”اماں! اس پر ارومہ کا اور میرا کوئی حق نہیں ہے۔“ وہ حسین بیگم کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر پریشان ہوئی تھیں۔
”ایسی باتیں نہیں کرو، میں نے اپنے زیور میں سے حصے بنا دیئے ہیں کچھ چیزیں اکرام کی بیٹی کی شادی کے لیے دے دی ہیں اور کچھ میں نے شہریار کے بچوں کے لیے نکال دیا ہے۔ وہ جب یہاں آئے گا میں وہ اسے دے دوں گی۔ ناہید کو بھی میں نے دے دیا ہے ایک تو وہ رہتی ہی الگ الگ ہے۔ پتا نہیں شادی کے بعد سے کیسی ہو گئی ہے۔“

”اماں! آپ اس طرح کیوں کر رہی ہیں زیورات کا تو آپ کو شوق ہے، ابائے بھی آپ کو ہمیشہ اچھا ہی پہنایا ہے۔“ بیٹا تو حیران تھیں اچانک سے حسین بیگم میں ایسی تبدیلی کیونکر آئی ہے۔

”تمہارے باپ کے زمانے کے شوق تھے اور میں سمجھتی ہوں مجھے اپنے مزاج میں پر دباری لانی چاہیے شہریار ٹھیک ہی کہتا ہے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“ ان کے چہرے پر کچھ افسردگی بھی لگ رہی تھی۔

”آپ نے شہریار کی باتوں کو کیوں دل پر لے لیا ہے۔“ بیٹا گویا ہوئیں۔
”یہ بات نہیں ہے میں نے کچھ سوچا اور سمجھا ہے میری عمر اب ان باتوں کی نہیں ہے جوانی میں میں نے جو کیا سو کیا فلم لائن میں جانا چاہتی تھی کچھ لوگوں نے ہی خوب صورتی کا ایسا احساس دلایا کسی کو خاطر میں ہی نہیں لیا۔“ حسین بیگم نے اپنے ماضی کی باتوں کو بھی یاد رکھا ہوا تھا۔

”وہ سب تو آپ کا پہلے ہی چھوٹ گیا تھا۔“ بیٹا کو بھی ایسا لگا کہ حسین بیگم اسے بھی احساس دلا رہی ہیں۔
زندگی میں بد باری لاؤ اور وہ تو کب سے سنجیدہ اور خاموش ہو گئی تھیں۔ لوگوں کی ناگواری والی نگاہوں کو انہوں نے جب سے محسوس کیا تھا اور پھر ارومہ نے بھی تو دور کے شکوہ کر کے احساس دلایا تھا۔

”امی! اب تو میری طرف دیکھیں کیوں اپنا اور میرا نقصان کرتی ہیں۔“ حجاب کو بھی یہی احساس مارے ڈالتا ہے اس کی سسرال میں لوگ یہ طعنہ نہیں دیں جیسی ماں ویسی بیٹی ہے انہوں نے یہ بات تو بھی سوچی ہی

رداؤ انجسٹ [28] مارچ 2016ء

نہیں لوگ ان کی بیٹیوں کو ان کی وجہ سے طعنہ بھی دے سکتے ہیں ان کی دونوں ہی بیٹیاں اتنی حساس تھیں اس کا تو اندازہ انہیں اب ہوا تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی میں کیا تقاضا پہلے سے نبھایا نہ دوسرے نہ ہی تیسرے سے اور ابھی بھی اپنے ہی چکر میں رہتی تھیں۔

”نہیں وہ ایسا حوالہ نہیں بتیں گی اپنی بیٹیوں کو ایسی باتیں نہیں سننے دیں گی۔ اگر ارومہ ان کے ضمیر کو نہیں جھنجھوٹی تو شاید وہ ایسی ہی زندگی گزارتی رہتیں شکر ہے انہیں جلد احساس ہو گیا تھا نماز پڑھ کے اپنے رب سے خطاؤں کی غلطیوں کی معافی مانگی تھی۔

”وہ سب بھی میری بے وقوفی تھی شریف لڑکیوں کی یہ حرکتیں ہوتی ہیں جو فلم لائن میں جانے کا سوچ رہی تھی میں۔“ وہ بولیں۔

بیٹا نے چونک کے پہلو بدلا۔

”اماں! ان باتوں کو چھوڑیں اور نہ ہی ڈکس کریں آپ شکر کریں آپ کی ابا سے شادی ہوئی۔ انہوں نے آپ کو پر آسائش زندگی دی آپ کو ضرورت بھی کیا تھی فلم میں جانے کی۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہر لڑکی کو آسائش چاہیے ہوتی ہے۔ میں نے آسائشوں کے لیے ایسا سوچا میری سوچ غلط ہی تھی۔“ انہیں اپنی بے وقوفیاں بھی یاد آرہی تھیں۔

”میکے میں صرف ماں اور ایک بھائی تھا وہ بھی انڈیا میں تھا۔ ماں کا تو ایک عرصہ ہوا انتقال ہوئے۔ بھائی کا پتا ہی نہیں تھا نہ ہی وہ بھی پلٹ کے انڈیا ہی گئی تھیں۔

”اچھا یہ ڈبہ اٹھا کے رکھ اور مجھے چائے بنا دے۔“ وہ تھکن محسوس کر رہی تھیں بیٹا کے بیڈ پر ہی لیٹ گئی تھیں وہ صبح سے ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔

”آج آپ یہیں رک جائیں۔“

”ہاں میں یہیں ہوں کل جاؤں گی۔“ وہ گویا ہوئیں۔

بیٹا چائے بنانے چلی گئی تھیں، ارومہ بھی شاید سوئی تھی اس کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔

بیٹا بار بار شکر ادا کر رہی تھیں وہ جلد سنبھل گئی تھیں وہ اپنے اور ارومہ کے ساتھ زیادتی ہی کر رہی تھیں اور شکر تھا حجاب کی سسرال اچھی تھی سب نے اسے عزت سے رکھا ہوا تھا۔

انہیں ارومہ کی فکر بھی اس کا بھی کہیں اچھی جگہ رشتہ ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں۔ اکرام کا زین ارومہ سے ایک سال چھوٹا تھا ورنہ وہ تو چاہتی تھیں اپنے بہن بھائی میں ہی اس کا رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ بیٹا خود کو خاصا ہلکا محسوس کر رہی تھیں یہ تبدیلی ان میں ہی نہیں حسین بیگم میں بھی آچکی تھی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے انسان کتنا ہلکا محسوس کرتا ہے۔

دوسرے دن ہی رضوانہ حجاب اور ضمیر ان کے ساتھ چلی آئی تھیں حسین بیگم اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھیں ان لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پھر رضوانہ نے اپنا دعا بھی بیان کر دیا تھا۔

حسین بیگم اور بیٹا تو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگیں جیسے انہیں یقین نہیں آیا ہو۔

”بیٹا بہن! یہ میری خوش نصیبی ہوگی کہ آپ کی دوسری بیٹی بھی ہمارے گھر کی بہو بنے۔“ بیٹا کی انجانے میں کی گئیں دعائیں اس طرح مستجاب ہوں گی وہ اوپر والے کا شکر ادا کرنے لگیں۔

”دیکھئے آپ انکار تو بالکل نہیں کر سکتی ہیں کیونکہ حجاب کا پتا ہے وہ آپ کو بتاتی ہوگی ہمارے گھر کا۔“

رداؤ انجسٹ [29] مارچ 2016ء

ضمیر ان نے حجاب کی جانب تائیدی دیکھا۔

”ارے کچھ غلط تو نہیں بتاتی تھیں۔“

”کیا ہو گیا ہے ایسی کوئی الٹی باتیں نہیں کرتی میں سب کو پتا ہے میں سسرال میں بہت خوش ہوں۔“

حجاب نے جھٹ و وضاحت دی۔

”آئی! پھر اسی بات پر آپ کو طلحہ کا رشتہ قبول کرنا پڑے گا۔“ ضمیر ان کو زیادہ ہی جلدی تھی رضوانہ

مکسرانے لگیں۔

”مگر وہ میں.....“

”بیٹا! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے بچے سارے ہمارے دیکھے ہوئے ہیں پھر ہماری حجاب وہاں بیاہ کے

گئی ہے وہ خوش ہے رضوانہ اسے قدر سے رکھ رہی ہیں۔“ دونوں بہنیں ایک دوسرے کا خیال تو کریں گی۔“

”آپ سوچ لیں ہم زبردستی نہیں کر رہے لیکن ہماری یہ خواہش اور خوشی ہے آپ کی دوسری بیٹی بھی

ہمارے گھر آئے۔“ رضوانہ نے سہولت سے کہا۔

”امی! آنٹی کی انکار کی گنجائش ہی نہیں بنتی حجاب یہ مٹھائی کا ڈبہ کھولو اور ہم سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔“

ضمیر ان نے تو گویا انہیں آگے سے کچھ بولنے ہی نہیں دیا۔ حجاب نے سب کا ہی منہ میٹھا کروایا۔

بیٹا کو انکار کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

حسین بیگم کو بھی لگا جیسے ایک فکر تھی وہ بھی ختم ہوئی۔

حجاب ارومہ کو لے آئی تھی وہ حیران پریشان شرمائی اور گھبرائی ان سب کے درمیان تھی۔ رضوانہ

نے اس کا بھی منہ میٹھا کروایا اور ہاتھ میں چند ہزار کے نوٹ رکھے۔

”بیٹا! بہن آج سے یہ بھی ہماری بیٹی ہوئی۔“

”طلحہ کے ایم بی اے کے دو سال ہیں ہم چار سال کا ٹائم رکھتے ہیں طلحہ بھی اسٹبلش ہو جائے گا اور ارومہ

کا بی اے بھی کاپلیٹ ہو جائے گا۔“

”جی جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ بیٹا نے رضامندی دے دی تھی۔

”بھئی بہت بہت مبارک ہو مجھے تو بہت خوشی ہے۔“ حسین بیگم بہت خوش تھیں۔

بیٹا نے ان سب کے لیے چائے کے ساتھ ریفریشمنٹ کا بھی انتظام کیا۔

ارومہ تو اندر بھاگ بیٹھی حجاب اسے چمچے رہی تھی۔ حجاب کو ارومہ کی بھی فکر تھی اپنی بہن سے وہ بہت

محبت کرتی تھی اسے یہ خوشی تھی وہ اس کے ہی سسرال میں آ رہی تھی اسے پتا تھا شہر یار سے گا تو بہت خوش ہوگا۔

☆.....☆

اشعر کی بھابی دوسرے دن ہی شام میں چلی آئی تھیں۔ اسے بھابی کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ انہیں جوہم اتنی

پسند آئی تھی نزہت سے ہاں کروا کے بنی تھیں مگر اس دوران بیٹم کا کچھ پتا نہیں تھا وہ صبح سے ہی کہیں نکلا ہوا

تھا۔ شام بھی گزر رہی تھی کتنی کا لڑکچلی تھی اس کا سبیل بھی سوچ آف جا رہا تھا۔ رات سے وہ انگاروں پر لوٹ

رہی تھی۔ اس سے بالکل ہی وہ بائیکاٹ کر کے جا رہا تھا۔ وہ ایسا تو بالکل نہیں چاہتی تھی۔

”کہاں چلے گئے ہیں کیا کروں؟“ نازک نرم و ملائم گورے گورے ہاتھوں میں حنائی رنگ اور مکمل کے

اس کے ہاتھوں کو خوب صورت بنا رہا تھا۔ پنک کاٹن کے دھاگوں کی ایمر ایڈری والے لباس میں پریشان

پریشان کب سے نزہت کی نظروں میں تھی۔

”خوشنما بیٹا کیا بات ہے۔“ وہ اسے بغور دیکھنے لگیں۔

”بیٹم صبح سے کئے ہوئے ہیں آئے ہی نہیں کوئی رابطہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔“ وہ روہانی ہو گئی۔

”کچھ بتا کے بھی نہیں گیا۔“ انہیں بھی تشویش ہوئی۔

”صبح جلدی میں تھے میں نے پوچھا بھی کہنے لگے آ جاؤں گا جلدی۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا تم پریشان نہیں ہو میں فاران سے کہتی ہوں شاید اسے کچھ پتا ہو ہو سکتا ہے نہیں ضروری کام سے

گیا ہو۔“ وہ خوشنما کی باتوں سے اندازہ لگا چکی تھیں۔ بیٹم نے اسے اپنے جانے کا شاید نہیں بتایا ہے وہ اسی

سلے میں کہیں نکلا ہوگا۔

”تم پریشان نہیں ہو، جاؤ ذرا مریم کو دیکھ لو وہ فاران کے کسی دوست کے گھر ڈنر پر جا رہی ہے تم

کپڑوں کو سلیکٹ کرنے میں مدد کرو۔“ وہ اس کا دھیان بنانے کو بولیں۔

وہ سر ہلاتی ہوئی ان کے حکم کی تعمیل کے لیے چلی گئی مگر اس کا ذہن دل الجھا ہوا تھا نانا جان سے بھی کچھ

نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ مریم کے کپڑوں کی سلیکشن کروا کے خود پھر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

وہ اشعر کو بھی کال کر کے اس کا پوچھ چکی تھی جب کہ اشعر اپنی بھابی کے ساتھ شام میں ہی گھر آیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ کئی دن کال کر کے پوچھ چکی تھی۔ وہ بیٹم کے غصے کو خوب اچھی طرح سمجھ رہی

تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی جانے نہیں دینا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے اس کے آگے اپنا آپ جھکا نا ہی

کیوں پڑ جائے، پھر میاں ویوی میں انا تو ہوئی ہی نہیں ہے۔

وہ تو حض بیٹم کو تنگ کر رہی تھی۔ اسے تو اندازہ نہیں تھا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

مغرب کی اذانوں کی آواز آرہی تھی، وہ وضو کرنے اٹھ گئی نماز پڑھ کے اس نے خوب دعائیں مانگیں

ہرے برے خیالات کو جھٹک رہی تھی۔

بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں سے بھی وہ کچھ نہیں پوچھ سکتی تھی، ورنہ وہ سب سے زیادہ شاکی ہوتے

مہران سے چپکے سے کہہ چکی تھی کہ بیٹم کا وہی کچھ پتا لگائے۔

موبائل کو وہ بغور دیکھ رہی تھی۔ لیوں پر درود شریف اور آیہ الکرسی کا ورد کر رہی تھی اور غائبانہ بیٹم پر

پابونک رہی تھی، اس کی سلامتی اور واپسی کے لیے۔

امی کے گھر سے بھی رمنائی کال آئی تو اس نے ان لوگوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا کچھ پتہ نہیں امی اور ابو خود

یہاں آ جاتے اور ابو کی تو ویسے بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی، وہ اسی وجہ سے انہیں اور مزید پریشان نہیں کرنا

چاہتی تھی۔

اتنی بھی سزا اسے نہیں دینی چاہیے تھی جب کہ وہ کتنی بار اس سے معافیاں مانگ چکا تھا۔ ازالہ کرنا چاہا تھا

وہ کون ہوتی ہے اسے سزا دینے والی اور معاف نہ کرنے والی اللہ کے آگے پانچ دفعہ جھک کے، اس کی

خوشنودی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ تو درگزر کرنے والوں اور گناہ کرنے والوں کو بھی معاف

کردیتا ہے۔ وہ کون ہوتی ہے اس کے کاموں میں مداخلت کرنے والی۔ اللہ کو تو وہ ناراض کر رہی تھی مجازی

خدا جو اس سے ناراض تھا اسے ناراض پر ناراض کیے جا رہی تھی۔

الاش کرنے لگا۔

”ایسی فضول حرکت کر کے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔“

”کیسی فضول حرکت کر دی اب میں نے۔“ دھڑ سے وارڈ روپ بندی کی اور اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ اس سے فاصلے پر کھڑی تھی وہ چند قدموں سے فاصلہ تمام کر کے قریب ہی آ گیا۔ گھر اکھرا سرا پا دھل کے اور پیارا لگ رہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں حنائی رنگ تو الگ ہی چھب دکھار ہا تھا۔

”کاش..... کل کی رات تم یوں ضائع نہیں کرتیں۔“ وہ بس ٹھنڈی آہ بھر کے سونے لگا۔

”بغیر بتائے آپ صبح سے گئے ہوئے تھے۔ کوئی فون کالز بھی نہیں کی تھی آپ کا میل آن تھا۔“ وہ بہت طے میں بول رہی تھی۔

”میرے سیل کی چار جنگ کم تھی اس لیے کال پک نہیں ہو رہی تھی۔ چار جنگ پوری کی تو پھر تو فاران کی مہر ان کی اشعر کی سب کی ہی کالز آتی گئیں۔ اشعر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تم نے اسے کبھی دودفعہ کال کی تھی۔“

”آپ نے پھر بھی مجھے کال بیک نہیں کی۔“

”تمہیں میری پرواہ ہی کب ہے کیا کرتا نہیں بتا کے۔“ وہ اسے سلگا کے پھر اپنے کاموں میں لگ کے یہ تاثر دینے لگا جیسے اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

”آپ ایسے کیسے کہہ سکتے ہیں صبح سے میں کتنی پریشان ہوں۔“ اس کے سر دروے اور روکھے پن سے رونا ہی آنے لگا۔ اس کی ذمہ داری تو وہ خود ہے اسے ہی یہ سب ٹھیک بھی کرنا ہے۔

”پریشان تو تم اس لیے ہو گی کہ کہیں میں تمہارا فیصلہ سے بغیر تمہیں یہاں لٹکا کے نہ چلا جاؤں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں مجھے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔“

”تمہاری شکل دیکھ کر مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا تم سے کوئی فیصلہ تو ہونا نہیں ہے بعد میں پھر مجھے کوئی رہو گی۔ اس لیے فیصلہ اب مجھے ہی کرنا ہے۔“ اس نے کچھ میں ذرا سختی لگائی جان بوجھ کے تاکہ وہ ڈرے۔

”آپ میری مرضی کے خلاف کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں۔“ اس کی تو دنیا ہی ڈول گئی وہ ایسا کوئی بھی فیصلہ بھی چاہتی ہی نہیں تھی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس سے الگ ہو جائے۔“

”تمہاری مرضی کے مطابق ہی فیصلہ ہو گا۔“ وہ مسکراہٹ چھپا کے اس کے بالکل قریب ہوا، خوشنما نے لب بچھ کے دو قدم پیچھے کیے۔

”میں نے نیچے سب کو بتا دیا اپنے فیصلے کے بارے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ تم پر مزید کوئی ظلم تو اوتا ہی نہیں چاہیے کیونکہ میرا بچھلا ریکارڈ ویسے ہی تمہاری نظر میں خراب ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے نکال کے ہی کچھ ہو سکتا ہے میری اور تمہاری زندگی اس طرح تو بالکل نہیں چل سکتی۔“

”کک..... کیا مطلب ہے؟“ اس کا دم خشک ہونے لگا۔

”بشم کی آنکھیں کیوں اسے مسکراتی ہوئی مسخراڑتی ہوئی لگ رہی تھیں۔“

”مطلب کا سارا تاثر گز گیا کیونکہ بات صحیح اور صاف ہے۔ تم اپنا سامان پیک کر دو جو ضروری رکھنا ہو صرف وہی رکھنا زیادہ کچھ یہاں سے لے جانے کی کوشش بھی نہیں کرنا۔“ وہ ذومعنی لہجے میں بول رہا تھا۔

”آپ ایسے کیسے مجھے یہاں سے نکال سکتے ہیں۔ میری اور آپ کی باقاعدہ شادی ہوتی ہے کوئی بھاگ نہیں آتی ہوں جو میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔“ اس کے تو چوہہ طبق ہی روشن ہو گئے لہجے اور

ارے اسے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت سے اس گھر میں واپس بلایا تھا جس نے اس کی بے عزتی کی تھی وہ کتنی عزت دیتا تھا اور دوسروں سے بھی کروانا جانتا تھا اس کی خاطر بڑی مامی کی وجہ سے وہ دوسرے گھر تک میں شغف ہونے کو تیار تھا۔ اس لیے کہ بڑی مامی خوشنما سے حقارت سے پیش آتی تھیں۔ وہ تو اپنے سارے فرائض دل سے ہی ادا کر رہا تھا۔

اور وہ کیا کر رہی تھی اس کے ساتھ اگنور اور طنز کتنا برا کر رہی تھی اس کی ہر ہر ضرورت کا کتنا خیال رکھتا ہے ارے وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا ہر آسائش اس نے دی ہوئی تھی کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کے

ماں باپ کی کتنی عزت کرتا تھا اور وہ جواب میں اسے کیا دے رہی تھی سوائے سرد مہری کے وہ تو شروع سے

ماں و باپ کی محبت و شفقت تک سے محروم رہا، نانائے اسے دل سے لگائے رکھا اس گھر کے لوگوں نے اس کا خیال رکھا۔

وہ تو اس کی اپنی تھی اس کے ساتھ ہر وقت رہنے والی اس کے دل کے قریب جتنی بھی اسے محبت دیتی کم تھا جب کہ وہ اپنی انا تک چھوڑ کے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

”کہیں ایسا نہیں ہو وہ چلا جائے اور وہ خود کو مجرم ہی سمجھتی رہے وہ ہے، تو اس کی عزت ہے اور اس کی زندگی میں بھی رنگ ہیں۔“

”نہیں میں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ بیٹھے سے کھڑی ہو گئی آٹھ بج رہے تھے دل ایسا لگ رہا تھا بند ہو گیا ہو۔

بیلروم میں گلاب اور مونہی کے مختلف پھولوں کی بھیننی بھیننی مہک بسی ہوئی تھی۔ خوشنما کے کل کا برائیڈل لباس بھی صوفے پر پڑا تھا۔

”بھابھی! بھابھی.....“ ماہ رخ کی آواز پر وہ چونک گئی۔

”آ جاؤ۔“ جلدی سے آنسو پونچھے۔

”بیشم بھائی آ گئے ہیں۔“

”اچھا آتی ہوں۔“ خود کو مارل کیا۔

تشکر پھر اسانس لیا پھر اپنا منہ دھونے واش روم میں گھس گئی رورو کے آنکھوں میں جلن ہو گئی تھی۔ سوئی

موٹی سوچی آنکھیں اس کے دل کا فسانہ کہہ رہی تھیں۔ واش روم سے کافی دیر بعد نکلی تھی۔

دیکھا تو بیشم وارڈ روپ میں گھسا جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ بیشم نے مڑ کے اسے دیکھا دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔

”ہوں..... یعنی محترمہ روٹی بھی ہیں اور پھر سے فکر مندی کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے یہ جھکا کام کر گیا بیوی تو قدموں میں آ ہی جائے گی۔“ فاران کی کال اور مہر ان کی کال نے اسے بہت کچھ بتایا تھا۔ بڑی مامی نے تو نیچے اچھی خاصی کھینچائی کر دی تھی۔ شکر تھا نا جان کے علم میں نہیں تھا ورنہ تو وہ تو اس کی گوشائی کر دیتے۔

”کہاں تھے آپ صبح سے۔“ وہ تو پھٹ پڑی۔

بیشم حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا وہ اتنے غصے سے اس سے تو کبھی نہیں پوچھتی مگر اسے یہ سب اچھا لگا خوشنما

کے لب و لہجے اور انداز میں انانیت لگی جو بیویاں فکر کرتی ہیں وہ یہی سب تو چاہتا تھا۔

”تمہیں کب سے میری فکر ہونے لگی۔ تمہاری بلا سے میں جاؤں بھاڑ میں۔“ وارڈ روپ میں پھر کچھ

آواز کو مضبوط بناتے بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 ”تم پھر کیا چاہتی ہو یہ بتا دو۔“ وہ پشت پھیرے مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرنے لگا اس لمحے خوشنما کے
 سارے رنگ ہی اڑ گئے وہ جس طرح کی ذومعنی باتیں کر رہا تھا۔
 ”ہر بات میں بتاؤں اور سب نے آپ کا یہ فیصلہ کیسے مان لیا۔ میں ابھی بات کرتی ہوں جا کے۔“ وہ
 تیزی سے جانے لگی۔ پشیم نے اس کا بازو اپنی گرفت میں لے کے اپنے سے اتنا قریب کر لیا کہ خوشنما کے دل
 کی دھڑکن واضح سنائی دے رہی تھی۔
 ”آپ نے میرا مذاق بنا کے رکھا ہوا ہے۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔
 ”اچھا، اچھا! لانا چور کو تو ال کو ڈانٹنے مذاق تو مختصر مدہ آپ نے بنا کے رکھا ہوا ہے ایک بندہ معافیاں مانگ
 مانگ کے اپنی محبت کا یقین دلانا کے اداس ہو گیا ہے تمہیں میری حالت پر جب بھی رحم نہیں آ رہا اور لانا تم
 کہہ رہی ہو میں نے مذاق بنا کے رکھا ہوا ہے۔“ اس نے اسے شانوں سے تھام کے اپنے سامنے کیا۔
 خوشنما کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں کہہ تو وہ بالکل ٹھیک ہی رہا تھا۔
 ”من لو مجھے جھکنے میں پھر بھی عار نہیں تمہیں اشعر کے آفس میں دیکھا تو جانے کیوں تمہاری طرف کھینچا چلا
 گیا اور پھر اپنے آفس میں لے آیا تم آہستہ آہستہ مجھ پر قابض ہوتی گئیں۔ جب ہی میں تم سے اکتایا نہیں
 کیونکہ محبت و پیار میں اکتاہٹ اور غصہ کی کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی مگر تم نے مجھے سوائے غصے طنز اور سرد مہری کے
 دیا کیا ہے۔“ وہ بول رہا تھا خوشنما کو شرمندگی ہی ہو رہی تھی ابھی بھی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کیسے
 اعتراف کرے اس کی محبت کا وہ اس کے بغیر تو ایک بلی بھی نہیں رہ سکتی۔
 ”جب کہ فیصلہ کا اختیار ابھی تم پر چھوڑا تم سے ہوا نہیں جب کہ میں جانتا ہوں تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔ تم زبان
 سے بولو گی تھوڑی ہی اس لیے میں فیصلہ بھی خود کر رہا ہوں تمہیں یہاں سے لے جا کے۔“
 ”پلیز ایسا ظلم نہیں کریں مجھے کہیں نہیں جانا یہیں رہنا ہے آپ کے پاس نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔“ پشیم
 کو تو حیرانگی کا جھکا لگا۔ حیرت و انبساط سے اسے دیکھے گیا اسے تو کب سے اندازہ تھا خوشنما منہ سے اعتراف
 نہیں کر رہی ہے اس لیے اسے ایسی باتوں کا جھکا ضروری تھا۔
 ”تمہیں بدنامی سے ڈر ہو رہا ہوگا۔“
 ”نہیں ایسی بات نہیں ہے میں آپ سے کبھی نفرت کر رہی نہیں سکتی بس غصہ تھا اور آپ سے بدلہ لینا تھا
 ایک لڑکی کو اولین شب اس کا شوہر یوں بلی کی اور جانے کیا بولے کیسے گوارہ کرتی۔“
 ”تم نے سوچا کہ بے وقوف ہے ہر وقت میرے لیے پاگل ہے اسے ایسے ہی مار چر کرتی رہوں گی۔“
 ”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔ پشیم پر شادی مرگ طاری ہو گیا ایسا لگا اس کے
 ہاتھ ہفت اقلیم آ گیا ہو۔
 ”پتا ہے تم نے میرے اتنے خوب صورت دن برباد کیے ہیں تمہیں بھی سزا ملنی چاہیے تمہیں یہاں سے جانا
 ہوگا۔“
 ”نہیں اتنی بڑی سزا! مجھے ڈیوارس نہیں دیں مجھے باندھی بنا کے رکھ لیں۔ میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں
 گے میں اف تک نہیں کروں گی۔“ مضبوطی سے وہ پشیم کو دبوچے ہوئے تھی جیسے وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔
 ”لاحول ولا قوۃ ڈیوارس اتنا گھٹیا لگتا ہوں۔“ وہ اس کی سوچ کو پہلے ہی جان چکا تھا وہ کیا سمجھ رہی ہے

فیصلہ اور نکالنے کو اسے ہنسی بھی آ رہی تھی خوشنما کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر۔
 ”آپ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ اس نے نگاہ بھی چرا لی مگر پشیم سے دور
 نہیں ہوئی۔
 ”ڈیوارس تو خیر نہیں دے رہا اور نہ کبھی تم ایسی بات کی توقع بھی نہیں کرنا۔“ اس نے لہجے میں مضبوطی
 رکھ کے اسے جتایا۔
 ”تمہیں باندھی بنا کے رکھ لیں گے جو بھی میں سلوک کروں گا تم اف تک نہیں کرو گی، پھر تم جانتی ہی ہو
 باندھی کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔“ وہ معنی خیزی سے مسکراتے لگا۔ خوشنما کے گھبراہٹ میں پسینے چھوٹ گئے۔ وہ
 اس سے دور ہوئی مگر پشیم کی گرفت اس کے بازو پر مضبوط تھی۔
 ”وہ..... وہ میں نے تو.....“ الفاظ بھی نہیں بن رہے تھے۔
 ”وہ..... وہ..... کیا.....!“ اس نے خوشنما کے داہنے رخسار پر پیار کی مہر ثبت کی وہ چھوٹی موٹی سی ہو گئی۔
 ”کہاں گئی تمہاری پراعتادی بہت بڑے بڑے بولتی تھیں۔“
 ”پلیز سوری۔“ وہ واقعی دل سے شرمندہ تھی۔
 ”یہ سوری وری کا ناٹم گیا جلدی سے پیننگ کرو۔“
 ”پھر وہی بات معاف کر دیں۔“ وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔
 ”خوشنما! میں اپنے ہنسی مون ٹرپ کے لیے پیننگ کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ زیادہ کچھ پیک نہیں کرنا جس
 چیز کی ضرورت ہوگی وہاں سے دلا دوں گا۔“ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا خوشنما کو تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔
 ”آپ تو انگلیڈ جانے والے تھے۔“ اس نے حیرانگی سے پھر پوچھا۔
 ”انگلیڈ کی کہانی تو یہ ہوئی کہ نانا جان اور بڑی مائی نے کہا کہ ابھی پوسٹ پونڈ کر دو کیونکہ میرا ٹرپ چھ
 ماہ کا تھا۔ وہ کہنے لگیں فاران اور مریم ہنسی مون پر جا رہے ہیں، تم اور خوشنما بھی جاؤ۔“ اس نے ساری بات
 اسے سمجھا دی۔
 ”راہ انگلیڈ جانا ہنسی مون سے واپس آ جائیں پھر کچھ ماہ بعد ہم دونوں ساتھ جائیں گے کیونکہ اکیلے تو
 میرا دل نہیں لگے گا۔“ پشیم اس کے دونوں ہاتھ پریم سے تھام کے نشیلے لہجے میں گویا ہوا۔
 ”آپ بہت اچھے ہیں۔ میں نے آپ کو کتنا زچ کیا پھر بھی آپ مجھ سے بے زار نہیں ہوتے تھے۔“ وہ
 پشیم کی اس خوبی کی معترف ہو گئی تھی۔
 ”دل و جان سے تم سے رشتہ جو جوڑ لیا ہے اور جن سے دل سے رشتے جوڑے جاتے ہیں ان سے بے
 زار نہیں ہوا جاتا۔“ اس نے بڑے کبیر لہجے میں بڑے جذب سے کہا۔
 ”میں شاید آپ کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ آپ کو جانے کیا کیا نہیں کہا۔“
 ”ہر لڑکی کا یہ فطری عمل ہوتا ہے تمہاری جگہ اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی میں نے کون سا
 تمہارے ساتھ اچھا کیا تھا۔“ اس نے اس کے نرم ملائم ہاتھوں کو اپنے پیار کی گرمی سے دبا یا تھا۔
 ”اچھا ابھی ان سب باتوں کو چھوڑو۔“
 ”کیسے چھوڑوں ان سب باتوں کو کل میں اتنے اہتمام سے آپ کے لیے تیار ہوئی تھی آپ نے ذرا بھی
 توجہ نہیں دی اور رات میں بھی مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کر کے سو گئے پوری رات اور آج پورا دن میں

انکشاف

ابن شریک کریم

عوبصورتی کی ابتداء

ابن سے!

English
UBTAN TURMERIC CREAM

ابن شریک کریم پورے اور بدن کے لئے ایک منفرد کریم ہے جو قدرتی جڑی بوٹیوں، ابن شریک اور ہلدی سے تیار کی گئی ہے۔
یہ کریم ہموار، چمائی اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے چلدے داغ، رنگت گوری اور
سرخی ہو جاتی ہے۔ انکشاف ابن شریک کریم پورے بدن پر استعمال کرنے سے جلد ریشم کی طرح نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔
یہ کریم ایک اور قدرتی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہترین نتائج کے لئے صبح اور رات کو سونے سے پہلے استعمال کریں۔

انگاروں پر لوٹی ہوں۔“ وہ شکوہ کرنے لگی۔
”کل میری نگاہیں تم سے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔ اتنی حسین شہزادی لگ رہی تھیں یہ میں ہی جانتا ہوں کیسے
اپنے اندر کے جذبات کو ڈانٹ ڈپٹ کے سلا یا تھا۔“ وہ مسکرا کے بولا۔ خوشنما جھینپ گئی۔
”جلدی سے تھوڑی سی اپنی اور میری پیکنگ کرلو۔ کل دوپہر تین بجے کی اسلام آباد کی فلائٹ ہے۔“
”آپ نے سب اتنی جلدی جلدی کر لیا مجھے امی کو بھی تو بتانا ہوگا۔“
”انہیں میں ساری تفصیل دے کے آیا ہوں کہہ رہی تھیں رات کو ملنے آئیں گی۔“
خوشنما نے تمیز زدہ ہو کے کھلمنہ کے ساتھ پیٹشم کے چہرے کو دیکھا وہ تو اس کے دل کی ہر بات پہلے سے جان
لیتا ہے کتنی بچی اور دل سے محبت کرتا ہے وہ ادھر والے کا شکرا ادا کیے جا رہی تھی شوہر اسے قدر کرنے والا ملا تھا۔
”ساری پیکنگ جلدی سے نمٹاؤ رات کو ہم دونوں صرف اپنی باتیں کریں گے۔“ آنکھوں میں نشہ اور
لہجے میں ترنگ لیے اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔
وہ شرم سے مسکرا دی اور پیٹشم کے شانے سے لگ گئی۔
”مجھے ڈھیر سارے بچے چاہیے تاکہ تمہیں الماسیدھا سوچنے کا ٹائم نہیں ملے۔“
”کیا ڈھیر سارے.....؟“ وہ تو اچھل کے الگ ہو گئی۔
”مجھے تو اپنے ماں باپ کا سہیہ نہیں ملا اپنے بچوں کو دیکھ کر پیار کرتے محسوس کر لوں گا کیسے میرے ماں
و باپ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے۔“ پیٹشم کو اپنے ماں و باپ کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔
”آپ نے اپنے ماں و باپ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔“
”چھوٹا تھا، نا تا جان نے اور ان سب نے ہی مجھے پالا اور رکھا ہے۔“ اس نے بتایا۔
”چھوڑو ان باتوں کو ورنہ میری طبیعت اداس ہو جائے گی۔“
”ہوں۔“ خوشنما نے سر ہلایا۔
”میری یہ بھی فکر دور ہوئی جو ہم کا بھی رشتہ لگ گیا۔“
”آپ کو سب کی اتنی فکر رہتی ہے یا ابھی ہونے لگی ہے۔“
”میں شروع سے سب کی فکر کرتا ہوں اور اب تمہاری مجھے ہر وقت فکر اور خیال رہتا ہے تمہیں میری ذات
سے تکلیف نہ ہو۔“ وہ ذرا انجیدہ لہجے میں بولا۔
”میں بھی خیال رکھوں گی میری ذات سے آپ کو بھی کوئی شکایت نہیں ہو۔“ اس نے یقین دلایا۔
”میں نے یہ تہیہ کیا ہوا تھا میں تمہیں تمہاری رضا سے ہی مانگوں گا کیونکہ رضا مندی سے زندگی زیادہ خوب
صورت ہو جاتی ہے۔“ وہ جذب سے بول رہا تھا۔
”ہوں۔“ اس نے بھی تائیدی سر ہلایا۔
ساری دھند چھٹ گئی تھی ہر چیز دھل کے نکھر گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی اور شریک سفر پر جتنا بھی تازہ کرتی کم تھا
مگر اسے یہ سب اوپر والے کی رضا سے ہی ملا تھا اوپر والا اپنے بندوں کا اچھا ہی سوچتا ہے۔
”اے میرے رب! ساری لڑکیوں کو قدر کرنے اور محبت کرنے والا شریک سفر دے، آمین۔“ اس نے
دل میں دعا کی تھی۔

.....☆ ختم شد ☆.....

اقراء چنا

مکمل ناول

تہا لیکھا لکھ شہر میں

”ہم پھر کب ملیں گے؟“ اس نے معصومیت بھری گول گول آنکھوں سے اپنے پہلو میں بیٹھی اس مہربان شخصیت کی جانب دیکھا۔

”شاید..... بہت نام کے بعد۔“ تھوڑا وقت سوچنے کے بعد اس نے ہاتھ پھیلا کر جواب دیا۔
”میں آپ کو بہت مس کروں گی بھیا!“ اس کی گول گول کالی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ اسے اس قدر دیکھی دیکھ کر بے قرار ہوا اپنی گڑیا جیسی بہن سے جدائی پر وہ بھی اندر ہی اندر رو رہا تھا لیکن اس کے سامنے ٹوڈ کوئڈ روکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ایا مجھے بہت دور لے کر جا رہے ہیں جہاں سے اتنا جلدی آنا آسان نہیں ہے میری گڑیا! پر میں پوری پوری کوشش کروں گا کہ میں اپنی گڑیا سے ملنے آ سکوں۔“ یہ ایک نو سالہ بھائی کا اپنی پانچ سالہ بہن سے وعدہ تھا۔ البصار کا وہ ہی نرم بیٹھا لہجہ جو اس کو ہمیشہ مطمئن کر دیتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔
”پاپا آپ کو کیا لے کر جا رہے ہیں بھیا؟“ ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر۔ وہ اس کے سینے کے سامنے کھڑی تھی۔
”دبی.....“ وہ اداسی سے بولا۔



”دینی بہت دور ہے؟“

”ہاں بہت دور۔“ آسمان پر چاند مکمل تھا جو کہ پورے ماحول کو روشن کیے ہوا تھا مگر ان دو معصوم ننھے پرندوں کی کہانی ادھوری ہوئے جارہی تھی۔ چاند بھی انہیں چپکے چپکے دیکھ کر اداس ہو رہا تھا۔

”یہ میرا ہے، یہ مجھے دو، زین کے بیچے۔“ وہ چونک کر باسی سے حال میں بولی تھی۔ سرین باجی کے دونوں بیچے آپس میں لڑ رہے تھے، زین کے پیچھے اٹھ بھاگ رہی تھی۔ وہ چوکت پر بیٹھی ان دونوں کو غور دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بھٹک جایا کرتی تھی، اس کی زندگی کا خاص حصہ اس بھیا اسے جدائی دے گیا تھا۔ جس سے دور رہنے کا بھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں لوٹے تھے۔ تو کیا ”دینی“ سے پاکستان کا سفر اتنا زیادہ تھا وہ اکثر سوچا کرتی تھی۔

☆.....☆

”کس سے ملنے آئی ہو؟“ ہمیشہ کی طرح صمد نے اس کا راستہ روکا تھا۔ اس نے ناگوار بیت سے اسے دیکھا۔

”جب اس سوال کا جواب معلوم ہے تو پھر پوچھنے کی کیا تنگ ہے؟“ اس نے ابرو اچکا کر طنز کیا۔

”کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ بھی تمہارے منہ سے یہ ہی نکل جائے کہ عبدالصمد میں تمہارے لیے آئی ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص شوخ انداز میں بولا۔

”ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں میں صرف دادا، دادی سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں تم سے ملنے آؤں۔“ وہ اپنے شولڈر کٹ ہال ٹھیک کر کے بولی۔

”دادا..... دادی جیسے بورنگ لوگوں سے ملنے سے بہتر ہے کہ آپ نئے جدید دور کے اس بینڈم نو جوان سے کچھ پل گفتگو کر لیں۔“ وہ موڈ میں ہوتا تو اکثر اسے زچ کرنے کی کوشش کرتا، اسے اچھا لگتا تھا۔ رائیل کے مرجھائے چہرے پر کچھ پل کے لیے مسکراہٹ سجانا، رشتے میں وہ اس کا تباہیاد تھا، دونوں کے گھر برابر میں تھے۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا، بہنیں دونوں میرڈ تھیں، دادا، دادی بھی اپنے بڑے بیٹے کے گھر میں رہتے تھے۔

”مجھے ان پرانے زمانے کے لوگوں کے ساتھ بہت مزہ آتا ہے۔“ اس نے دانستہ چبا کر جواب دیا۔

”آزادی سے بھی پہلے کے زمانے کے ہیں یہ دونوں اور قسمت دیکھو، ابھی تک صحیح سلامت اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، جس دور میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے تیل گاڑیوں کا استعمال کرتے تھے۔ وہیں اب وہ موبائل اور کمپیوٹر کے دور میں بھی بڑی شان سے جی رہے ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔“ وہ ہمیشہ دادا اور دادی کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا تھا اور رائیل بھی اس کی باتوں پر غصہ ہو جاتی تو بھی ہنس پڑتی۔ اس وقت بھی وہ اس کی جانب پشت کیے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

”ہنسنا ہی ہے تو چھپ کر کیوں؟“ وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”صمد! تم سیدی لائن پر آ جاؤ، ورنہ پٹو گے میرے ہاتھوں۔“ وہ کھنکتی ہوئی ہنسی کے دوران بول رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر تم اسی طرح ہنستی رہو تو میں پنپنے کے لیے بھی تیار ہوں۔

”ہٹو! مجھے جانے دو، میں کھیر لائی ہوں ان دونوں بزرگوں کے لیے۔“ وہ اسے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دے رہی تھی، جویوں ہی اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔

”پہلے ہی ان دونوں کو شوگر ہے تم انہیں یہ کھیر کھلا کر اوپر کی نکت کٹوانا چاہتی ہو کیا۔“ وہ بعض نہیں آ رہا تھا۔

”یہ تمہارے سر پر شیخ دوں گی اور تمہارے اوپر کی نکت کٹ جائے گی۔“ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ منہ پھلا کر بولی۔ وہ زیر لب مسکراتا رہا، ان دونوں گھرانوں میں دادا اور دادی کے علاوہ ایک وہ صمد ہی تھا جس کے ساتھ وہ تھوڑا ہنس بول لیتی تھی۔ وہ اکثر اس کے بوجھل دل کو کچھ دیر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔

دادا اور دادی اس کی عین توقع کے مطابق اپنی اپنی کرسی سنبھالے آزادی کے دور کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے آگے بیٹھے تھے وہ مسکراتی ہوئی ان دونوں کے قریب گئی۔

☆.....☆

وہ بیتی ہوئی دوپہر میں سفید یونیفارم میں کندھوں پر بیگ لٹکائے گھر میں داخل ہوئی۔ ہال روم کے اندر کا منظر دیکھ کر دل بچھ سا گیا۔ ماما محمد شفیع کے ہمراہ صوفے پر براہمن تھیں اور ان کے ارد گرد ان کے دو بیچے، ہانیہ اور عماد تھے۔ عماد ماما کو اپنا رزلٹ دکھا رہا تھا اور ماما اس کی پیشانی چوم رہی تھیں جب کہ ہانیہ ماما کے گلے کا ہار لپی ہوئی تھی اور محمد شفیع بھی اس خوشگوار منظر میں شامل تھے۔ زندگی میں ایک ماں کا یہی خالص رشتہ اس کے حصے میں آیا تھا اور وہ بھی بانٹ لیا گیا تھا۔ جب بھی وہ ان افراد کو ماما کے قریب دیکھتی، ذہنی انتشار کا شکار ہو جایا کرتی تھی اور جی چاہتا رہے گوئیں نہیں کر دے۔ جی تیج کر پوری دنیا سے کہہ دے کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ وہ بیتی ہوئی واپس باہر کی جانب مڑتی، لان میں پہلے اس نے بیک کندھے سے اتار پھینکا اور پھر خود بھی غصے سے نرم اور ہلکی کیلی گھاس پر بیٹھ گئی۔ غائب دماغی سے گھاس نوچتی رہی۔ احسن بغور اسے دیکھ رہا تھا، وہ مالی کو ہدایت دے رہا تھا۔ وہ رائیل کو اس کے بچپن سے دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ بچپن سے ہی ایسی تھی عمر کے کسی حصے میں اس نے رائیل کے رویے میں تبدیلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ماما کے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

دھوپ سے اس کے سرخ ہوتے ہوئے گال تہمتار ہے تھے۔ وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ وہ اس معصومی لڑکی کے تمام دکھوں کو چننا چاہتا تھا جو ہر وقت خود سے ابھی رہتی تھی۔ وہ اسے دل سے اپنی بہن ماننا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے بھی بھائی کا درجہ نہیں دے گی کیوں کہ وہ بھی محمد شفیع کا بیٹا تھا اور رائیل تو محمد شفیع اور ان کی تینوں اولاد سے سخت اختلافات رکھتی تھی۔

”کیا پریشانی ہے؟“ پریشانی وہ اس کی جانتا تھا مگر بات کے آغاز کے لیے کچھ تو پوچھنا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ انداز دو ٹوک تھا۔

”بہت عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ ابھی رہتی ہو، پریشان رہتی ہو۔ اپنا کچھ مجھے بتاؤ کیا پتا دل کا بوجھ مجھ بتانے سے کچھ اچھا مل کر دے۔“ وہ اس کی گول گول آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ کئی اداس اور بوجھل تھیں۔

”میں کیوں اپنی پریشانی آپ سے شیئر کروں؟“ وہ ڈھیٹ بنی ہوئی تھی۔

”میں بھی تو بھائی ہوں نا تمہارا۔“ وہ جانتا تھا کہ بھائی کا لفظ بھی اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا اور اس لفظ کی اہمیت اس نے صرف ایک ہی شخص کو دی تھی۔ رائیل نے پہلی بار احسن کو دیکھا وہ اس سے نگاہیں ملانے لگا۔ وہ دونوں بہت کم مخاطب ہوا کرتے تھے۔ بلکہ وہ ماما کے علاوہ اس گھر میں کسی سے بھی مخاطب ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ ماما اسے بہت سمجھایا کرتی تھیں کہ وہ دونوں اب محمد شفیع اور ان کے بچوں کی زندگی میں شامل ہو چکی ہیں، بہتر ہے کہ رائیل بھی انہیں قبول کر لے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اس نے ماما کی کسی ہدایت پر غور نہیں کیا۔

بکھڑاری کی حدود میں تو وہ بہت بعد میں داخل ہوئی۔ جب کچی عمر تھی حافظہ اتنا مضبوط نہ تھا، تب بھی اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی۔

”کب تک البصار کا انتظار کرتی رہو گی۔“ وہ سرد مہری سے بولا۔

”جب تک یہ زندگی ہے۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

”چھوٹی سی باتوں کو تم نے اس قدر دل پر لیا ہے کہ تمہیں تمہارے نظریے کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“

”یہ ضد نہیں ہے۔ میرا حق چینیٹا گیا ہے۔ بچپن میں ہی باپ سے علیحدگی، بھائی سے دوری، ماما کا دوسرا نکاح اور پھر ماما کا تقسیم ہو جانا۔“ اس کی آنکھوں میں کچھ جھپٹے لگا اور احسن کو لگا وہ اسے اکسانے میں تھوڑا تھوڑا کامیاب ہو گیا ہے۔

”تقسیم نہیں کیا گیا جو پہلے تمہارا تھا وہ اب بھی تمہارا ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔ رائیل خاموش رہی۔ شاید اور بولتی تو رو بڑی اور وہ خود کا یہ بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”رائیل! تم بہت بھولی ہو، پر تم بہت خوش قسمت بھی ہو، تم شکوے مت کرو، دکھی تو وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے ان کے قریبی رشتے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں اور ان لوگوں میں غار میں اور ہانیہ بھی شامل ہیں۔“

وہ اپنی امی کے لیے بول رہا تھا۔

”تم تو خوش قسمت ہو کہ تم جنہیں اتنا پیار کرتی ہو وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔“ وہ اسے حقیقت دکھانا چاہ رہا تھا۔

وہ بغور اسے سن رہی تھی اور احسن کو سننا اسے اچھا بھی لگ رہا تھا۔ چند ٹاپے وہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئی تھی لیکن اچانک اس نے پیدا ہونے والے خیال کو جھٹکا، وہ اس کی جانب مڑی آنسوؤں کو پٹی گئی۔

”میں نے جو کھویا ہے، اس کا کوئی ازالہ نہیں کر سکتا نا، پھر میں کیوں کسی کو معاف کر دوں، یہ سب دل سے نکالنا اتنا آسان نہیں، میں یوں ڈھیٹ بن کر زندگی گزارنے میں ہی مطمئن ہوں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر اٹھ گئی اور وہ پریشانی میں ہونٹ پیچھے اسے دور جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆.....☆

اس کے پاس سب کچھ تھا، اس کی کہانی مکمل تھی اس کی تصویر مکمل تھی۔ ایک شفیق باپ کا سایہ اس کے سر پر تھا۔ ایک ماں کی مکمل توجہ کی مرکز تھی وہ اور ہمہ وقت بے پناہ محبت کرنے والا بھائی تھا اس کے ساتھ۔ ہر روز کی طرح اس وقت بھی وہ مکمل زندگی سے مزین اس تصویر کا فریم ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ تصویر اس کی سالگرہ کی تھی۔ جس میں وہ ماما باپا اور بھیا تھے۔ چاروں چہرے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں وہ سنہری بالوں والی گڑیا تھی جو بھیا ہی نے اسے گفٹ کی تھی جو کداتنے سال گزرنے کے بعد بھی آج بھی اسی حالت میں موجود تھی۔ سب اتنے خوش تھے تو پھر کس کی نظر لگ گئی انہیں، وہ ایک خوب صورت خوشیوں کا مکمل یوں زرد زرد کیوں ہو گیا؟

رفعت بہت دیر سے آئی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی مگر پھر بھی اس کا انہماک نہیں ٹوٹا تھا اس کی توجہ کا مرکز وہ تصویر ہی بنی ہوئی تھی۔

”ماما کیا آپ فری ہیں؟“ اس کی سماعتوں نے ہانیہ کی آواز سنی جو دروازے کی دہلیز پر کھڑی ماما سے مخاطب تھی۔

”ہاں بیٹا! آ جاؤ۔“ ماما کا وہ ہی مامتا بھرا لہجہ تھا جو وہ ہمیشہ اپنے تمام بچوں کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں اور رائیل کے اندر تک آگ لگ کر خاک ہو جایا کرتی تھی۔ ہانیہ ماما کے پاس آگئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ وہ کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ اس نے ماما کے گرد بازو جامل کر رکھے تھے۔ اس کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔ اس نے تصویر کا فریم رکھا اور تیزی سے ان دونوں کی جانب آئی۔

”ہانیہ! مجھے ماما سے بات کرنی ہے۔ تم پلیز بعد میں ان سے مل لینا۔“ وہ سرد مہری سے اس سے مخاطب تھی۔ ہانیہ کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ میسر غائب ہوئی۔

”بیٹا! بیٹھنے دو اسے بھی اور تم بھی آ جاؤ میرے پاس۔“ ماما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔ وہ اسی طرح چھٹی تھیں کہ رائیل کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔

”ہانیہ! تم گئی نہیں ابھی تک۔“ اس نے طنز یہ کہا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ رفعت نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ آخر کو وہ اتنی پتھر دل کیوں ہوئی جا رہی تھی وہ چاہتی کیا تھی کیا اسے یہ سب کر کے تسکین ملتی تھی؟ ایسے میں وہ رائیل کے چہرے پر سکون دیکھتی تھیں اور آنکھوں سے وہ جتا دیتی تھی کہ ”دیکھیں! آپ صرف میری ہیں۔“

☆.....☆

ہر گزرتے دن کی طرح اس روز بھی دن خاصا گرم تھا جانے اتنی گرمی کیوں ٹوٹ پڑی تھی، اب تو پہلے کی طرح اتنی باتیں بھی نہیں ہو رہی تھیں، ٹھن تھی کہ برساتی جا رہی تھی۔ وہ بیرونی دروازے تک آئی تھی۔ ملازمہ نے اسے اطلاع دی تھی کہ کوئی دروازے پر اس سے ملے آیا تھا۔ اس نے دروازہ دیا اور دروازے کے اس پار دو دو چہرہ نہوجوان مسکراتے ہوئے چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

”بیٹی کیا کام ہے؟“ انداز روکھا تھا۔

”بیٹی، خود پہنچا ہے۔“ سفید رنگ کی ٹی شرٹ والے شخص نے ضرورت سے زیادہ مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے اس کے پیچ کر اسے اور پھر دوسرے والے کو بخوردیکھا۔ کہیں تو کچھ تھا اس نے دماغ پر زور دیا دائیں گال کے تھوڑا نیچے سیاہ داغ رائیل کیسے بھلا سکتی تھی۔

”آپ..... آپ البصار احمد ہیں؟“ حیرت خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ دونوں ہی اس کی حالت پر محفوظ اور رہے تھے۔

”بالکل میری گڑیا۔“ وہ ہی بیٹھا لہجہ تھا۔ البصار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور رائیل کو لگا یہ گول دنیا سٹ کر اس کے قدموں میں آگئی ہو، وہ تپتا ہوا موسم ایک خوشگوار موسم میں بدل گیا ہو۔ اس کے آس پاس رم، جھم برسات ہو رہی ہو اور تپتے ہوئے صحرائیں برسوں کی پیاسی اس رم جھم برسات میں بیگم رہی ہو اور اس کا دل تنہا کر رہا تھا کہ وہ اپنی دل کی خوشی کی انتہا پوری دنیا کو بتلائے کہ وہ ناامید نہیں ہوئی۔ اس کی امید بخت لگی۔

البصار اندر داخل ہوا تو وہ اس کے سینے سے جا لگی۔ آنکھوں میں آنسو ٹپٹانے لگے۔ یقیناً وہ آنسو خوشی کی نشاندہی کر رہے تھے اور عائش ان دونوں بہن بھائیوں کو کچھ کر مسکرا رہا تھا۔

”کیسی ہو تم؟“ البصار نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے محبت سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

”کیسی ہو سکتی ہوں اپنے بھیا کے بغیر.....؟“

”بہت مشکل سے تمہارے اس گھر کا ایڈریس معلوم کر کے آیا ہوں۔ بھیا بھی تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔“ وہ اس

کی پیشانی چوم کر بولا۔

”اچھا! اندر تو آئیے۔“ وہ اسے اندر کی جانب لے جانے لگی تو عائش بھی اندر داخل ہوا۔

”آپ کہاں.....؟“ اس نے پوری آنکھیں نکالیں۔

”ہوں..... اتنی گرمی میں باہر تو نہیں رک سکتا۔“ اس کی لاتعلقی پردہ نیم غصے سے بولا۔

”تو گاڑی میں بیٹھ جائیں۔“ وہ ہٹ دھرم ہوئی۔

”کیوں گاڑی میں بیٹھوں؟“

”ڈرائیور جو ہو۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔

”رائیل! یہ میرا دوست ہے اندر آنے دواسے۔“ البصار نرمی سے بولا۔ رائیل نے منہ چڑاتے ہوئے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ ماما کو بلند آواز میں پکارتی ہوئی البصار کے پاس لے آئی۔ رفعت کی بھی نگاہیں البصار کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھیں۔ اسے خود سے جدا کرنے کا فیصلہ اس کا خود کا تھا لیکن رات بھر وہ اس کے لیے رو دیا کرتی تھی۔ لپک کر اسے گلے سے لگایا۔ البصار کے اعصابوں میں کوئی جنبش نہ آئی۔ اس نے خود کو مضبوط کر لیا تھا بالکل ایک پتھر کی مانند ماں کے رشتے سے اس کا یقین جو ٹوٹ گیا تھا، اس کے بعد رائیل اس کو اپنے روم میں لے آئی تھی۔

”بھیا! میں آپ کے لیے میٹگو جس لے کر آتی ہوں۔ آپ کو بہت پسند ہے ناں؟“ وہ اٹھنے لگی۔

”نہیں گڑیار بند ہے، اب میں نہیں پیتا۔“ اس نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

پھر وہ انھی اور وہ تمام چیزیں لے کر آئی جو وہ ہر سال البصار کی سالگرہ کے موقع پر بطور گفٹ لیا کرتی تھی۔ جن میں رسٹ وایج، بشرٹیں، ڈائریاں وغیرہ شامل تھیں۔

”یہ سب آپ کے لیے ہیں۔“ وہ جوش میں چپک کر بولی۔

”ابھی فی الحال اپنے پاس رکھو۔ بعد میں لے جاؤں گا۔“ وہ مسکرایا۔ عائش دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”اچھا! تو آپ کب دینی سے آئے؟“ اس نے پوچھا۔ رفعت اس سب کے دوران خاموش بیٹھی تھیں۔ انہوں نے البصار کی بے رخی محسوس کر لی تھی۔

”دو دن پہلے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ابھی واپس تو نہیں جائیں گے ناں؟“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”ابھی کچھ ٹائم ادھر ہوں۔ ہم برنس کے حوالے سے آئے ہیں۔“

”برنس کے لیے؟ مجھ سے ملنے نہیں۔“ اس کا چہرہ بچھ گیا۔

”یقیناً تم سے بھی ملنے۔“ البصار نے ہلکے سے اسے چپت لگائی۔

”پاپائیک ہیں؟“ انگلیاں آپس میں مروڑتے ہوئے پوچھا وہ چاروں نفوس خاموش ہو گئے۔ رفعت نے نگاہیں چرائیں۔

”آس..... ہاں..... ٹھیک ہیں وہ۔“ اس نے کن اکھوں سے رفعت کو دیکھا۔

”آپ مجھے کب اپنے پاس لے جائیں گے؟“ اسے ہمیشہ ایسا ہی لگتا تھا کہ جب بھیا آئیں گے تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کیونکہ ان کی کتنی خواہش تھی کہ وہ اسے سب سے چرا کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس وقت وہ مجبور تھا اب وہ سوچتی تھی کہ اب تو بھیا ضرور لے جائیں گے۔ وہ کیسے بھی کر کے ماما کو راضی کر لیں گے۔ اس کے اس طرح

وال کرنے پر البصار کے چہرے کے تمام رنگ اڑ گئے تھے۔ ماما اور عائش نے چونک کر رائیل کو دیکھا۔ وہ ہر تاثر سے بے نیاز ایک ننگ البصار کو دیکھ رہی تھی وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”بھری گڑیا! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ تم اپنی ماما کا سہارا ہو۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں بہت پہلے ہی تمہیں لے جاتا ہوتا۔“ اس نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

”پہلے اب آپ کے ساتھ ہی تو رہتا ہے۔“ اس نے البصار کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

رفعت کا جی چاہا اسے جھجھوڑ کر پوچھے کہ تمہارے بغیر میرا کیا ہوگا۔ میرے جینے کی وجہ تو صرف تم ہووہ نہ ہر کا گھونٹ لے کر رہ گیا۔

”میں پہلے ہی بانٹ لیا گیا تھا۔“ وہ افسردگی سے بولا۔ ماضی کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔

”یہ کیا بھی تم دونوں کے علاوہ یہاں دو لوگ اور بھی موجود ہیں۔“ عائش نے درمیان میں دخل اندازی کرنا ضروری سمجھا، وہ البصار کی زندگی کے ہر راز سے واقف تھا۔ رفعت کے چہرے کے تاثرات اس سے چھپ نہ سکتے تھے۔

شام ہوتے ہی البصار جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رائیل اور رفعت نے اسے بہت کہا کہ وہ ہمیں رہ سکتا ہے مگر اس نے معذرت کر لی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہ دونوں روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

البصار نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ آج کے دن کہیں باہر جائیں گے۔ وہ ریڈی ہو جائے۔ ماما سے اجازت لے کر وہ خوشی سے تیار ہوئی تھی۔ روم ڈور ٹاک ہونے پر اس نے مڑ کر دیکھا، دروازے کے درمیان میں عائش بلیک آؤٹ ہوئی اور لائٹ بیوشرٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔

”بھیا کہاں ہیں؟“ اس نے اس کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔

”وہ نیچے ہمارا ویٹ کر رہا ہے۔ آپ کو لینے ہم آئے ہیں۔“ وہ سر کو خم دے کر بولا۔

”اچھا پھر چلو۔“ وہ آگے بڑھنے لگی۔

رائیل کیا تم مجھ سے دوستی کرو گی؟“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی اس غیر بنجیدہ حرکت پر وہ چونکی۔

”نہیں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ اسے بھیا کے اس دوست پر غصہ بھی آیا جو کہ اتنے کم وقت میں اتنا زیادہ فری اور ہاتھا۔

”اچھا! دوستی نہیں کرنی تو ہم ساتھ کھیل تو سکتے ہیں ناں؟“ وہ سینے پر بازو لپیٹے اطمینان سے بولا۔ اس کے آخری جملے پر وہ حقیقتاً چونکی اور کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ ہی جملہ اس نے پہلے کبھی بھی سنا تھا۔ پہلے بہت پہلے..... بچپن میں..... جب وہ ایک دن بھیا کے ساتھ لان میں کھیل رہی تھی اور بھیا کا ایک ہم عمر دوست اس کے پاس آیا تھا۔

”رائیل کیا تم مجھ سے دوستی کرو گی؟“ عائش نے اس گول مٹول دو چٹیوں والی لڑکی کے آگے ہاتھ بڑھایا تھا۔

”نہیں! اما منع کرتی ہیں ہواؤں سے دوستی نہیں کرنی۔“ اس نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔

”اچھا! دوستی نہیں کر سکتیں تو ہم ساتھ کھیل تو سکتے ہیں ناں؟“ انداز میں معصومیت سموئے وہ اس لڑکی کو قائل کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایٹ لسٹ وہ مان گئی تھی۔

”تم بھیا کے بچپن کے دوست ہو عائش۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ وہ بالکل بھی تو نہیں بدلی تھی۔ عام لڑکیوں سے بالکل

جد لگتی تھی۔ شو لڈر کٹ ہال، ہینٹھی جسامت، گوری رنگت اور سرخ ہوتے گال اور سب سے زیادہ پرکشش اس کی آنکھیں۔ بالکل گول گول اور ایکدم سیاہ اور ان میں ہلاکی معصومیت۔
”تم تو مجھے بھول گئی تھیں مگر مجھے یاد ہو۔“ وہ بھی ہنسنے لگا۔
”تم اب تک بھیا کے ساتھ ہو، کیا دوتی ہے۔“ اس نے سراہا۔

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے بیرونی گیٹ سے باہر آ گئے تھے۔ جہاں البصار گاڑی میں بیٹھا ان کا منتظر تھا اور وہ شام بہت پر لطف اور خوشگوار تھی۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ جتنا بھی وقت ان تینوں نے ساتھ میں گزارا وہ بہت حسین اور یادگار تھا۔ رات کے نو بجے وہ واپس گھر آئی تھی۔ گاڑی سے اتری تو عبدالصمد نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

”تم کہاں تھیں؟ کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ نیم روشنی میں گاڑی میں بیٹھے دونوں نفوس اس لڑکے کو ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہے تھے۔

”بھیا کے ساتھ باہر گئی تھی۔ چلوں ملواتی ہوں تم اس دن بھی گھر سے غائب تھے۔“ وہ اسے لیے گاڑی تک آئی اور تینوں کا آپس میں تعارف کروایا۔ البصار کا انداز تو نارمل تھا لیکن عائشہ کو عبدالصمد کا یوں رائیل سے انتابے تکلف ہونا کھلنے لگا۔

”اب چلو، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ اسے تیزی سے لیے بیرونی گیٹ عبور کر گیا۔ عائشہ نے پرسوج انداز سے سرپیٹ کی پشت سے لگا دیا۔

”کیا بات کرنی ہے تمہیں؟“ اسے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ بے زاری سے بولی۔
”تم اس ریشم کو جانتی ہونا، جس کا گھر گلی کے کٹر پر ہے۔“ وہ بے قرار تھا اسے داستان سننے کے لیے۔
”ہاں جسے تم ہر وقت فون کرتے تھے۔“ اس نے کھلی اڑائی۔ جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”ہاں فون اسی کی طرف سے آتے تھے مجھے۔ وہ بھی پیچھے بڑی تھی میرے۔“
”تو پھر میں کیا کروں؟“ اسے اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
”اس کی شادی طے ہو گئی ہے۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوا۔

”تو..... تم رکاو دو۔ اپنے والدین کو اس کے گھر بھجواؤ۔ اگر نہیں تو بھگلاؤ۔“ اس نے سنجیدگی سے حل پیش کیا۔
”نہیں شادی تو اس سے نہیں کرنی۔ وہ تو کوئی امتیاز ہوگی۔“ اس نے بال کھجائے۔ رائیل نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
”تو پھر۔“

”تو پھر اس سے جان چھوٹی میری۔“ وہ ہلکا پھلکا ہو کر ہنسنے لگا۔ وہ ہمیشہ اسے ایسی بے کار باتوں میں الجھا دیا کرتا تھا۔

”تم بہت الو ہو۔“ اسے غصہ آیا۔ وہ کتنی فالتو باتوں کے پیچھے کتنا وقت برباد کرتا تھا۔
”مزہ آتا ہے۔“ اس نے انگڑائی لینے والے انداز میں ہاتھ اونچے کیے۔
”تم ایک دن میرے ہاتھوں قتل ہو گے۔“ اسے دھکا دے کر وہ آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆

”السلام علیکم۔“ کوریڈور میں محمد شفیع ان سے ٹکرا گئے تھے۔ عائشہ نے انہیں پر تپاک انداز میں سلام پیش کیا تھا۔ انہوں نے بغور ان دونوں کو دیکھ کر سنجیدگی سے سلام کا جواب دیا۔

”انکل! ہم رائیل سے ملنے آئے ہیں۔“ جواز بھی عائشہ نے پیش کیا۔ البصار کے تاثر سیٹ تھے۔
”ہاں..... وہ اپنے روم میں ہوگی۔“ انہوں نے اس کے روم کی جانب اشارہ کیا تو عائشہ ان سے ایک سیلے زکرتا ہوا البصار کے ہمراہ رائیل کے روم کی جانب بڑھ گیا۔

”میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ سنڈے کو رہنے دو، وہ گھر پر ہوں گے۔“ البصار نے عائشہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔
عائشہ کو ہونٹ کے روم میں گھٹن ہو رہی تھی وہ البصار کو منٹ ساجت کر کے وہاں لے کر آیا تھا۔ عائشہ، رائیل کو پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر چپک چپک اٹھی۔

”بھیا! میسر پر آ جائیں۔ آپ کے لیے ایک چھوٹا سا سر پرائز ہے۔“ لکڑی کے گول میز پر چائے کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات سجائے ہوئے تھے۔ ان کی خوشبو بھی عائشہ کے پیٹ میں کھلبلی مچا رہی تھی۔ وہ تینوں چیزز پر براجمان ہو گئے۔

”کیسا لگا؟“ اس نے البصار سے پوچھا۔
”بہت اچھا۔“ اس نے امیر لیس ہونے والے انداز میں کہا۔ عائشہ تو شروع ہو چکا تھا جب کہ البصار اور رائیل ہاتھوں میں مصروف تھے۔ البصار کا فون رنگ کرنے لگا۔ اس نے فون نکال کر ریسیو کیا۔ پھر اس نے فون بند کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”رائیل! ضروری کال ہے۔ مجھے جانا پڑے گا۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
”نہیں بھیا! آپ اس طرح سے کیسے چلے جائیں گے انہیں منع کر دیں۔“ افسردہ ہو گئی۔
”جانا تو میں بھی نہیں چاہتا مگر بہت ضروری ہے۔“ انہوں نے پیار سے پکارا۔
”پڑ پڑ بھیا! تھوڑی دیر۔“ انکھوں میں کس قدر رالتھا تھی۔

”پلیز سمجھا کر گریا۔“ وہ مجبور تھا اس نے البصار کی مجبوری سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
”مجھے نہیں چاہتا ہے؟“ البصار نے عائشہ کو مخاطب کیا۔ اس نے سر نہی میں ہلایا۔ وہ رائیل کا چہرہ پڑھ چکا تھا۔ وہ بہت افسردہ ہو گئی تھی۔ وہ اسے البصار والی خوشی تو نہیں دے سکتا تھا مگر اس کا بوجھ کھٹانے کے لیے کوشش تو کر سکتا تھا۔ البصار چلا گیا۔ وہ افسردہ سی غائب دماغی سے بیٹھی رہی۔

”کیا یہ سب تم نے خود بنایا ہے؟“ اس نے مختلف لوازمات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے سر نہی میں ہلایا۔

”اس کا مطلب تمہیں کھانا پکانا نہیں آتا؟“
”نہیں! یہ سب ماما نے بنایا ہے۔ مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ چائے کافی بھی نہیں۔“
”مجھے بھی کچھ نہیں آتا۔ ہاں مگر البصار کافی کچھ بنالیتا ہے۔“ البصار کے ذکر پر اس نے دلچسپی سے پوچھا۔
”کیا کیا؟“

”اسے انڈا ابلانا آتا ہے، چائے اور کافی بنالیتا ہے اور آلیٹ جب کہ اسے بریانی، نہاری، چکن قورمہ، مٹن کڑائی، کھیر.....“ وہ انگلیوں پر گنوا رہا تھا۔ رائیل کے کان کھڑے ہو گئے۔

”وہ یہ سب بنا لیتے ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں یہ سب ہی تو نہیں بنا سکتا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ وہ بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی۔

”ویسے تم اپنے بھیا کے پاس دعویٰ میں رہنا چاہتی ہو؟“ وہ سنجیدہ ہوا۔ رائیل نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

”میرا گھر ابصار کے گھر کے قریب ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا تمہارا گھر ان کے گھر کے قریب ہے۔“ اس کی آنکھیں چمکیں۔

”ہاں۔“

”ان کے گھر پر کون کون رہتا ہے؟“ اسے اپنے مطلب کا موضوع ہاتھ لگ گیا تھا۔

”ابصار..... اس کے پایا اور..... دو ملازم۔“

”اور کوئی نہیں؟“ اسے جس ہوا۔

”اور کوئی نہیں ابصار نے بھی ابھی تک شادی نہیں کی۔“ اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔

”نہیں میرا مطلب..... پاپا نے دوسری شادی نہیں کی۔“ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ پاپا نے بھی شادی کر لی ہوگی۔

”نہیں تو۔“ عائش کو اس کی بات عجیب لگی۔ وہ سوچوں میں گم ہو گئی۔

”پاپا مجھے یاد نہیں کرتے؟ میرا بہت دل کرتا ہے ان سے بات کرنے کا۔ کیا تم میری ان سے بات کروادو گے؟“ وہ

البتحالیہ لہجے میں بولی۔ عائش نے اسے بغور دیکھا اور پھر سر ہلا دیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ابصار کا گھر میرے گھر کے بالکل قریب ہے تو اگر آپ میرے گھر آنا چاہیں.....“

”آپ کے گھر؟ کیوں؟“

”مجھے جاؤ خود۔“ وہ مصنوعی شرمایا اور جب اس کی بات کا مطلب رائیل کو سمجھ میں آیا تو اس نے منہ چلایا۔

”چلو اب جاؤ تم بھی واپس، بہت زیادہ بولنے لگے ہو۔“ اس کی باتوں سے عجیب سا احساس جاگ رہا تھا۔

وہڑکنوں میں دھیمی دھیمی ترنم بن رہی تھی۔

”ٹھیک ہے جا رہا ہوں مگر پھر بھی اس بارے میں ضرور سوچنا۔“ وہ جاتے ہوئے معنی خیزی سے بولا۔ اس کے جانے

کے بعد وہ بھی کھل کر ہنس دی، زندگی ایک دم ہی رخ بدل رہی تھی۔

☆.....☆

وہ بہت دیر سے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ کالج گیٹ سے نکل کر سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ سفید یونیفارم میں شوئرز

کٹ بالوں کی تیل پونی باندھے، وہ بہت سادہ اور معصوم لگ رہی تھی۔ عائش نے اس کے لیے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا

اور خود ڈرائیور رنگ سیٹ سنبھال لی۔ گزشتہ شب اس نے رائیل کو فون کال کی تھی کہ وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے مگر

ابصار کی غیر موجودگی میں۔ وہ مان گئی تھی۔

”طبیعت کبھی ہے؟“ اس کے خاموش وجود کو ایک نگاہ دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔“ سر سیٹ کی پشت سے نکائے ہوئے جواب دیا۔ اس نے گاڑی ریٹورنٹ پر روکی۔

”ہم گاڑی میں بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔“ اس نے ریٹورنٹ میں جانے سے اعتراف کیا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسا تمہیں بہتر لگے۔“ اس نے کندھے پر اچکا کر گاڑی اشارت کر دی۔

”رائیل! تم دوسری لڑکیوں سے ذرا بہت کر ہو۔“ وہ ڈیش بورڈ پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔

”مطلب؟“ رائیل نے اپنی صحت کی طرف دیکھا۔

اودھو، غلط مت سمجھو، میرا مطلب تھا کہ مجھے اچھی لگتی ہو۔“ اس کے بگڑتے تاثرات کو دیکھ کر وہ قہقہہ کرنے لگا۔ وہ

نہ چاہتے ہوئے بھی شرمائے لگی۔ پھر اس نے رخ موڑ لیا۔ مبادہ وہ عائش اس کا چہرہ نہ پڑھ لے۔ ”تم بہت معصوم ہو

اور بھولی بھی دنیا کی اصل پہچان نہیں ہے ابھی تم میں۔“ تمہیں بس خود سے غرض ہے۔ مجھے یہ سب اچھا لگتا ہے۔“ وہ

اپنے سچے دلی جذبات بیان کر رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ اسے ایسا ہی لگتا تھا کہ رائیل ہی وہ

لڑکی ہے جسے وہ اپنی ہمسفر بنا سکتا ہے اور اس کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے۔

”اور سب سے زیادہ جو مجھے تم میں پسند ہے اور جو مجھے اسیر کر دیتا ہے۔“ زیر لب مسکراتے ہوئے اس کے رخ

موڑے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

”وہ کیا؟“ وہ یکدم مڑی تھی۔ اس کی تمام تر حیات الرٹ ہو چکی تھیں۔ وہ عائش سے اس کے دل کی بات سننا

چاہتی تھی۔ اتنے کم وقت میں اس نے اس پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ اس کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بہت کم وقت

میں رائیل کو مکمل اپنا بنا لیا تھا۔

”تمہاری آنکھیں۔“ وہ جھٹ بولا۔ پلکوں کی بھری جھل جھک گئی۔

”میں بہت جلد اپنے والدین کو پاکستان بھجواؤں گا تمہاری ماما سے بات کرنے کے لیے۔“ وہ جتنی انداز میں بولا۔

”بات کرنے کیوں؟“

”تاکہ پھر تم ہمیشہ کے لیے میرے گھر آ سکو۔“ وہ بڑبڑا ہوئی۔

”میں تمہارے گھر کیوں آؤں گی۔ میں تو اپنے بھیا کے گھر جاؤں گی۔“ وہ فخریہ بولی۔

”ارے.....“ اس نے آنکھیں دکھائیں تو وہ شرم کی لالی اوڑھے ہنسنے لگی۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی پاکٹ سے

ایک گولڈ رنگ نکالی۔

”کیا میں یہ تمہیں پہنانے کا حق رکھتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”پہنا تو سکتے ہو لیکن یہ رشتے معمولی نہیں ہوتے۔ یہ حق تو ہمارے بڑوں کو حاصل ہے۔“ اس نے سلجھے ہوئے لہجے

میں سمجھایا۔

”مجھے بس تمہارا جواب چاہیے۔“ وہ یغندہ ہوا۔

”میرا جواب تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے میں بس چاہتی ہوں کہ یہ رنگ تم مجھے دنیا کے سامنے پہناؤ۔ یوں اکیلے

میں نہیں۔“

”میرے لیے یہ اہمیت رکھتا ہے کہ تم راضی ہو، باقی دوسروں کو منانا اتنا مشکل نہیں، میں بہت جلد تمہیں یہ سب کے

سامنے پہناؤں گا۔“ وہ یقین لہجے میں بول رہا تھا اور رائیل کو محسوس ہو رہا تھا کہ خوشیاں اس کے قدموں میں ہیں۔

اس انہیں سمیٹنے کی دیر تھی۔ اسے خود پر رشک ہو رہا تھا۔ اسے اپنا پن مل رہا تھا۔ عائش کی اس قدر اہمیت دینا اسے فخر کا

باعث لگ رہا تھا۔ وہ مسکرائے لگی۔ وہ عائش سنگ آسمان میں اڑنے لگی۔

☆.....☆

”کیا بات ہے عائش؟ نمبر کیوں آف آ رہا ہے تمہارا بھی اور بھیا کا بھی؟“ اس نے تہہ کر لیا تھا کہ وہ عائش کے

ارے میں بھیا کو بتا دو گی۔ وہ صبح سے ٹرائی کر رہی تھی مگر ان دونوں کے نمبر بند آ رہے تھے۔ وہ پریشان تھی کہ کال

آگئی تھی اس نے غلٹ میں فون کان سے لگایا۔ عائش کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی۔
 ”رائیل ہم واپس دینی آگئے ہیں۔“ مخاطب نہایت سستی سے بول رہا تھا۔ رائیل کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔
 ”یہ کیا مذاق ہے عائش۔“ اس کا چہرہ اتر گیا۔
 ”کوئی مذاق نہیں ہے رائیل سوسوری، اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ مجھے ابصار نے خدا کا واسطہ دے رکھا تھا کہ میں واپس جانے کا ذکر نہ کروں۔“ وہ اس کی افسردگی بھانپ گیا تھا۔ وہ خوب سمجھ سکتا تھا۔
 ”بھیمانے ایسا کیوں کیا؟“ اسے بہت حیرت ہو رہی تھی۔
 ”وہ کہہ رہا تھا کہ تم بہت اداس ہو جاؤ گی اور اسے جانے سے روکو گی۔“ واقعی میں اگر ابصار جانے کی بات کرتا تو وہ اس کی رکاوٹ بنتی۔

”اس بات سے زیادہ دکھ مجھے ان کے نہ بتانے سے ہوا ہے۔ بھیا مجھ سے مل کر بھی نہیں گئے۔“ اس کی آنکھیں دھندلا نہ لگئیں۔
 ”پلیز رائیل! کنٹرول پور سیلف، میں تمہارے ساتھ ہوں اور میں ابصار کو سمجھاؤں گا۔ بہت جلد ہم دوبارہ پاکستان آئیں گے۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ وہ رائیل کے دل میں ابصار کے لیے سچے جذبات دیکھ چکا تھا مگر بہت جلد محسوس کر چکا تھا کہ ابصار کو رائیل سے وہ محبت نہیں رہی جو وہ اس سے بچپن میں کرتا تھا۔ رائیل پر جان چھڑکنے والا ابصار بدل گیا تھا۔ وہ آج کا ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اسے کسی سے غرض نہیں تھی سوائے اپنے کام سے اگر رائیل سے لگاؤ تھا بھی تو ایک حد تک۔
 ”تم پلیز..... پلیز مجھے بھیا کا نمبر دو۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔“ وہ رونے سے خود کو روک رہی تھی اور سب ٹھیک ہے کا ورد کر رہی تھی۔

☆.....☆

”ہیلو..... ہیلو بھیا! میں رائیل بات کر رہی ہوں۔“ بہت بار فون کرنے کے بعد اس نے فون کال ریسیو کی تھی اور فون ریسیو ہوتے ہی وہ بول پڑی تھی۔
 ”ہاں رائیل کیسی ہو؟“ وہ مصروف انداز میں بولا۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ فون ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے؟“ وہ پریشانی سے بے حال تھی۔ یہ کیسی منزل پر وہ آ کر کھڑی ہو گئی تھی کہ ایک خواب کی طرح بھیا اس کے پاس آگئے اور پھر یوں اچانک چھوڑ کر چلے گئے۔
 ”میں بہت بڑی تھا گڑیا۔“ وہ تنہے ہوئے لہجے میں بولا۔
 ”اچانک بہت خیال رکھا کریں اور حد سے زیادہ کام مت کیا کریں۔“ اسے ابصار پر پیارا آنے لگا۔ وہ دھیماسکرا دیا۔
 ”بھیا! آپ پاکستان کب آئیں گے؟“
 ”آنے کی کوشش کروں گا۔“ اس کی آواز میں ٹھہراؤ آ گیا۔
 ”آپ اس طرح بتائے بغیر چلے گئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے کیا لگے گا۔“ وہ دلار سے شکایت کرنے لگی۔
 ”بس اچانک جانا پڑا۔“
 ”میں نے جو گفت آپ کے لیے خریدے تھے وہ بھی آپ نہیں لے گئے۔“
 ”ٹھیک ہے جب دوبارہ آؤں گا تو لے جاؤں گا۔“ رائیل کو شاید ابھی تک اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ ابصار کے لیے یہ

سب چیزیں بے معنی تھیں۔ اس کے لیے رائیل کے خریدے گئے سستے گفٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتے وہ تو ابھی بھی بچپن کے انہی دنوں میں قید تھی وہ تو باہری نہ نکل پائی تھی کہ سب کچھ فوراً قبول کر سکے۔
 ”اور ماما بھی آپ کے چلے جانے پر شکوہ کر رہی تھیں۔“
 ”وہ کیوں شکوہ کر رہی تھیں؟ ان کے پاس تم ہونا، مجھے تو وہ بچپن میں ہی خود سے جدا کر چکی تھیں۔“ وہ بہت تلخ ہو گیا۔ وہ اتنے تلخ الفاظ پہلی بار سن رہی تھی۔ اسے ابصار کے دکھ کا بہت اچھی طرح سے احساس تھا۔
 ”میں سمجھ سکتی ہوں بھیا۔“ وہ منہ میں ناخن چبانے لگی۔
 ”ٹھیک ہے گڑیا! میں تھوڑا بڑی ہوں، اپنا خیال رکھنا پھر بات کریں گے۔“ اس نے کال ڈسکنٹ کر دی تھی۔
 رائیل کے دل سے بہت بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

☆.....☆

”رائیل!“ وہ راہداری سے گزر رہی تھی کہ محمد شفیع نے اسے اپنے روم سے پکارا۔ رائیل نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ بیڈ پر لیٹے کر رہے تھے۔ وہ گڑبگڑ دو دنوں سے بیمار تھے۔
 ”ذرا اپنی ماما کو بلانا۔“ وہ سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے کبھی بھی برداشت نہیں ہوا تھا کہ ماما، محمد شفیع کے ساتھ نہیں۔ ان سے باتیں کریں یا ان کی خدمت کریں محمد شفیع شدید تکلیف میں مبتلا تھے مگر وہ اپنا دل اتنا پتھر کا بنا چکی تھی کہ اسے ان کی تکلیف سے بھی کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہونٹ ہنسنے لگی۔
 تمام افراد اننگ ٹیبل پر ناشتا کر رہے تھے۔ ماما بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ روز کی طرح اپنی مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت ہر طرف عمل خاموشی تھی۔ ہر فرد خاموشی کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ ماما نے اسے بھی ناشتا کروایا کہ ملازمہ تیزی سے ماما کی جانب آئیں۔

”وہ..... شفیع صاحب کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ وہ آپ کو بلارہے ہیں۔“ ملازمہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ماما فکر مند انداز میں بڑے بڑے ڈگ اٹھاتی ہوئی ان کے روم کی جانب دوڑیں۔ اس نے زہر کا ٹھونٹ بھرا احسن بھی ماما کے پیچھے پیچھے گیا تھا۔ وہ ناشتا شروع کر چکی تھی جب ماما طیش میں اس کی جانب آئی تھیں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
 ”تمہارے پاپا نے جب تمہیں کہا کہ مجھے بلا کر آؤ تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ وہ اس کے سر پر کھڑی تھیں۔ وہ رائیل کی اس طرح ہٹ دھری سے نالاں ہو چکی تھیں۔

”وہ میرے پاپا نہیں ہیں۔“ وہ ہونٹ ہنسنے لگی۔ اس نے کبھی بھی یہ بات قبول نہیں کی تھی کہ محمد شفیع اس کے پاپا ہیں۔ اس کی نگاہ میں اس کا ایک ہی باپ تھا جن سے اس کی ماما کی علیحدگی ہو چکی تھی۔
 ”تم اتنی پتھر دل کیسے ہو سکتی ہو؟ انسانیت بھی نہیں رہی تمہارے اندر۔“ انہوں نے رائیل کو بہت بری طرح جھنجھوڑا تھا۔ وہ اذیت کی انتہا پر تھیں۔ رائیل کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔ اس کی نرم طبیعت ماما ہمیشہ پیار دینے والی آج سب کے سامنے اسے رسوا کر رہی تھیں۔ محمد شفیع کی خاطر اسے اذیت دے رہی تھیں۔

”ہاں! انہیں ہے مجھ میں انسانیت۔ پتھر ہے دل میرا، آپ کی طرح اتنا بڑا اور یاد دل نہیں ہے میرا کہ دوسروں کا بوجھ بھی اپنے سر اٹھاؤں۔“ وہ بدتمیزی پر اتر آئی تھی۔ رفعت سے اس کی اس قدر بدتمیزی برداشت نہیں ہو پارہی تھی۔
 ”رائیل! خاموش ہو جاؤ ورنہ میں بہت کچھ بول جاؤں گی۔“ وہ اشتعال میں شہادت کی انگلی دکھا کر بولیں۔ عمار احسن اور ہانیہ ساخت کھڑے تھے۔

”آپ ہمیشہ مجھے ہی چپ کرواتی آئی ہیں اپنی بیٹی کو ایک آزاد زندگی جینے کا حق بھی نہیں دلا پائیں آپ اور اب بھی چپ ہونے کے لیے بول رہی ہیں۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔

”اگر اسی طرح آپ پاپا کے ساتھ سمجھوتا کریں تو آج سب کچھ ٹھیک ہوتا، میری شخصیت میں یہ ادھورا پن نہ ہوتا، میں احساس کسری میں مبتلا نہ ہوتی، میرے بھیا میرے ساتھ ہوتے مگر سب ختم کر دیا آپ کی اتانے۔ محض اپنی ضد اور انا کو انجاریا رکھنے کے لیے مجھ شفیق کے ساتھ بھی تو سمجھوتا کر رہی ہیں نا، ان کے تین بچوں کی پرورش بھی تو کر رہی ہیں نا؟“ وہ رنجیدہ تھی۔ زار و تظار رو رہی تھی۔ رفعت ساکت و جامد کھڑی تھیں وہ ہمیشہ لکٹی ہوئی آئی تھی، اس وقت اسے موقع ملا تھا اپنے دل کا ہر غبار نکالنے کو۔

”میں اس سب کے لیے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ عمار اور ہانیہ بہم گئے تھے۔ اتنا بڑا اتمنا شاہلی باران کے گھر میں ہوا تھا۔ رفعت نے اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر ایک زور دار طمانچہ اسے رسید کیا۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

کتنا برا ہو گیا تھا یہ سب وہ ماں بیٹی ایک دوسرے پر محبت لٹانے والیاں، آج ایک دوسرے کے مخالف کھڑی تھیں۔ اپنے سینے پر الگ الگ درد چھپائے رفعت پیش میں اور کچھ کرتی اس سے پہلے احسن درمیان میں آگیا۔

”پلیز امی! بات ختم کریں۔ پلیز غصہ مت کریں۔“ وہ رفعت سے التجا کر رہا تھا۔

”رائیل پلیز! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ احسن نے نرمی سے اسے کہا۔ اسے رائیل پر انہما کا ترس آرہا تھا وہ مکمل ہونے کے بعد بھی ادھوری تھی۔ وہ سسکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور خود کو اندر بند کر دیا۔ اس دکھ کے ختم کو بھرنے میں وقت چاہیے تھا۔ وہ بری طرح سے گھائل ہو چکی تھی بیڈ پر اوندھ منہ لیٹے ان گنت آنسو بہائے۔

وہ پانچ سال کی تھی جب اس کے ننھے سے ذہن پر بہت بھاری بات ڈال دی گئی تھی کہ وہ اب اس گھر میں سبیل کر نہیں رہ سکتے۔ ماما پاپا کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ماما اور پاپا کے درمیان اختلافات دیکھے تھے۔ ماما کو ہمیشہ پاپا سے شکایتیں رہتی تھیں وہ گھریٹ آتے ہیں گھر کو اور بچوں کو وقت نہیں دیتے لیکن اس نے ہمیشہ پاپا کو صفائی دیتے سنا تھا کہ میں یہ ساری محنت بچوں کے لیے ہی تو کر رہا ہوں اس کے باوجود ماما ایک ناستیں وہ خفا خفا رہتیں، وہ اکثر پاپا کو بے بس پاتی تھی۔

وہ اکثر بھیا سے پوچھتی تھی۔ وہ صاف نال دیا کرتے تھے۔ ابصار اس سے چار سال بڑا تھا اور وہ اس سے خاصا

سمجھدار تھا۔ وہ سب باتیں سمجھتا تھا وہ رائیل کے ننھے دماغ کے بوجھ کو بڑی صفائی کے ساتھ مٹا دیتا تھا۔ آخر بات بہت بڑھ گئی۔ ماما روز روز کی بحث سے تنگ آگئیں۔ انہوں نے پاپا سے علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ پاپا نے ہر کوشش کی بچوں کے واسطے دیئے مگر وہ اپنی ہی بات پر اڑی رہیں۔ وہ اس قدر انا پسند ہو گئیں تھیں کہ وہ اپنے بڑے بیٹے سے بھی دست بردار ہو جاتا تھا جی تھیں۔ رائیل ان کے پاس رہے گی اور ابصار پاپا کے پاس یہ فیصلہ بھی رفعت کا تھا۔ وہ بہت کٹھور ہو گئی تھیں اور شاید تقدیر میں بھی یہی لکھا تھا۔ پاپا بھیا کو لے کر دہلی چلے گئے اور وہ ماما کے ساتھ تانا اور تانی کے گھر آگئی۔ جہاں تانا اور تانی کے علاوہ دو ماموں اور دو مامانیاں اور ان کے پانچ بچے تھے۔

ان دونوں وہ بہت رنجیدہ تھی۔ اس لیے وہ وہاں کسی اور بچے سے اونچ نہ ہو پائی تھی۔ تین ماہ بعد ہی ان دونوں کا وجود ممانیوں کو کھلنے لگا تھا۔ تب تانا اور تانی نے رفعت کو سمجھایا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ تنہا زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ جس کا اندازہ خود رفعت کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ بہت منمنائی مگر پھر تقدیر نے انہیں محمد شفیق کے گھر کی جانب موڑا۔ ان کے تین

چھوٹے بچے تھے۔ ان کی پہلی بیوی وفات پا چکی تھیں اور ان کے خاندان والے ان کی دوسری شادی کروانا چاہ رہے تھے۔ یوں رفعت کی زندگی میں وہ چار نفوس شامل ہو گئے اور پھر اس کی وہ پہلی والی خدمت ہو گئی۔ ضد اور انا جیسے لفظوں کا دامن چھوٹ گیا۔ اس کا یہ ہی آخری ٹھکانا تھا اور اس کی بیٹی کا مستقبل۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا انہوں نے سمجھوتا کر لیا تھا۔ انہوں نے محمد شفیق کے تینوں بچوں کو دل سے قبول کیا اور سچی نیت سے انہیں اپنایا۔ تینوں بچے بہت اچھے اور سلیجے ہوئے تھے۔ محمد شفیق بھی ایک اچھے انسان تھے لیکن رائیل ان کو وہ مرتبہ نہ دے پائی۔ کیونکہ محمد شفیق نے اس پر پہلی نظر ہی سرد مہری سے ڈالی تھی۔ کیا ہوتا اگر وہ پیار سے اس کو پچکار تے۔ محبت تو پتھر کو بھی موم بنا دیتی ہے۔ رفعت نے بھی تو ان کے تینوں بچوں کو پیار سے اپنایا تھا۔

یہ وہ ہی دن تھا کہ رائیل کے دل و دماغ نے انہیں بطور باپ قبول ہی نہ کیا۔ وہ ان سے گھبراتی تھی۔ انہوں نے کبھی اس کے سر پر پیار سے ہاتھ نہیں پھیرا تھا۔ یہ بات ہی دل میں رفعت نے بھی تسلیم کی تھی۔ یہ بات رائیل کے دل میں خلاء پیدا کر گئی تھی۔ وقت گزرنے کے بعد بھی وہ اسی مقام پر کھڑی تھی۔ وہ کبھی آگے بڑھ ہی نہ پائی تھی۔ کبھی کبھی معمولی ضد میں انسانی انایوں بھی زندگیاں بدل دیتی ہے۔

☆.....☆

جب دل سے بوجھ کچھ ہلکا ہوا اس نے سیل فون اٹھایا۔ وہ شدت سے ابصار کو یاد کر رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اور اس کی وجہ عائن نے اس کا بے حد مصروف ہونا بتایا تھا۔

وہ دن رات ابصار کے لیے فکر مند تھی۔ اس وقت بھی غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ موبائل فون کے بٹن پر روانی سے چل رہے تھے۔ نمبر ڈائل کر کے اس نے فون کان سے لگایا۔ ایک وہ ہی تھا جس کے آگے وہ اپنے دل کا ہر راز، ہر غم رکھ سکتی تھی۔ کافی بیلز جانے کے بعد کال ریسیو کی گئی۔ مخاطب کی آواز بہت پوچھل تھی۔

”بھیا! کیسے ہیں آپ؟“ کسی اپنے کی آواز سن کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں رائیل تم کیسی ہو؟“ انہوں نے نیم غنودگی کے عالم میں پوچھا اسے فوراً اندازہ ہو گیا تھا۔

”بھیا! آپ سو رہے تھے؟“ اسے شرمندگی کا احساس ہونے لگا کہ اس نے ابصار کی نیند خراب کر دی۔

”ہاں! بہت تھکا ہوا ہوں۔“

”ٹھیک ہے آپ آرام کریں میں بعد میں بات کروں گی۔“ وہ نرمی سے بولی۔ ابصار نے ”ٹھیک ہے“ بول کر کال

اسکیٹ کر دی اور وہ ایک ٹک فون کو دیکھتی رہی۔ وہ بھیا کی بوجھل آواز سمجھ گئی تھی لیکن وہ اس کی آواز میں در آنے والی

لی محسوس نہیں کر پائے تھے۔

دونوں موتی آنکھوں سے ٹپک پڑے تھے۔ پھر اس نے عائش کا نمبر ڈائل کیا۔ تیل بجتی رہی مگر اگلی جانب سے ریسیو

نہیں کی گئی۔

یہ وقت کے اتنے خوب صورت ساتھی پر دیں جا کر آسمانوں میں کہیں اس طرح کیوں کھو جاتے ہیں اس نے سر

سائس کے ساتھ حسرت سے سوچا۔ دیر تک وہ موبائل فون کو گھورتی رہی کہ کچھ وقت بعد اس کے فون پر کال تیل ہونے

لگی۔ اسکرین پر عائش کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے بنا تاخیر کیے فون ریسیو کیا۔

”کیسی ہو؟“ وہ اپنی عادت کے برخلاف سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بھی نرم ہو گئی۔

حیران ہوا پھر اس نے مجھے یہ فیصلہ لینے سے سختی سے منع کیا۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم دینی آؤ۔“ وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔
”مگر تم فکر مت کرو۔ میں بہت جلد اپنے جیڑس کو پاکستان بھیجوں گا۔“ وہ اپنی بات پر اب بھی قائم تھا۔ اس نے
فون سوچ کر آف کر دیا تھا۔

شام کے سائے لہرا رہے تھے۔ زردی مائل سورج دھیمی رفتار سے اونچے اونچے پہاڑوں کی اوٹ میں منہ چھپا رہا
تھا۔ وہ دن اس کے لیے بہت درد بھرا تھا۔ اس کے لیے بہت سی حقیقتوں کو قبول کرنا بہت مشکل تھا۔
عائش کا ہر لفظ سچا تھا۔ وہ خود بھی تو بھیاسے بات کرتے ہوئے محسوس کرتی تھی کہ وہ دل سے بات نہیں کرتے۔
ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر وہ فون بند کر دیتے تھے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگاتی ہوئی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ صبر کا پیمانہ لبریز
ہو رہا تھا۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☆.....☆

کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہ وہیں میسر کی دیوار سے ٹیک لگائے بٹھی ہوئی بیٹھی تھی۔ رات کے جانے کس پہر میں
اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح آنکھوں پر سورج کی نرم نرم شعائیں اس کے چہرے کو چھونے لگیں تو اس نے غنودگی سے
آنکھیں کھول کر غائب دماغی سے چاروں جانب دیکھا۔ دماغ پر زور دینے پر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اعصاب
لہایت تھکان سے چور ہو رہے تھے۔ رونے کی وجہ سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ چلنے میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔
وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھی اور کمرے میں آ گئی۔ وال کلاک صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہی تھی۔

وہ یک ٹک سوچنے لگی کہ اسے اب خود کی ذات کو مزید نکمیر نے نہیں دینا، وہ خود کو مضبوط ڈور سے باندھ دینا چاہتی
تھی۔ وہ بہت بھاگی تھی اس اڑتی ہوئی پتنگ کے پیچھے وہ خود کو بہت خوار کر چکی تھی۔ تھکان کے باوجود اس نے امید نہیں
ہاری تھی مگر اب وہ اڑتی ہوئی پتنگ بہت پروان چڑھ چکی تھی۔ وہ واپس اس کے پاس پہلے کی طرح لوٹ کر نہیں آ سکتی
تھی کسی بھی قیمت پر۔

اس کی آنکھیں درد سے بوجھل اور خشک ہو چکی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے زوردار چھینٹے مارے،
پھر وہ کچھ کرا اور اپنی حالت درست کر کے وہ بال روم میں چلی آئی جہاں ڈاننگ ٹیبل پر تمام گھر کے افراد (علاوہ محمد
علی) کے موجود تھے۔ سبھی نے اسے خشکیں لگا ہوں سے دیکھا۔ وہ بالکل نارمل انداز میں ان کے سامنے اپنی مخصوص
مکان پر بیٹھی۔ غصہ ہونے کے باوجود رفعت نے اس کے آگے اس کا ناشتا رکھا۔ اس وقت بالکل خاموشی تھی ہر فرد اپنے
اپنے ناشتے پر جھکا تھا۔ ماما کی سرخ ہوئی آنکھیں وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ بھی یقیناً اس کی طرح رات بھر روتی رہی تھیں۔
اس نے بہت زبردستی الفاظوں کا استعمال کیا تھا۔ اس نے بہت شدت سے محسوس کیا تھا وہ ان کے لیے اپنے دل میں
درد محسوس کر رہی تھی۔ وہ ان سے معافی کی طلب گا رہی۔ اس سب کے لیے اسے تہائی کا موقع درکار تھا۔ فی الوقت وہ
پاپ رہی۔

ناشتے کے بعد تمام افراد اپنی اپنی منزل کو چل دیے۔ وہ لان میں چلی آئی۔ غائب دماغی سے لہلاتے ہوئے
کارپوں میں لگے پھولوں کو تنکے لگتی۔

”رائیل تم یہاں بیٹھی ہو؟ شکر ہے تم یہاں مل گئیں۔“ صمد اس کی جانب آیا۔ اس کی تحویٹ ٹوٹی اس نے چونک کر سر
اٹھایا۔ وہ مسکراتی ہوئی شکل کے ساتھ کھڑا تھا۔

”اب کیا ہو گیا؟“ وہ بے زاریت سے بولی۔ اس وقت ویسے بھی وہ تہا رہتا چاہتی تھی۔

”سوری میں ماما کے روم میں تھا اور میرا فون میرے روم میں تھا۔ اس لیے تمہاری کال ریسیونہ کر پایا۔“ اس نے وجہ
فوراً بیان کر دی اور وہ خود بھی جانتی تھی کہ کوئی ایسی وجہ ضرور ہوگی جو اس نے کال ریسیونہ کی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ چلتی ہوئی میسر پر آ گئی۔
”رائیل میں نے لیٹ اس لیے کال کی کیونکہ میں تمہیں کال بیک کرتا اس سے پہلے البصار نے مجھے اپنے پاس بلایا

ارجنٹ۔“ وہ بہت سنجیدگی سے اور دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔
”اچھا! تم بھیاسے پاس گئے تھے۔ میں نے بھی کال کی تھی مگر بات نہیں ہو پائی۔ وہ آرام کر رہے تھے۔“ وہ فضا میں
لبی سانس لے رہی تھی گھٹن میں کچھ کی آ رہی تھی۔

”میری بات دھیان سے سنو رائیل! میں بہت اپ سیٹ ہوں تمہارے لیے۔“ وہ افسردگی سے بول رہا تھا۔ وہ ان
حالات سے افسردہ تھا جو البصار نے پیدا کر دیئے تھے۔

وہ ٹپکتے ہوئے رک گئی۔ اتنا سنجیدہ اس نے عائش کو کبھی نہیں پایا تھا۔
”البصار نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میں تمہیں سمجھا سکوں کہ.....“ وہ رک گیا۔ خود میں ہمت و حوصلہ جمع کر رہا تھا۔

وہ اس طرح اس معصوم لڑکی کا دل کیسے توڑ سکتا تھا۔ یہ کیسا کام اسے البصار نے تمہا دیا تھا۔
”کیسا سمجھا سکو؟“ وہ ساٹ تاثر لیے پوچھ رہی تھی۔

”وہ البصار اب بالکل الگ ہے اس البصار سے جو تمہارے ساتھ بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس
کی شخصیت سے وہ یک ختم ہو گئی ہے۔ وہ تم سے محبت تو کرتا ہے مگر تمہاری طرح نہیں، اس کی زندگی بزنس سے شروع
ہوتی ہے اور بزنس پر ختم ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو بہت مشکل سے ٹائم دے پاتا ہے اور تم اسے بار بار فون کرتی ہو۔ اس
نے صاف صاف لفظوں میں کہا ہے کہ وہ ڈسٹر ب ہوتا ہے۔“ عائش نے اس کی سماعتوں پر دھماکا کیا۔ وہ بے یقینی کی
حالت میں سر ٹی میں ہلائے لگی۔

”یہ بہت ہی دکھ والی بات ہے تمہارے لیے۔ مجھے تمہیں یہ سب کہتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ تمہیں براہ
راست منع نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے آج مجھے بلا کر یہ کام میرے ہاتھوں تمہا دیا۔ میں بھی بہت حیران تھا۔ میں نے اسے

سمجھانے کی بھی بہت کوشش کی وہ نہیں سمجھا بہت ضدی ہے۔“
وہ عائش کی آواز میں کھلے دکھ کو واضح محسوس کر رہی تھی لیکن وہ اپنے دکھ کا کیا کرتی۔ اتنا حسین خواب کوئی آنکھوں میں

سجا کر اب نوچنے جا رہا تھا۔
بھیا! جو نام ہی کافی تھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نکمیر نے کے لیے۔ آج وہ ان پر بھی بوجھ بن گئی تھی۔

”مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا عائش! میں ایک بار ان سے بات کرنا چاہتی ہوں پلیز۔“ وہ بے اختیار ہو کر رو پڑی۔
”کاش..... میرے ہاتھوں میں ہوتا۔ اب تو اس نے نمبر بھی بند کر دیا ہے اور مجھے بھی اپنی دوستی کے واسطے دیئے

ہیں۔“ وہ مجبور تھا۔
”رائیل! بہتر ہے تم اسی بات سے اندازہ لگا لو اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ خود کو سمجھاؤ پلیز۔“ وہ اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔

”پلیز مت رو، ان لوگوں کے لیے آنسو مت بہاؤ جن کو ان کی قدر نہیں۔ تم گھبراؤ نہیں میں اب بھی تمہارا وہی مہربان
ساتھی ہوں، تم ہمیشہ ہر درد مجھ سے لے سکتی ہو۔“ وہ اسے حوصلہ دے رہا تھا۔
”میں بہت جذباتی ہو گیا تھا جس وجہ سے میں نے البصار کے سامنے اپنے دل کی بات بھی رکھ دی۔ پہلے وہ خوب

”کم آن! تمہارے لیے ایک سر پرانز ہے۔ اٹھو چلو۔“ احسن اسے صبح ہونے والے تمام حالاتوں سے آگاہ کر چکا تھا اور صبر جانتا تھا کہ اس سب کے بعد وہ بہت اداس ہوگی۔ اسی غرض سے وہ اس کے پاس آیا تھا۔

”کیسا سر پرانز؟“ عام حالات ہوتے تو وہ شاید خوش بھی ہوتی اور اس کی گول گول آنکھیں چمک اٹھیں لیکن اس وقت یہ سب چیزیں اس کے لیے بے معنی تھیں۔

”چلو تو ایک بار۔“ وہ کسی بھی صورت اسے لیے بنا دیا۔ وہ ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ اسے اپنے چھوٹے سے لان میں لے آیا اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے جب صدر نے اس کی آنکھوں کے اوپر رکھے اپنے ہاتھ ہٹائے اور رائیل کی آنکھوں نے سامنے کا منظر دیکھا تو خوشی خود بخود اس کے چہرے اور آنکھوں کا احاطہ کرنے لگی۔

نیم کے تناور درخت میں جھولا لگا ہوا تھا جو کہ دو مضبوط رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ ان دونوں رسیوں پر گیندے کے پھول لپٹے ہوئے تھے۔ جن کی مہک پورے ماحول کو بہت خوش گوار اور تروتازہ بنا رہی تھی۔ وہ منظر بالکل ایک خواب کی مانند تھا۔

”کیسا لگا؟“ اس نے ابرو اچکا کر فخریہ پوچھا۔ جواباً وہ مسکرائی۔

”بہت خوب صورت ہے یہ صدر! آئی لائیک اٹ۔“ وہ چمکتی آنکھوں سے گیندے کے پھولوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”تم بیٹھنا نہیں چاہو گی اس پر؟“ وہ اس کے پاس آیا۔

”ضرور۔“ وہ الفاظ کو خاصا سچ کر بولی۔ وہ مسکرائی ہوئی اس جھولے پر آ بیٹھی۔ صدر اس کے عقب میں آ گیا اور جھولے کو پیچھے کی جانب کھینچ کر آگے کی جانب دھکیلا۔ جھولے کی تیز لہر سے وہ ہوا میں تیرنے لگی۔ دل جیسے ہر تکلیف سے ان لمحوں میں ہر فکر سے آزاد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

”صدر تم نے کیا سوچ کر یہ جھولا میرے لیے بنایا؟“ اس نے ہوا میں لہراتے ہوئے پوچھا۔ لہجہ اور آواز دونوں شوق سے پورے تھے۔

”تم نے ایک بار مارکیٹ میں پینٹنگ میں بنے ہوئے اس طرح کے جھولے کی بہت تعریف کی تھی، تم اسے حسرت سے دیکھ رہی تھیں اس کے بعد میں بہت وقت سے سوچ رہا تھا کہ تمہاری وہ حسرت پوری کر دوں مگر مصروفیات کی وجہ سے نہیں کر پا رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے فری وقت میسر آیا میں نے یہ آپ کے لیے ارینج کر دیا اور وہ بھی خود اپنے ہاتھوں سے۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔ جھولا اسی روانی سے ہوا میں لہرا رہا تھا۔

”مگر کیوں؟ اتنی محنت میرے لیے؟“ وہ ہر جملے کے ساتھ گردن موڑ کر پشت پر کھڑے اس مہربان شخص کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری خوشی کے لیے رائیل! صرف تمہارے لیے۔“ وہ جذباتیت سے بولا۔ رائیل کی خوشی تمم گئی۔

”تم کتنی اچھی طرح لڑکیوں کو پٹالے ہو۔“ وہ اس پر غماز نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے امپر لیس ہو رہی ہے۔

”بالکل نہیں۔ یہ سب میں نے کبھی کسی کے لیے نہیں کیا۔ یہ بہت اچیش ہے اور یہ صرف آپیشلی تمہارے لیے۔“ اسے رائیل کا یوں کہنا برا لگا تھا۔ جھولے کی رفتار کم ہوتی گئی۔ صدر کے ہاتھ تمم گئے تو وہ مڑ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”رائیل میں جانتا ہوں گزشتہ دن تمہارے لیے بہت مشکل گزرا۔ تم بہت اداس ہو، مجھے احسن نے سب کچھ بتا دیا۔“

”وہ شرمندہ سی خاموش رہی۔“

”لیکن میں تمہیں اداس کیسے ہونے دیتا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوشش تھی تمہیں اس اداسی سے کچھ وقت دور رکھنے کی۔“ اس نے مضبوطی سے جھولے کی دونوں رسیوں کو تھام رکھا تھا۔ رائیل کا سر جھک گیا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں اس سب کے لیے۔ مجھے ماما سے اس طرح سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ وہ صدر سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔

”تم سمجھو! رفعت چاچی کہیں بھی غلط نہیں ہیں جو غلطی انہوں نے ماضی میں کی تھی وہ اب دوبارہ نہیں کرنا چاہتیں۔“ اس لیے انہوں نے چاچا کے بچوں کو اپنا لیا، اگر وہ یہاں بھی بے جا خدیں کرتیں ان کے بچوں کو نہ اپنا تیں تو تمہارا آج وقت بہت مشکل سے گزرتا، وہ ہمیشہ سے تمہاری محافظ رہیں، تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کے لیے انہوں نے بہت سی امداد دیاں خود پر سوار کر لیں وہ جو بھی کر رہی ہیں تمہارے لیے اور تمہارے بہن بھائی بھی سب ایسے ہیں۔ وہ تمہیں دل سے اپنا سمجھتے ہیں۔ تم بھی پلیز دل سے انہیں اپناؤ۔“ وہ بہت اپنائیت سے سمجھا رہا تھا۔

”پلیز تم چاچی سے معافی مانگ لینا کیونکہ ماں جیسی اور کوئی ہستی نہیں ہے۔“ وہ بہت سنجیدگی سے نرم لہجے میں گویا تھا۔ اسے صدر کو سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تو اسے ہمیشہ ایک بے کار اور بے وقوف انسان سمجھتی تھی لیکن آج وہ سب سے زیادہ اس کے قریب تھا۔ جب اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی کسی کی تب وہ اس کے پاس تھا۔

”تم بہت اچھے ہو عبد الصمد۔“ اس نے بے اختیار صدر کا ہاتھ تھاما۔ وہ ایسی ہی تھی بالکل صاف دل جو ٹھیک لگتا وہ ہی کرتی۔ ہمیشہ اپنے دل کی سنتی۔ اسے دوسروں سے، دوسروں کی سوچ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ صدر نے بغور اس کے اٹھ میں تھا۔ اسے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔

”تم بھی بہت پیاری ہو۔“ وہ ہونٹ کھینچ کر بولا۔ وہ جھولے سے اٹھ گئی۔ اس کی گول گول آنکھیں خوشی و اطمینان سے چمکدار لگیں۔

☆.....☆

”اس کے دل میں بہت غبار بھرا ہوا ہے۔ تم نے اس دن اس کو دیکھا، وہ کس طرح رو رہی تھی۔“ وہ گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے لان سے آتی ہوئی آواز سنی، لان بیرونی گیٹ کے دائیں جانب تھا اس نے مڑ کر اس جانب دیکھا۔ اسن، ہانیہ کے ساتھ گھاس پر بیٹھا اس سے مخاطب تھا۔

”وہ اکیلے میں بھی تو ان سے بات کر سکتی تھی۔“ ہانیہ کو رفعت کے لیے دل سے دکھ تھا اور اسے رائیل کی تمام باتیں اظہار گز رہی تھیں۔

رائیل کی جانب ان دونوں کی پشت تھی۔ وہ مجبور ہو گئی تھی اس طرح کی غیر اخلاقی حرکت کرنے کے لیے کیونکہ اس دن وہ اس کا گھر پر تھا اور یہ اس کا انسانی بحس فطری عمل تھا۔ وہ وہیں جا مل کھڑی ہو گئی۔

”اور آپ نے دیکھا وہ کس طریقے سے ماما سے بات کر رہی تھی۔ میں نے ماما کو بہت دکھی دیکھا ہے اس کی وجہ ماما انہیں سب سے زیادہ چاہتی ہیں مجھے ان کے لیے بہت دکھ ہے۔ شاید رائیل آپنی کوا حساس نہیں ہے کہ ماں کیا کرتی ہے۔“ ہانیہ بہت افسردہ تھی۔

”ہانیہ! مجھے بہت ترس آتا ہے رائیل پر۔ تم نے شاید اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ اس نے بہت کچھ کھو لیا ہے۔“ رائیل کی عمر میں اور جوگی اس کی عہد طفولیت میں رہ گئی تھی وہ آج بھی اسے ویسے ہی محسوس کرتی ہے۔ وہ اس کی

اما اس کے باوجود بھی ماں کا دل تھا اولاد کے آنسوؤں کو دیکھ کر پھل رہا تھا۔

”تم وعدہ کرو۔“ انہیں جیسے اس کے لفظوں پر یقین نہ تھا۔ راتیل نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ماما کے ہاتھوں کو دبا دیا۔ رفعت نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ بھی تو اسی کی طرح بے حس رہی تھیں۔ راتیل سے دوری بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ماما نے اسے دل سے معاف کر دیا تھا۔ اس کے دل کو سکون ملا تھا۔ بے چین روح کو قرار ملا تھا۔

☆.....☆

”آج میٹھا کس خوشی میں بنایا ہے؟“ احسن نے راتیل کے ہاتھوں میں کھیر کی ٹرے دیکھی تو چپک کر بولا۔
”بھیا! ضروری تو نہیں کہ خوشی ہو تو میٹھا بنایا جائے بلکہ میٹھا بنانا چاہیے تاکہ خوشی چل کر خود بخود آئے۔“ وہ نہایت اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے نیبل پر ٹرے رکھی اور پھر سب کو سردی۔
یہ چھ ماہ گزر جانے کے بعد والی راتیل تھی، جو بہت فٹ کھ اور خوش مزاج ہو گئی تھی، اس نے احسن اور ہانیہ کے مابین ہونے والی جو گفتگوئی تھی اس کے بعد اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ جن رشتوں کو بے معنی سمجھتی ہے وہ اصل میں اس کے لیے کتنی فکر کرتے ہیں۔

البصار کے رویے پر وہ بہت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ایک ساتھ ڈھیر سارے آنسو بہا دیئے تھے مگر ان آنسوؤں نے اس کے دل پر جی جھک کر بالکل صاف کر دیا تھا۔

اس کے بعد ایک روشن صبح ہوئی، اس روشن صبح کے ساتھ ہی اس نے نئے اور روشن فیصلے کیے۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت غلط تھی اور اس نے زندگی غلط فہمیوں میں گزار دی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھی لیکن پھر بھی ابھی آگے جانے کتنی زندگی تھی۔ اس کے پاس موقع تھا کہ وہ صحیح راہ پکڑ لے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

البصار اس کے بہت باس ہو کر بھی بہت دور ہو گیا تھا اور احسن جو اس کے اتنے قریب تھا جس کا اسے احساس تک نہ تھا وہ اس کے لیے اتنے خلص جذبہ رکھتا تھا۔ اس کے لیے مشکل تھا، اس کی ہر بے رخی کو نظر انداز کیے اس کی ذات کا غریبہ کر چکا تھا۔

تو پھر بہتر بھائی کون تھا؟ البصار..... احسن..... نے اس کی نظر میں دل میں بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔

اور جہاں تک ایک ہمسفر منتخب کرنے کا فیصلہ تھا تو اس نے اس بارے میں بہت سوچا۔

کیا وہ ماما سے اتنا دور جا کر خوش رہ سکتی تھی؟ کیا وہ کم گلوڑ کی پرانے لوگوں کے درمیان مطمئن ہو کر رہ سکتی تھی؟ اس سب کے بعد البصار کا سامنا کرنا جب کہ البصار نے راتیل سے بے زار ہو کر اسے ٹھکرادیا تھا۔ عائش کے ساتھ زندگی گزارنے کے یہ تمام خیالات وہ کیسے جھٹک سکتی تھی۔ یہ تمام پہلو بہت گہرے بنجیدہ تھے اسے ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا تھا۔

عائش کے علاوہ ایک اور چہرہ بھی اسے نظر آ رہا تھا جو اس کے لیے شاید عائش سے بھی بہتر تھا۔ وہ وہی تھا جو بچپن سے اس کے آس پاس تھا۔ ہمیشہ اس کا اداس چہرہ مگر اب اس سے سجا رہا تھا جو اداس چہرہ سے بڑھ کر اسے ٹھکرادیا تھا۔ عائش کے ساتھ زندگی ذات کو مذاق بنا کر اسے ہنساتا تھا جس کے پاس بہت ساری دولت نہیں تھی مگر وہ اپنے انداز سے لاکھوں کی خوشیاں خرید کر دیتا تھا۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر صمد کو چن لیا تھا، اسے صمد، عائش کے مقابلے میں ہر طرح سے بہتر لگا۔ وہ اسے بچپن سے

مقام پر کھڑی ہے کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ وہ کہیں نہ کہیں سمجھتی ہے کہ یہ ماما کی ضد کی وجہ سے ہوا اگر ماما کیپر و ماثر کر تیں تو آج میرے پاس سب کچھ ہوتا، میں ایک مکمل زندگی گزار رہی ہوتی اور وہ اسی سوچ کے مطابق سب کرتی ہے۔ وہ اسی کتنے نظر کو لے کر چلتی ہے۔ اسی لیے اس نے کبھی بھی پایا اور ہمیں قبول نہیں کیا۔“ وہ ساکت کھڑی اپنی ہی زندگی کے کھلتے ہوئے ورق سن رہی تھی۔ احسن نے کتنے اچھے طریقے سے اسے جان لیا تھا کیا وہ اس پر اتنی نظر رکھتا تھا؟

”ہوسکتا ہے آپ کا تجربہ درست ہو۔“ ہانیہ اتفاق کرتے ہوئے بولی۔

”اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ ہمارے قریب آجائے تاکہ ہم اسے اس تکلیف سے دور کر سکیں اور میں دل سے اسے خوش کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ دل کی بالکل بھی بری نہیں ہے۔“ وہ بہت بنجیدہ تھا۔

راتیل کو بہت اچھا ہوا تھا، ایک مشکلی سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے اپنا دماغ درست کر کے آئی تھی اور پھر احسن اور ہانیہ کے مابین ہونے والی گفتگو نے اسے مزید الجھن میں ڈال دیا تھا، اس کا دماغ گڈمڈ ہونے لگا تھا۔ اس کے لیے اصل میں فکر مند ہونے والا کون سا انسان تھا؟ اسے خوشیاں دینے کے لیے کون سا شخص خواہش مند تھا؟ کون زیادہ اچھا بھائی تھا؟ البصار..... احسن..... البصار..... احسن اس نے سر ہٹا لیا۔

☆.....☆

وہ مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ اب وہ کبھی بھی ماما سے کوئی شکوہ نہیں کرے گی اور اب اپنا دل صاف کر لے گی۔ کیونکہ آج تک ماما نے جو بھی کیا تھا اسی کے بہتر مستقبل کے لیے کیا تھا اس نے خود بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ماضی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے گی۔

وہ ماما کے روم میں داخل ہوئی۔ وہ وہیں موجود تھیں۔ وہ الماری کھولے کھڑی تھیں۔ اس کی آمد کو انہوں نے یکسر نظر انداز کیا۔

”سوری ماما۔“ اس نے دونوں کان کو ہاتھ لگایا۔ رفعت نے اس وقت بھی اس کی موجودگی کو نظر انداز کیا اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ پر اتنا ضرور ہوا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ دکھ، اذیت، آنسوؤں کے۔
”پلیز ماما۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ رفعت نے سرد سانس بھر کر اسے غصے سے دیکھا۔
شرمندگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

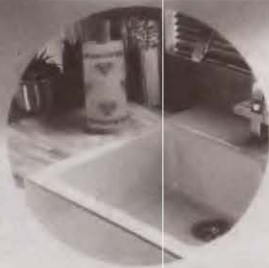
”میں تم میں اپنی بیٹی کا کس کچھ بھی ہوں راتیل! بہت اذیت دی ہے تم نے مجھے۔“ وہ سرد مہری سے گویا ہوئیں۔ وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے ہمیشہ ماما سے خود کے لیے میٹھے الفاظ سنے تھے۔ آج اس قدر سرد مہری اور لافانی تھی.....! وہ خود رونے لگی۔

”آپ میرا سب کچھ ہیں ماما! میں کوئی ضد نہیں کروں گی اب، مجھے سب سمجھ آ گیا ہے پلیز ایک بار معاف کر دیں۔“ اندر سے رفعت بھی رو رہی تھیں۔

انہوں نے زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے تو من پسند شادی ہونے کے بعد بھی شوہر کی توجہ نہ ملی۔ وہ ہمیشہ ان کی توجہ کی طلب گار رہی۔ دو پھول جیسے جان سے بھی پیارے بچے تھے۔ انہوں نے ضد میں آ کر ان کو تنہا کر دیا۔ یہ ان کا خدایا جانتا تھا کہ وہ اپنے البصار کے لیے کتنا تڑپا کر رہی تھیں، ان کے پاس صرف راتیل تھی جو ان کی زندگی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھیں لیکن اس روز راتیل نے حد کر دی تھی۔ اس نے بہت گہرا زخم دیا

Hankies®

... absorbent
..... elegant
..... & luxury



Customer Service
H&P
Health & Hygiene Products

hankieshnp@yahoo.com, freedomhnp@yahoo.com

AKS DIGITAL

جانتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی عادات سے خوب واقف تھے۔ وہ صمد کے ساتھ رہ کر اپنی ماما اور اپنے ہم آشناؤں کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ نئے سرے سے زندگی بسر کر سکتی تھی۔

اسے صمد سے پیار نہیں تھا مگر اس کی اچھائیوں نے اسے اس کے قریب جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اس کا فیصلہ بالکل درست تھا، وہ اس کے ساتھ اب بہت خوش تھی۔ اس کی شخصیت گھبر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنے تمام قریب تر رشتوں کو دل سے اپنا لیا تھا۔

عائش اس سے کسی طرح دست برداری نہیں چاہتا تھا۔ رائیل نے اسے آخری بار فون کر کے اپنے تمام فیصلوں کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ وہ اسے بہت سمجھا رہا تھا کہ ایسا نہ کرو، رائیل اپنے فیصلوں پر اٹل تھی۔ اس نے اپنی نئی راہ چن لی تھی۔ اس نے عائش سے دو ٹوک بات کی تھی۔

”صمد! میں سوچ رہا ہوں اس سڑکے کو ہم پوری فیملی کہیں پینک کے لیے چلیں۔ ویسے تو ایک دوسرے کو ٹائم نہیں دے پاتے، اس بہانے سب ساتھ میں وقت بھی گزاریں گے۔“ احسن خاص طور پر یہی مشورہ کرنے ان کے یہاں آیا تھا۔

”احسن! یہ تو بہت کمال کی بات کر دی تم نے، ہم تو تیار ہیں۔“ صمد اب بھی ایسے موقعوں کے لیے ایکسائیٹڈ ہوتا تھا۔

گھر کے بزرگوں نے انہیں جانے کی تو اجازت دے دی مگر خود جانے سے صاف انکار کر دیا، ان کے انکار کے باوجود صمد اور رائیل ان کے پیچھے پڑ گئے۔ آخر زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے استفادہ اسی طرح تو لیا جاتا ہے۔

دادا، دادی اور محمد شفیع کے علاوہ تمام اہل خانہ پینک پر جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ سب بہت ایکسائیٹڈ تھے۔ ”رائیل! میں اپنی چایاں چاچی کے روم میں بھول آیا ہوں۔ ذرا لے آنا۔“ صمد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی ماما کے روم میں آئی۔ گاڑی کی چایاں ڈرائیونگ ٹیبل پر لگی تھیں۔ اس نے چایاں اٹھائیں اور پٹی اس کی سرسری نگاہ ماما کے سینے کے نیچے پڑی۔

وہ دوبارہ اس طرف پٹی اور ماما کے بیڈ پر رکھے سینے کے نیچے سے فریم نکالا چونکہ اس کا فکری عمل تھا۔ یہ پاپا، ماما، البصار اور رائیل کی بہت پرانی تصویر تھی۔ شاید ماما اب بھی پاپا اور بھائی کو بہت مس کرتی تھیں وہ فریم واپس دراز میں رکھنا بھول گئی تھیں۔

الاشعوری طور پر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر فریم کے شیشے پر گرتے رہے۔ اسے عائش کی کبھی ہوئی ایک بات یاد آگئی تھی جو اس نے رائیل کو آخری بار بات کرتے ہوئے سنا تھا کہ پاپا کا کچھ سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور ان کے جانے کے بعد ہی البصار کی طبیعت میں ایسا بدلاؤ آگیا ہے اس نے یہ خیر اپنے دل میں ہی فنا کر لی تھی۔ کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

پاپا اب بھی ماما اور باقی دوسرے لوگوں کے لیے زندہ تھے۔ اصل حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کبھی ماما پر یہ انکشاف کر کے انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کا خود سے وعدہ تھا۔

”رائیل! ابھی جاؤ۔“ احسن روم کی طرف اسے بلاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے غلٹ میں وہ تصویر کا فریم ماما کے دراز میں چھپا کر رکھا اور آنسو صاف کرتی ہوئی احسن اور صمد کی جانب مڑ گئی۔

☆

سرفراز سکرت جہانہ

”یا ہو۔ دیکھا میں نے کہا تھا تا کہ مجھے ”نسخہ ہائے وفا“ میں سے ہی ملے گا۔ نشاء پرویز کچھ کہے اور وہ ہونہ ہو سکتا ہے بھلا، مانتی ہوتا مجھے۔“
”نسخہ ہائے وفا“ کو دیکھتے ہی اس نے ایک نعرہ



ماتہ کیا اور جوش سے بولتے ہوئے جیسے ہی مڑی اپنے
ماتہ ماہین کے بجائے ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر حیران
رہ گئی۔ چھ فٹ پانچ انچ قد، گندمی رنگت، اسکاٹی بلیو
کری شرٹ اور جینز پہنے ایک ہاتھ میں سن گلاسز
الٹائے اپنی براؤن آنکھوں میں دلچسپی کے رنگ
لے وہ مسکرا رہا تھا۔ نشاء ایک دم شیشا کر رہ گئی پھر
پہل کر بولی۔
”آئی ایم سوری مجھے مس انڈرا سینڈنگ ہو گئی
میں مجھے لگا کہ میری فرینڈ میرے پیچھے کھڑی ہے۔“
”تو اس اوکے۔ ویسے مس انڈرا سینڈنگ نہیں
کاٹی اچھی انڈرا سینڈنگ ہوتی ہے ہماری۔“
”کیا مطلب۔“ اس نے کچھ الجھ کر اس اجنبی کو
دیکھا تو وہ مسکرا کر مزید بولا۔
”اصل میں، میں بھی اس کتاب کو ہی خریدنے آیا
تھا میرے دوست کی برتھ ڈے ہے تو اس کے لیے
اسے کتابیں بہت پسند ہیں۔ شاید آپ کو بھی۔“
”ایکسکوز می آئی ہو وونو گوناؤ (مجھے جانا ہے)۔“
وہ اسے مزید بولنے کا موقع دینے بغیر تیزی سے
کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی جہاں ماہین ایک بیچ پریشی
بور ہوئی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔



تم یہاں پر کیا کر رہی ہو مجھے لگا کہ تم میرے ساتھ کھڑی ہو۔

”کیا یہ نشاء! پورے دو گھنٹے سے تم مجھے اپنے ساتھ لیے ہو۔ یہ کب سینئر پڑھوم رہی ہو۔ میں تھک گئی تھی اسی لیے یہاں پر آ کر بیٹھ گئی، بل مگر کی نا؟“ وہ حسب معمول لمبا جواب دے کر بولی تو اس نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تو ماہین کاؤنٹر پر پیسے دے کر اس کے ساتھ چلی آئی۔

”پلیز جلدی چلو، امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ وہ مختصر کہہ کر گاڑی کی ونڈ اسکرین کے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اس کی نظر اپنی کار میں بیٹھے اس اجنبی پر پڑی، جو چہرے اور ڈرائیونگ سے ہی کافی امیر لگتا تھا۔ اجنبی کی نظر بھی اس پر پڑی اور پہلے کی طرح اس کے لب مسکرا اٹھے نشاء نے بے اختیار ماہین کو دیکھا جو ڈرائیور کو جلدی چلنے کا کہہ رہی تھی۔

☆.....☆

دوسرے دن وہ حسب معمول جلدی اٹھ گئی۔ نماز پڑھ کر وہ باہر آئی تو حسب معمول نشاء روز کی طرح اپنے سامنے کپڑوں کے ڈھیر پھیلائے شین پر جھکی انہیں سینے میں مصروف تھی۔ تریشہ بچن میں بیٹھی پھوکی اٹھائے آگ سلگانے کے چکر میں بری طرح کھانس رہی تھی اور عریضہ بڑے سے صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ سامنے پیپل کے بڑے سے درخت کے نیچے پڑی چھینکا چار پانی پر ابا، عدنان اور عامر چائے اور پاپے سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ بھی اماں کی نظر اس پر پڑی تو زری سے بولیں۔

”ارے نشاء! کان! نہیں جائے گی کیا؟“

”نہیں اماں! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”ارے کیسی ناشکری لڑکی ہے نشاء تو۔ پہلے مری جاتی تھی کہ اماں مجھے کالج جانا ہے، پھر اس بھلی مائیں لڑکی ماہین نے تجھے داخلہ لے کر دیا وہ تیرا سارا خرچا اٹھاتی ہے۔ تو، تو کالج میں پڑھنے جانی ہے ورنہ

تیرے ابا کے پان کے کھوکھے اور میرے کام کرنے سے تو کہاں داخلہ لے سکتی تھی اور اب تو آئے دن چھٹی کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ چل میرے ساتھ میں تجھے کالج چھوڑنی جاؤں گی۔“

”اچھا اماں تو رک میں آتی ہوں۔“

تسلیم بیگم کے غصے سے کہنے پر وہ سر پر پاؤں رکھ کر اندر بھاگی، کالج یونیفارم پہن کر اس نے منہ دھویا اور اوپر سے بالوں میں لنگھا پھیر کر اس نے بیگ اٹھایا اور اماں کے پاس چلی آئی جو چادر پہنے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ پیچھے سے تریشہ نے اسے پکارا کہ نشاء ناشتہ تو کر کے جاؤ مگر وہ ان سنی کیے اماں کے ساتھ کالج چلی آئی ایک توجہ سے اس کا موڈ خراب تھا۔ دوسرا ماہین بھی کالج نہیں آئی تھی۔ تین پر پڑے کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور پیدل ہی گھر کے راستے پر چل پڑی۔ کالج سے اس کے گھر کا فاصلہ پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا۔ اماں کام پر جانے سے پہلے روز اسے کالج چھوڑ جاتی تھیں۔ چلتے چلتے اس کی نظر سامنے سے گزرنی اس کا رہ پڑی۔ جس میں تقریباً اس کی ہی ہم عمر کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بے فکری سے فیس لگاتیں ایک دوسرے پر پاپ کارن چھینتی وہ لڑکیاں اسے اس دنیا سے بہت اجنبی سی لگی تھیں۔ احساس

کتری ایک دم بڑھا تھا اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے کہیں دور چلی جائے جہاں نشاء پرویز کو نہ جانتا ہو جہاں کوئی دکھ نہ ہو جہاں کوئی غربت نہ ہو۔ وہ اس دنیا سے ایکدم روپوش ہو جانا چاہتی تھی مگر خواہش پوری تھوڑی ہوتی ہے اس کے قدموں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ پاس ہی موجود ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی کون اسے دیکھ رہا ہے کون جا رہا ہے کون رک رہا ہے اسے ایسے لگ رہا تھا کہ اس کے دکھ میں یہ درخت زمین آسمان اور کائنات کا ذرہ ذرہ رو رہا ہے

ام کر رہا ہے اس نے اپنے ہاتھوں سے سراٹھا کر درخت سے اس درخت کو دیکھا زمین کو آسمان کو وہ درخت سے دیکھنے لگی۔

”اگر کیا رشتہ تھا ان سب کا نشاء پرویز سے؟“

کیا احساس کتری کا رشتہ تھا؟

پاس کے ساتھ کیوں مام کر رہے تھے؟

کیا وہ ایسی تھی کہ اس کے دکھ پر محرومی پر کوئی

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس کی سسکیاں بچپن میں بدلنے لگیں بھی ایک نرمی بھری آواز اس کے آس پاس گونجی اسے ایسا لگا کہ وہ اس آواز کو پہچانتی ہے اسے جانتی ہے آواز ایک بار پھر

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے حیرت سے سراٹھا دیکھا وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا اس کے کوئی

اب نہ دینے پر وہ سوال بدل کر بولا تھا۔

”آپ میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں۔“

”گھر.....“ اس نے حیرت سے لفظ گھر کو دہرایا اور اگلے ہی بل اسے اپنا گھر یاد آ گیا تھا تو وہ نم

اور میں بولی۔

”میں یہاں پر اس لیے نہیں بیٹھی تھی کہ آپ یا

ولی اپنی شخص مجھے لٹ دے۔“

”آپ سیدھے سوال کا سیدھا جواب کیوں نہیں

دیتیں۔“ اب کے وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

”میں چلی جاؤں گی پاس میں ہے میرا گھر۔“ وہ کہہ ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور اگلے ہی بل لڑکھارہ بیٹھ گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اس سے اٹھا تک نہیں جا رہا تھا۔ یہاں وہ کتنی دیر تک گھنٹوں کے بل بیٹھی رہی تھی۔ اجنبی نے دکھ سے اس پاگل سی لڑکی کو دیکھا تھا پھر نرمی سے بولا۔

”اچھا آئیں نشاء! میں آپ کو سہارا دے دیتا ہوں چلے میں۔“

”ماہین کتنی ہے کہ کبھی کسی کا سہارا نہیں لینا چاہیے کیا پتا سہارا دینے والے کا کب موڈ بدلے اور وہ آپ کو چھوڑ کر آگے چل پڑے اور آپ منہ کے بل گر پڑیں۔ میں چلی جاؤں گی مسٹر۔“

”فشار..... فشار چوہدری نام ہے میرا اور جہاں تک آپ کو چھوڑنے کی بات ہے آئی مین کہ..... خیر چلیں انھیں اب سب دیکھ رہے ہیں۔“

وہ کھڑا ہو کر اپنا ہاتھ بڑھا کر بولا تو نشاء نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کیونکہ اب اس سے بالکل بھی بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے آہستہ سے تھینک پو کہہ کر وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جب کہ فشار چوہدری پر سوچ انداز میں اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆.....☆

گھر آتے ہی وہ درخت کے نیچے پڑی چار پانی پڑھ سی گئی اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر آئی ہو۔ ریتن دھونی تریشہ بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آئی تھی جسے وہ ایک ہی سانس میں ختم کر گئی تھی صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت اسے بے حد بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بچن میں چلی آئی بچن بھی کیا تھا۔ صحن کے ایک طرف چار دیواری دے کر اس کے اوپر لکڑیوں کی چھت بنا دی گئی تھی اور زمین پر ہی مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا ان کے گھر کیس کی سہولت بالکل نہیں تھی۔ بجلی بھی نام کو ہی تھی ان کے کمرے میں صرف رات کو ہی پنکھا چلا کرتا تھا اور سب کے سونے کے بعد اماں اٹھ کر اسے بھی بند کر دیتی تھیں۔ ساری رات پنکھا چلنے دینا ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی عیاشی تھی اور بلب کے نام پر ان کے کمرے میں صرف اماں ایک دیا جلا دیتی تھیں جس میں تیل سے زیادہ پانی ڈالا جاتا تھا وہ چار نہیں تھیں۔ سب سے

بڑی نشاط تھی پھر وہ اس کے بعد تریشہ اور عریشہ تھی اور اس کے دو بھائی عدنان اور عامر تھے جو اب کے ساتھ پان کے کھوکھے پر بیٹھے تھے۔ نشاط نے میڈل کیا تھا تریشہ پانچویں میں تھی اور عریشہ ساتویں میں۔ وہ خود فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی ان تینوں کی اسکول فیس ماہین ہی دیتی تھی۔ ماہین تین ہفتے میں ایک کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری سے نشاء کی ایک دو بارہی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے تین بھائی تھے جو کہ باہر سینٹل تھے۔ اس کی ماں سوشل ورکر تھی اور باپ ایک مشہور بزنس مین۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں کھو کر ماہین کو بالکل ہی بھولی چلے گئے تھے وہ ماں باپ کے پیار کی ترسی ہوئی لڑکی تھی اور اسی تنہائی نے اسے نشاء کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

اس نے بے دلی سے پتلی کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں پڑی بے رنگ دال کو دیکھ کر اس کی ساری بھوک اڑ گئی۔ ان کے گھر وال بھی جو بنتی تھی دال کو ابال کر اس پر نمک مرچ ڈال کر ہی اس سے روٹی کھاتی جاتی تھی۔ مٹی عجیب زندگی تھی اس کی ہر نعمت سے محروم ہر آرائش سے دور اور یہ بھی بات جب دوسرے دن اس نے کالج میں ماہین سے کی۔ وہ دکھ سے اسے دیکھ کر رہ گئی پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”میں نہیں کیسے سمجھاؤں نشاء میری جان! امیر وہ شخص نہیں ہوتا جس کے پاس دولت ہوتی ہے جو بہترین کپڑے پہنتا ہے جو بہتر سے بہتر کھاتا ہے وہ جس کے پاس بینک بینکس ہو تم کیا جانو کہ امیر تو وہ انسان ہوتا ہے جس کے پاس باپ کی شفقت ہوتی ہے ماں کی مہربانی گود ہو نہ کہ امیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس بہن کی محبت ہوتی ہے، بھائیوں کا اس کی ذات پر کیا جانے والا یقین ہوتا ہے۔ خالی خولی اچھے کپڑوں اور پیسوں سے کوئی بھی امیر نہیں ہوتا۔“

اس کی بات پر اس نے جل کر جواب دیا تھا مٹی اس کے ہر انداز سے اپنی ذات سے نفرت جھلک

رہی تھی۔

”ماہین! تم تو یہ سب کچھ بہت آسانی سے کہہ سکتی ہو کیونکہ تم میرے اس دوسروں کے گھر میں نہیں رہتیں جہاں انسان ہوا تک کے لیے ترستا ہے تم اس بین چھت والے کمرے میں اس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر نہیں سوئی جس کا پٹکا صرف چکر کھاتا ہے، ہوا نہیں دیتا۔ تمہیں بھی ایک ایک چیز کے لیے ترستا نہیں پڑا، تمہیں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو قربان نہیں کرنا پڑا، اس لیے تم یہ ساری باتیں اتنے آرام سے کہہ رہی ہو۔“

”میں دوبارہ کہوں گی نشاء! دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی یو نو جب تمہاری دولت کی ہوس بڑھنے لگے تو اپنے سے کمتر کو کچھ لیا کرو۔“

”مجھ سے کمتر بھی کوئی ہو گا ماہین۔“ وہ مٹی سے مسکرا کر بولی تو اب کی بار ماہین ہنسنے لگا۔

”اب اس شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نشاء تو وہ کبھی خود کو جیتے نہیں دیتا اور جو احساس برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ دوسروں کو جیتے نہیں دیتا۔“

”یو نو ماہین! مجھی بھی میرا دل شدت سے چاہتا ہے کہ تم سے تمہاری قسمت چروالوں اور تمہیں میں اپنی قسمت دے دوں تاکہ تمہیں احساس ہو کہ غریبی کیا ہوتی ہے۔“

اس کی بات پر ماہین نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر حسرت سے بولی بھی تو کیا۔

”اگر ایسا ممکن ہوتا نہ تھا تو قسم سے میں اپنی قسمت خود تمہیں دے دیتی اور تم سے خوشی خوشی تمہاری قسمت لے لیتی۔ تم نہیں جانتیں یہ امیر لوگوں کی دنیا بڑی بناوٹی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے احساسات جذبات تک بھی بناوٹی ہوتے ہیں اور یہ ہی بناوٹ انہیں اپنے خدا سے دور کر دیتی ہے۔“ نشاء نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پریڈ کی بیل بجی تو وہ اس کے ساتھ اٹھ کر کلاس کی طرف بڑھ گئی خالی

دماغ کے ساتھ۔

☆.....☆

سب کچھ معمول کی طرح چل رہا تھا وہ صبح کو کالج جاتی شام کو اماں کے ساتھ مل کر کام میں ہاتھ بٹایا کرتی، ماہین سے جی بھر کر باتیں کرتی مگر ان سب میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی اور وہ یہ کہ صبح کو جب وہ کالج کے لیے اپنے گھر سے اماں کے ساتھ نکلتی تو درخت کے تنے سے ٹپک لگائے فشار چوہدری اسے کھڑا ملتا تھا۔ نجانے کیوں اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ فشار چوہدری صرف اس کے لیے ہی دھوپ میں کھڑا ہوتا ہے اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ شاید وہ اسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کیا؟ وہ خود حیران تھی کہ وہ فشار چوہدری کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کیا وہ اس سے متاثر ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوال تھے جنہیں وہ ہر روز خود سے کرتی تھی مگر پھر اگلے ہی پل جواب نے بغیر اپنے دل کو ڈانٹتے بیٹھ جانی۔ ایک دن اتفاق سے اماں کو بخار نے گھیر لیا تو وہ اکیلی کالج کے لیے گھر سے چلی آئی اور حسب معمول وہ بے ہی فٹ ہاتھ کے سائیڈ پر لگے درخت کے قریب پہنچی فشار چوہدری اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا پھر نرمی سے بولا۔

”السلام علیکم نشاء! کیسی ہیں آپ؟“

”ولیکم السلام۔“ اس نے صرف سلام کا جواب دیا۔

”جیسے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے کیا آپ؟“

”ان منٹ، اب کیا میں ہر راہ چلتے شخص سے بات کرتی پھروں گی۔“ وہ اب کے کچھ تنہا ہوئی تھی تو وہ ہلدی سے بولا کہ کہیں وہ اس کی بات سننے سے ہی اٹھ کر دے۔

”میں اپنی سسر اور امی کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا

ہوں۔“

”پر کیوں؟“

اس کی سادگی پر اس کا دل چاہا کہ اپنا سر کسی دیوار پر دے مارے مگر وہاں کوئی دیوار نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو روڈ کے پار تھی اب اگر وہ دوڑ کر اس کے دیوار سے جا کر اپنا سر بھی مار دے تو اسے یقین تھا کہ نشاء پرویز بے نیازی سے گزر جائے گی اور وہ یا تو وہیں پر مر جائے گا یا پھر پاگل ہو جائے گا اسی لیے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور نرمی سے بولا۔

”آپ کے رشتے کے لیے اور کیوں؟“

”کیوں کیا وہ کوئی میرٹ جیورو کے آئیں۔“

اسے لطف آ رہا تھا فشار چوہدری کو غصہ دلانے میں کیونکہ اس نے نہیں پر پڑھا تھا کہ آپ جانتا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص کیسا ہے تو اسے صرف ایک بار غصے میں دیکھ لیں آپ کو خود بتا چل جائے گا۔ اب وہ اتنی بھی نیکی نہیں سمجھ سکتی کہ مجھ سے کتنی ہی کہ اس کا کیا مطلب ہے مگر پھر بھی وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔

”نہیں وہ اس لیے آنا چاہ رہی ہیں کیونکہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں۔“

اب کے فشار چوہدری مضبوط لہجے میں بولا تو وہ شپٹا کر رہ گئی۔ ”میں کیا کہہ سکتی ہوں جو امی ابو چاہیں گے۔“ اور یہ لفظی بات تھی وہ جانتی تھی کہ گھر والے ضرور اس کی شادی پر اعتراض کریں گے کیونکہ اس سے بڑی نشاط تھی۔ پہلے اس کی شادی ہونی چاہیے تھی لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شادی صرف فشار چوہدری سے ہی کرے گی۔ بچپن کے خواب اب جا کے پورے ہو رہے تھے وہ جتنا خوش ہوئی تھی۔ پھر دوسرے دن فشار چوہدری کی امی (جو کہ امی کم اور ماڈل زیادہ لگ رہی تھیں) اور اس کی بہن روٹی بٹی آئیں انہوں نے نشاء کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی پیٹنی پر رکھ دیئے۔ اماں

ابا الگ پریشان تھے کہ وہ اتنے امیر لوگوں میں رشتہ کرنے سے گھبرارے تھے تب نشاء نے ہی ضد کی اور انہیں اس رشتے کے لیے راضی کیا۔ جس کے لیے اسے تھوڑی سی جدوجہد کرنی پڑی۔ اماں نے کہا بھی کہ وہ پہلے نشاط کی شادی کریں گی جس پر وہ بگڑ کر بولی۔

”کیوں اماں! اگر اس کی شادی اس کے مقدر میں لکھی ہوگی تو ضرور ہوگی مگر میں اس کے لیے اپنا نصیب نہیں چھوڑ سکتی۔“

اس نے نفرت اور حقارت سے نشاط کو دیکھا تھا۔ ملگجے کپڑے بکھرے بال آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اپنے ہونٹ کا فنی آنسو پتی وہ اسے سخت بری لگی تھی۔ بالآخر اماں ابا کو اس کی ضد ماننا ہی پڑی اور شادی کی تاریخ دے دی گئی۔ نشاء تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی وہ یہ خوش خبری سب سے پہلے ماہین کو سنانا چاہتی تھی فون کرنے پر اسے پتا چلا کہ ماہین اپنی بڑی بہن کے گھر گئی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے اسے سخت دکھ ہوا تھا اس کی سب سے اچھی دوست ہی اس کی شادی میں شریک نہیں ہوگی مگر اگلے کچھ دنوں میں وہ سب بھول گئی ماہین کو نشاط کی آنکھوں کے آنسو یہاں تک کہ وہ خود کو بھی بھول گئی تھی۔ کبھی جن کپڑوں کو وہ حسرت سے دیکھا کرتی تھی اسے اس نے جی بھر کر خریدا ہر مہنگے سے مہنگا پر فیمو سوٹ، جوتے، میک اپ اس نے ہر چیز خریدی اپنی شادی کی ساری شاپنگ اس نے مہنگے مہنگے مول سے کی وہ جس جس چیز پر ہاتھ رکھتی فشار چوہدری اسے لے کر دے دیتا۔ وہ بھی حیرت سے خود کو آئینے میں دیکھتی کیا واقعی اس کے بچپن کے دیکھے وہ سارے خواب سچ ہو رہے تھے کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کوئی خواب دیکھیں اور وہ سچ ہو جائے۔ وہ اکثر سوچتی مگر اب تو اسے سوچنے تک کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ سارا دن فشار چوہدری کے ساتھ شاپنگ

کرتی پھرتی۔ پھر کسی ہوٹل سے وہ لوگ ڈنر کرتے اس نے اپنا فرنیچر تک خود لیا تھا مگر پیسے فشار چوہدری کے ہی تھے۔

☆.....☆

اور پھر وہ دلہن بنی کچھ خواب کچھ امید۔ لیے اور کچھ جگنو لیے وہ نشاء فشار چوہدری بن کر اس کے گھر آ گئی۔

بیٹھے بیٹھے اس کی کمر کڑی تھی مگر فشار کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس سے مزید بیٹھنا دو بھر ہو گیا تو وہ بیڈ کے بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور حیرت سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

”کیا سچ میں اب میں امیر ہوں بیٹھے کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا۔“ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ سو گئی۔

صبح کو جب وہ اٹھی تو فشار ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنے بالوں میں برش کر رہا تھا اسے دیکھ کر مسکرا دیا تو نشاء کو ایکدم شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ دلہن کے لباس میں ہی سو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کتنی فشار مسکرا کر نارمل انداز میں بولا۔

”اٹھ کیس یار! آتم سوری ڈارلنگ مجھے ابھی اور اسی وقت ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ نیچے ٹیبل پر میں تمہارے لیے ناشتہ لگانے کا کہہ دیتا ہوں باہر ڈرائیور ہر وقت موجود رہے گا تمہیں جہاں جانا ہو چلی جانا میں نے سائیز والی ٹیبل پر کچھ کیش رکھ دیا ہے، لے لینا اور میں لیٹ نائٹ آؤں گا پلیز میرا انتظار مت کرنا سو جانا اوکے خدا حافظ، لو یو۔“ وہ جلدی سے کوٹ پہنتا کمرے سے چلا گیا جب اس نے حیرت سے اپنی شادی کی پہلی صبح کو دیکھا پھر دل کو بہلا کر بولی۔

”شاید کوئی بہت ہی ضروری میٹنگ ہوگی ورنہ وہ اس طرح سے مجھے چھوڑ کر بالکل بھی نہ جاتے۔“ وہ خود کو تسلی دیتی اپنا زور اتارنے لگی۔ نہا کر اس نے اپنا سب سے خوب صورت اور مہنگا سوٹ پہنا تھا

اب ہاتھ میں چار سونے کی چوڑیاں اور دوسرے ہاتھ میں ڈائمنڈ سے جڑا انگن کانوں میں ڈائمنڈ کی ایلیاں اور گولڈ کی چین جس میں دل کی شکل کا ننھا سا ڈائمنڈ جگمگا رہا تھا پہن کر اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا اور اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ کر گلے میں دوپٹہ اسے وہ نشاء پرویز تو بالکل نہیں لگ رہی تھی جو ہر وقت ایک ہی سوٹ پہنے رہتی، اپنے حالات سے ملت تالاں رہتی یہ تو کوئی اور ہی نشاء فشار چوہدری تھی۔ وہ خود کو حیرت اور بے یقینی سے نبھانے لگی تھی اور آئینے میں دیکھتی رہی، چونکی تو اس وقت جب نوکرائی دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہو کر بولی۔

”وہ بی بی جی ناشتا تیار ہے جی۔“

”آئی اور روٹی کیا نیل پر ہیں؟“

وہ اپنی ساس اور نند کے بارے میں پوچھتے ہوئے اپنے بالوں میں جلدی جلدی کنگھا کرنے لگی اور بھی نوکرائی کے جواب نے اس کے ہاتھ روک دیئے۔

”وہ جی میڈم تو ایک پارٹی میں گئی ہیں اور روٹی بی بی کے پاس دوسٹوں کے ساتھ کلب گئی ہیں جی۔“

”یعنی گھر پر کوئی نہیں ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بی بی بی کوئی نہیں ہے جی۔“

”اچھا میں آتی ہوں۔“

وہ آہستہ سے بولی اور بے دلی سے اس کے پیچھے چلتے ہوئے آکر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ پوری ٹیبل یہاں سے وہاں تک نبھانے کتنے ہی کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک وقت تھا جب وہ ایک ایک چیز کے لیے تڑپتی تھی اور آج یہ وقت تھا کہ ہر چیز اس کے پاس تھی مگر وہ خوش نہیں تھی۔ بہت پہلے نہیں ماہین کی بات اسے ایکدم یاد آ گئی۔

”تم نہیں جانتیں امیر لوگوں کی دنیا بڑی بناوٹی ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے جذبات احساسات

تک بناوٹی ہوتے ہیں اور یہ ہی بناوٹ انہیں خدا سے دور کر دیتی ہے۔“

”کیا ماہین نے سچ کہا تھا یا پھر.....“

”میڈم کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے میں گرم کر کے لے آتی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتی نوکرائی کی آواز پر چونکی ہوئی بولی۔

”نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گی تم بس میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ میرے کمرے میں۔“ وہ کرسی دھکیل کر بے دلی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بالکلونی میں وہ کھڑی نہ جانے کتنی سوچوں میں قید تھی۔ اس کا گھر اس علاقے میں سب سے امیر گھر تھا۔ لیکن کیا واقعی وہ امیر تھے؟ وقت کچھ اور گزرنا۔

فشار چوہدری کا معمول پہلے دن کی ہی طرح تھا وہ اس کے سونے کے بعد آتا اور جاگنے سے پہلے ہی چلا جاتا اس نے ابھی تک اپنی ساس اور نند کے پاس بیٹھ کر صرف دس منٹ بات تک نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ اس کو گھر کے در و دیوار سے دشت ہونے لگی تھی اور پھر آج جب اتفاق سے فشار چوہدری ناشتے کی ٹیبل پر اسے ملا تو اس نے اسے کہہ دیا تو وہ نرمی سے بات بدل کر بولا۔

”آج شام تم تیار رہنا ایک پارٹی میں جانا ہے بلکہ یوں کرو تم آج میرے ساتھ چلو مارکیٹ سے شاپنگ کر لیتا اور پارلر چلی جانا، میں دوپہر کو آ جاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ خوشی سے بولی کہ چلو کچھ دیر کے لیے ہی ابھی وہ اس قید سے آزاد ہو گئی۔ اس نے فشار چوہدری کے ساتھ ڈھیروں شاپنگ کی پارلر گئی اور جب وہ وہاں سے تیار ہو کر باہر نکلی تو فشار چوہدری اسے دیکھ کر کھٹک گیا پھر مسکرا کر بولا۔

”وڈر فل! بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔“ وہ تھوڑی شرمناک گاڑی میں بیٹھ گئی اور جب وہ

پارٹی میں گئی تو نہ جانے کتنی نظروں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ عورتوں کی رشک بھری نظریں اس کے چہرے پر گئی۔ ایک تو وہ بھی ہی خوب صورت لمبے بال گوری رنگت اور بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک اور آج تو کچھ پیویشن کا کمال بھی تھا اور ایک اس نے پہلی بار ساڑھی پہنی تھی۔ وہ تو جیسے جاتے ہی پوری محفل کی جان ہی بن گئی تھی۔ بھی فشار چوہدری اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے ایک آدمی کے پاس لے جا کر بولا۔

”ارے نہال صاحب! کیسے ہیں آپ ان سے ملیے شی ازمانی وانف۔“

”اوہیلو۔ کیا نام ہے آپ کا؟“

نہال اپنی گندی نظریں اس کے چہرے پر جما کر بولا اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ نشاء نے شٹاکر دیکھا جو پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”ہیلو! میرا نام نشاء فشار چوہدری ہے۔“

اس نے دل کڑا کر کے اپنا ہاتھ نہال کے ہاتھ میں دے دیا جس پر نہال نے اپنے لب رکھ دیے۔ اسے تو جیسے کرٹ لگا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ بھی پوری محفل میں ہڑ بڑی جھنجھکی اور فشار چوہدری بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے لیے آگے بڑھ گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت بڑی ہستی تھا۔ نشاء نے حیرت سے سب کو دیکھا جو اس آدمی کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ان میں فشار چوہدری نمبر ایک پر تھا جو ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہا تھا پھر نشاء کا تعارف کروایا تو اس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرا کر فشار سے بولا۔

”آئی ایم سوری میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، یہ تو چیف صاحب نے اصرار کیا تو میں چلا آیا۔ میں چلتا ہوں۔“

”ارے آپ تو محفل کی جان ہیں، خیر میری پارٹی میں آپ کو ضرور آنا ہوگا۔“

”نرائی کروں گا۔“

سا کر م کہہ کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی سب باتوں میں لگ گئے۔ ہر لڑکی ہر عورت کی زبان پر صرف سا کر م کا ہی نام تھا لیکن اسے حیرت تب ہوئی جب اس نے ہر آدمی کے منہ سے بھی اس کا ہی نام سنا اور رات کو جب وہ سونے کے لیے بیٹی تو فشار چوہدری نری سے بولا۔

”تم سا کر م سے ملیں تھیں نا، وہ صرف اس شہر کے ہی نہیں کئی شہروں کے مشہور بزنس مین ہیں۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں ان کا بزنس پھیلا ہوا ہے۔“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا آخر وہ اسے یہ سب کیوں بتا رہا تھا اور اگلے ہی پل اس کی حیرت بے یقینی میں اس وقت بدلی جب فشار چوہدری نے کہا۔

”اصل میں ناکل میں نے اسے کچھ فائلیں دینی ہیں۔ نہال کو جس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں دو دنوں کے لیے دینی جا رہا ہوں ویسے تو میں ڈرائیور کے ہاتھ بھی بھیج سکتا ہوں بٹ تم جانتی ہو نا کہ ہمارا پرانا ڈرائیور چھٹی پر گیا ہوا ہے اور اس کے بدلے نیا آیا ہے جس پر مجھے بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے ڈرائیور کو ایڈریس بتا دیا ہے اور فائلیں بیڈی سائیڈ ٹیبل پر بڑی ہیں پلیز یا تم چلی جانا وکے گڈ نائٹ۔“

وہ اس کا جواب سنے بغیر ہی اسٹڈی روم میں چلا گیا جب کہ نشاء کل کے لیے پریشان ہو گئی۔

☆.....☆

صبح اس کے اٹھنے سے پہلے ہی فشار چوہدری جا چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے کپڑے بدلے کا جل آنکھوں میں ڈال کر وہ نیچے چلی آئی۔ خلاف معمول روٹی اور آٹنی ناشتہ کرنے میں مصروف تھیں اس کو دیکھ کر بس رکی سی مسکرائیں اور دوبارہ ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ نشاء نے ایک نظر روٹی کو دیکھا بغیر بازو کے ٹائیٹ شرٹ اور جگہ جگہ سے پچھی جینز پہنے

اپنے براؤن پالوں کو کندھے پر ڈالے وہ آزادی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ہلکا سا ناشتہ کر کے وہ فائلیں لے کر باہر چلی آئی۔ ڈرائیور تو بس جیسے اس کا ہی منتظر تھا اسے دیکھ کر اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے بار بار کل رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا جب نہال نے اس کے ہاتھ پر کس کیا تھا اور فشار چوہدری جان کر انجان بن گیا تھا۔

”کیا کوئی مرد ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں جلدی سے فائلیں دے کر واپس آ جاؤں گی۔“ وہ یہ سوچ کر ”الٹن ہو گئی۔“ سمجھی اس کی کار ایک جھٹکے سے رکی تو وہ باہر نکل آئی وہ کوئی گھر نہیں عالیشان محل تھا وہ جتنا حیران ہوئی کم تھا۔ گھر کے باہر دو باوردی گاڑی کھڑے تھے جنہوں نے اسے دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ حیران سی اندر چلی آئی۔ سرخ اینٹوں سے بنا وہ گھر کسی محل سے کم نہیں تھا ہر طرف پھول ہی پھول تھے ہر جگہ باوردی گاڑی کھڑے تھے۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا کہ واپس چلی جائے مگر وہ اب مزہ لے لے سکتی تھی۔

”ارے نشاء صاحبہ آئی ہیں۔ آئیے آئیے کسی ہیں۔“ وہ حیران سی گھر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک دم مسکراتا وہاں جو کہ 35 سال تک کا تھا اس کے سامنے آ کر بولا۔

”جی آئی ایم فائن۔ یہ لیجیے فائل۔“

”آئیے نا باہر کیوں کھڑی ہیں اندر چلیے ہیں کچھ ام ہمارے ساتھ بھی گزرا لیا کریں۔“ وہ اس کی ہاتھ کاٹ کر بولا اور آگے چل پڑا تو مجبوراً وہ بھی اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنچ میں داخل ہو گئی اور اس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ہاں باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی پہلے یہ فائلیں لے لیں۔“

”کیا نہیں میں بس وہ.....“

”ارے ایسے کیسے چلے گا۔ گاڑی جلدی سے میڈم کے لیے چائے لے آؤ۔“

اس کے منع کرنے کے باوجود وہ بولا تو ایک دم سارے گاڑی کمرے سے باہر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں اسے ایک دم کچھ خطرے کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور فائلیں ٹیبل پر رکھ کر بولی۔

”مائیڈمٹ کیجیے گا مجھے ڈرا جلدی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے مڑی کہ نہال اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”ارے ایسے کیسے نشاء صاحبہ جس کام کے لیے آئی ہیں پہلے وہ کام تو کریں پھر چلی جائے گا۔“

”یہ کیا بد تمیزی ہے میرا ہاتھ چھوڑیں آپ۔“

”ارے بڑی شریف بن رہی ہیں آپ، جیسے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔“

اب کے وہ اس کا رخسار سہلا کر بولا تو نشاء ایک جھٹکے سے الگ ہوئی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”شاید آپ کو آپ کے شوہر نے کچھ بتایا نہیں۔ رکیں آپ بات کریں اپنے شوہر سے۔“ نہال نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور فشار چوہدری کا نمبر ملا کر اسے فون دیا تو وہ فخر بیاچھ کر بولی۔

”فشار کہاں ہیں آپ اور یہ.....“

”کیا بکواس کر رہی ہو جاہل عورت جیسا وہ کہتا ہے ویسا کرو ورنہ میری طرف مت آنا، میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ارے اتنے میں نے پا پڑے پہلے ہیں صرف تمہارے لیے اب صلہ دینے کا وقت آیا ہے تو چیخ رہی ہو۔“

اس نے فون بند کر دیا اور نشاء نے جس وحرت سی گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک دم بے جان ہو کر رہ گئی تھی کیا یہی وہ دولت جسے پانے کی چاہ میں وہ پاگل رہی تھی کیا عزت، دولت سے اہم؟

وہ ایک دم نہال کے قدموں میں گر کر پھوٹ

پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

”پلیز..... پلیز مجھے جانے دیں مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں، مہربانی کر سب مجھ پر۔ پلیز اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔“

کیسی بے بسی تھی کہ وہ نشاء پروردہ جو کبھی اپنے حالات سے خوش نہیں رہی تھی جس نے کبھی کسی انسان کو انسان نہیں سمجھا تھا وہ آج اپنی عزت کے لیے ایک امیر زادے کے قدیموں میں گری پڑی تھی۔ پتا نہیں اس کی قسمت اچھی تھی یا پھر وہ وقت ہی ایسا تھا۔ نہال اس سے دور ہو کر زور سے بولا۔

”گارڈ میڈم کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔“

اس نے بے یقینی سے سر اٹھا کر نہال کو دیکھا تھا جو رخ موڑے کھڑا تھا۔ پھر اس سے بولا۔

”مس نشاء فشار چوہدری کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو لگی ٹھوکر سے ہی سبق سیکھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ ہمیشہ ٹھوکر لگنے کے انتظار میں رہتے ہیں اور کچھ ٹھوکر لگنے کے بعد اٹھ کر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیتے ہیں تاکہ دوبارہ اٹھ کر نہ لگے۔ اب آپ کا انتخاب کن میں ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ آپ جاسکتی ہیں مگر یاد رکھیے گا ہر کوئی نہال نہیں ہوتا جو ہاتھ آیا مفت کا مال ٹھکرا دے۔“ وہ بولا تو نشاء اٹھ کر باہر چلی آئی ذرا سیوڈ اس کا منتظر تھا مگر وہ اسے نظر انداز کیے بے جان قدموں سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کیا یہ بھی وہ دولت جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ وہ اپنے حال پر کبھی خوش نہیں رہی تھی اور اسے ملا بھی تو کیا آج اس کے پاس دولت تھی، بینک بیلنس تھا پر اپنی ذات کا مان اور یقین نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے مول ہو کر رہ گئی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں میں درد ہونے لگا تھا مگر وہ چلتی جا رہی تھی اور بھی اس کی نظر سامنے سے آتے ٹک پر پڑی اور وہ

یہ بات جانتی تھی کہ یہاں سے جائے گی تو فشار اسے ہر بار پیچھا گا اور وہ اپنی عزت نہیں بچا سکے گی اور اگر وہ اس کا کہنا نہیں مانے گی تو وہ اسے طلاق دے دے گا، عمر بھر کا روگ۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتی۔ اس سے پہلے کہ ٹرک اس پر سے گزرتا کسی نے پوری قوت سے اسے پیچھے کھینچا تھا اور وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گری اور پھوٹ پھوٹ کر رودی تو نہال نے نہایت دکھ سے اسے دیکھا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا کر رہی تھیں تم؟“

”مر جانا چاہتی ہوں میں اس زندگی سے موت بہتر ہے۔“

”اچھا اب اگر میں تمہیں مرنے دیتا تو کیا ہوتا۔ ایک ناختم ہونے والی سزا تمہارا مقدر بنتی۔ بدنامی سے تم بچنے کے لیے اپنی اگلی ساری زندگی جس میں موت بھی نہیں ہے، تم برداشت کرتی کس منہ سے تم اللہ کے پاس جاتیں۔ وہ تم سے نہ کہتا کہ اے بندی میں نے تجھے ساری زندگی دی اور جب تجھ پر ذرہ سی آزمائش ڈالی تو تم نے خودکشی یعنی حرام موت چن لی۔ ہر مسئلے کا حل موت نہیں ہوتا نشاء۔“

پھر وہ اپنے گھر آگئی۔ اماں ابا کو جب فشار چوہدری کے بارے میں پتا چلا تو انہوں نے اس کے فیصلے کو ٹھیک کہا اور تقریباً مہینے کے بعد اسے ڈاک سے طلاق نامہ موصول ہوا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر وہ اماں کے گلے لگ کر اس نام نہاد رشتے کے ٹوٹنے پر ماتم کرتی رہی۔

ابھی کیا کہیں ابھی کیا سنیں کہ سر فیصل سکوت جاناں

☆.....☆

آج میں نہال کے ساتھ بہت خوش ہوں ابھی کچھ دیر میں ہم ایک ہوٹل میں ڈنر کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ آج میرا ایک پیارا سا بیٹا شاہ زیب ہے۔ میں

اسے بالکل نہال کی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔ نشاط، تربیش اور عریشہ کی شادی ہو چکی ہے۔ ابا اور امی ہم میں نہیں جب کہ بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ میں آج بھی سوچتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں کہ اگر اس دن میں خودکشی کر لیتی تو میرا انجام کس قدر بھیانک ہوتا، اگر مجھے نہال نہ بچاتا تو؟ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکتی۔ نہال مجھے بلارہے ہیں۔“

”جلدی کرو یا دیر ہو رہی ہے۔“

”بس آتی ہوں۔“

میں کہتے ہوئے جلدی سے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ٹریفک بے حد تھا۔ ریڈ سگنل پر گاڑی رکی اور میری نظر ونڈو کے پار نظر آتے اس شخص پر رک سی گئی۔ میں بے اختیار بھاگتی ہوئی اس تک گئی۔ پیچھے پرانے کپڑے ایک ٹانگ آنکھوں سے پتے آنسو اس پر بھیگیں تھیں ہاتھ اٹھا کر بھیک مانگتا یہ وہ فشار چوہدری تو نہیں تھا جو محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا یہ تو کوئی اور ہی تھا جسے اپنے کیے کا دنیا میں ہی عذاب مل رہا تھا اور آخرت میں بھی ملنا تھا۔

نشاء! مجھے..... مجھے معاف کر دو میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا۔“

”یہ سب.....“ میں اتنا ہی کہہ سکی اور میرے پیچھے آنے والا نہال ساکت رہ گئے جب کہ فشار چوہدری روتے ہوئے بولا۔

”تمہیں طلاق دینے کے بعد کچھ لوگوں نے روٹی کو کڈ نیپ کر لیا اور وہ میری ساری دولت مانگنے لگے، میں نے انہیں اپنی برسوں سے جمع کی ہوئی ساری دولت دے دی اور انہوں نے روٹی کا ٹکڑا پیسہ کر کے اسے مار دیا ابھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور جب میں نے مرنے کی کوشش کی تو ایک ٹانگ گناوا بیٹھا۔ ہر کوئی اپنے کیے

کا انجام ضرور بھگتا ہے جلدی یادیر سے۔ مجھے اللہ نے اب تک شاید اس لیے زندہ رکھا ہے کہ میں تم سے معافی مانگ سکوں مجھے معاف کر دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تو میں نے اسے کہا کہ میں نے اسے معاف کر دیا۔ میں اٹھ کر ابھی دو قدم ہی چلی تھی کہ ایک دم شروع مچ گیا، فشار چوہدری گناہ کو گناہ نہ سمجھنے والا آج لاوارث موت مرا پڑا تھا، بے شک اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ ہم نے گھر آتے ہی اس کی تدفین کرائی اور آج میں اللہ کے اس انصاف پر حیران ہوں جو ہماری قسمت میں ہوتا ہے ہمیں ضرور ملتا ہے جلد یا بدیر اور ہم کون ہوتے ہیں اس سے یہ کہنے والے کہ اس نے فلاں کو اتنا دیا اور ہمیں نہیں دیا۔ کسی چیز کے ختم ہونے پر شکوہ مت کرنا کیونکہ اس نے آپ سے صرف ایک چیز لی ہے سب کچھ نہیں۔“

میں نے سوچتے ہوئے ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ جہاں پر نیا سورج کچھ نئے وعدے امیدیں اور ارمان لے کر طلوع ہو رہا تھا اس امید پر کہ شاید اب کوئی لڑکی نشا کی طرح ناشکری نہ کرے۔ کاش اب کوئی فشار چوہدری غرور میں نہ ڈوبے۔

”نہال ہر انسان تمہاری طرح کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔“

”اگر ہر نہال کی زندگی میں نشاء چلی آئے۔ نہ تو نہال کو اچھا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے اور مجھے نئی زندگی مل گئی۔“

”میری بھی زندگی کا حاصل ہیں آپ۔“ میں نے شرم کر کہا اور نہال کے کندھے پر سر رکھ کر ایک بار پھر سے باہر پھینکی نئی صبح کو دیکھنے لگی مگر اب میرے دیکھنے کے انداز میں مایوسی اور ناامیدی نہیں تھی بلکہ ایک نئی امید تھی آس تھی کچھ اچھا ہو جانے کی۔

☆.....☆

عکس در عکس

”پلیز ماما جانے دیں ناں؟“ پچھلے ایک گھنٹے سے ڈے پارٹیز اور کمپائن اسٹڈیز کے لیے وہ ہر دوسرے دن اس سے اجازت لے رہی ہوتی تھی۔ سائرہ کو اس وہ مستقل سائرہ کو منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ برتھ

”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے رجا! اس کی مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

”تمہارا رات دیر سے واپس آنے پر مجھے سخت اعتراض ہے اگر تم جلدی واپس آ سکتی ہو تو چلی جاؤ Other wise.....“ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رجا جھٹ بول اٹھی مبادوہ مزید تھانہ ہو جائیں۔

”نہیں ماما! میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔“ وہ خوش ہو کر جوش سے بولی اور اپنا بیگ لینے اپنے روم میں چلی گئی۔

کے آنے جانے پر سخت اعتراض تھا اور اعتراض بے جا تھا بھی نہیں۔ رات گئے کی واپسی اسے بہت کھلتی تھی۔ تب ہی وہ آج بھی اس کو جانے کی پرمیشن نہیں دے رہی تھیں۔

”مما پلیز! مان جائیں ناں۔“ اس کا جواب نہ پا کر وہ دوبارہ درخواست گزار ہوئی۔

”رجا! مجھے تمہارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اس کا یہ جملہ سننا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑکی ہو گئی۔

”ٹھیکس ماما!.....“



”کیا بات ہے آج بہت سنا ہوا ہے گھر میں خیر تو ہے۔“ کامران رضا فریش ہو کر روم میں آئے تو دریافت کرنے لگے۔

”جی سنا تو ہو گا جی آپ کی شہزادی آج پھر کیا ہی اسٹڈیز کے لیے گئی ہے۔“ لہجے کی ناگواریت واضح تھی جسے وہ بخوبی بھانپ گئے تھے۔ بغور وہ سارہ کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

”کیا بات ہے سارہ! میں نے نوٹ کیا ہے تم رجاء کے کہیں بھی جانے پر خوش نہیں ہوتیں۔“

”جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے، مجھے اس کا روز روز کا آنا جانا بالکل پسند نہیں ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولیں۔ ”انہیں سچ پر پردہ ڈالنے کی عادت بھی نہیں تھی جودل میں ہوتا بتا دیتی تھیں۔ وہ الجھ گئے۔ کافی دیر تک ان کو الماری سیٹ کرتا دیکھنے لگے۔

”میری سمجھ نہیں آتا سارہ! تم اتنی کنزرویٹیو کیوں ہوتی جا رہی ہو۔ رجاء ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ اسے آزادی دونا کہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔ ابھی وہ عمر کے جس حصے میں ہے اس میں خود اعتمادی کی بہت ضرورت ہے ابھی اگر ہم اسے آزادی نہیں دیں گے تو وہ مستقبل میں کیسے قدم جما سکے گی۔ ابھی تو اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔“

”ٹھیک کہا آپ نے؟“ وہ الماری بند کر کے پلٹ گئیں۔

”مگر جس خود اعتمادی کی بات آپ کر رہے ہیں آج کل کے دور میں خود پسندی میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ میں کنزرویٹیو نہیں ہوں۔“ انہوں نے ان کے خود پر لگائے گئے الزام کی تردید کی۔

”میں محتاط ہوں۔ زمانے کی ڈگر ہی ایسی ہے جو سیدھی راہ پر چل بھی رہا ہو، وہ بھی ڈمگا جاتا ہے۔ رجاء تو تین اتج میں ہے اس عمر میں تو.....“ کامران نے بات کاٹ دی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں سارہ! تم خود اتنی انجیو کیڈ ہو پھر بھی ایسی سوچ رکھتی ہو۔ ہم ایک آزادانہ ماحول میں رہتے ہیں اور ہماری کلاس میں یہ کوئی بڑی بات نہیں۔“ کامران رضا کو اس کی سوچ متاسف کر گئی۔ سارہ متفکر چہرہ لیے ان کی باتوں پر غور کرنے لگیں۔

”کیا واقعی میری سوچ غلط ہے۔“ انہیں صرف اس کے آنے جانے پر ہی نہیں اس کے لباس پر بھی اعتراض رہتا تھا۔ جینز ٹائٹس پہننا کوئی معیوب بات نہیں تھی اور دوپٹے جیسی فائنڈیشن کی بھی کوئی غنجائش نہ تھی مگر شاید سارہ کی سوچ اس ماحول سے یکسر مختلف تھی۔ انہیں شاید احساس تھا کہ غلط اور صحیح کیا ہے وہ اتنی زیادہ مذہبی بھی نہیں تھیں مگر ان کا دل وہ ذہن جو علیحدہ تھا جو ان سب چیزوں کو دل سے قبول نہیں کرتا تھا۔

”اور اسٹڈی کیسی چل رہی ہے بیٹا؟“ بہت کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ تینوں ناشتے کی ٹیبل پر جمع ہوں آج اتفاق تھا کہ کامران رضا جلدی بیدار ہو گئے تھے۔

”جی پاپا! بہت اچھی.....؟“ تو اس کا بانٹ لیتے ہوئے اس نے کمن سے انداز میں کہا۔

”اور ایگزیم کب تک اسٹارٹ ہیں؟“ وہ آج شاید اچھے موڈ میں تھے تب ہی اپنی بیٹی سے پڑھائی کے متعلق گفت و شنید کر رہے تھے۔

”ادو! آج تو بہت رونق لگی ہوئی ہے ٹیبل پر.....“ وہ چائے کی ٹرے تھامے ڈائننگ ٹیبل کے قریب آئی۔

”رونق سے مراد آپ کی ماما.....“ رجاء بھاپ اڑاتی چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔

”رونق سے مراد آپ کے پاپا ہیں۔“ سارہ کی شرارت پر کامران کے لبوں پر تبسم بھر گیا۔ رجاء کافی حیرت سے دیکھنے لگی۔

”پاپا! آپ مجھے ڈراپ کر دیں گے؟“ چائے ختم

کر کے وہ جیسے جانے کے لیے پرتو لگے۔

”جی بالکل بیٹا!“ آج وہ خاصے اچھے موڈ میں لگ رہے تھے۔ سارہ نے اس غیر معمولی تبدیلی پر خوشی کا اظہار کیا اور وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے آج آپ کافی خوش لگ رہے ہیں کوئی خاص وجہ؟“ اس سے قبل کہ کامران کوئی وضاحت پیش کرتا رجاء ناراضی سے ٹوک بیٹھی۔

”مما! کمال کرتی ہیں آپ اگر بابا خوش ہیں اچھے موڈ میں ہیں تو آپ کو تو اسی بات پر خوش ہونا چاہیے تاکہ آپ اس طرح کہہ کر انہیں Disheart

کریں۔“ کامران نے اپنی حمایت پر مشکور انداز میں اسے اسے ساتھ لگا لیا۔ سارہ نے ان دونوں کو مصنوعی خفگی سے گھورا اور دوسرے ہی لمحے مسکرا دیں۔

رجاء بھاگ کر اندر کی جانب چل دی۔ سارہ چائے کا ٹپ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ٹیبل سے سب چیزیں سمیٹنے لگیں۔ کامران کی نظر نیو پیپر پر پڑی تو وہ ہیڈ لائنز پر نظر ڈالنے لگے۔ تب ہی ٹیبل پر رکھا سیل فون بجنے لگا۔ اس سے قبل کہ کامران ٹیبل کے

نزدیک آتا سارہ سیل اٹھا چکی تھیں۔ اسکرین پر اسکرین سی نگاہ ڈال کر انہوں نے سیل کامران کی جانب بڑھا دیا اور وہ خالی کپوں کی ٹرے اٹھا کر چٹن کی جانب چلی گئیں۔

”ادو کے میں ایک گھنٹے میں آرہا ہوں یو ڈونٹ وری یار.....“

”چلیں پاپا!“ وہ کاندھے پر بیگ اٹھائے تیار تھی۔

”ہاں بیٹا بالکل۔“ انہوں نے عجلت سے سیل فون ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے پاکٹ میں رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں کھڑی وائٹ کار کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے سارہ کو آتے دیکھا تو وہ کچھ کہنا چاہا رہے تھے مگر گاڑی کالا کھول

کر وہ بیٹھنے ہی والے تھے۔ جب سارہ نے اس کی نگاہوں کو جان کر خود ہی پوچھ لیا۔

”آج آپ جلدی آجائیں گے نا؟“ ”نہیں سارہ! آج شاید لیٹ ہو جاؤں گا، تم کھانے پر انتظار مت کرنا۔“ اس سے پیشتر کہ وہ مزید سوال کرتیں وہ فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”بابے ماما۔“ پورچ سے گاڑی کے نکلنے ہی اس نے ہاتھ ہلایا۔ وہ جواب دیتیں واپس اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

”یار سیرسلی! مجھے تو ماہ رخ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ایک تو اس کا رنگ اتنا ڈارک ہے اوپر سے وائٹ یونیفارم یار بالکل بھی سوٹ نہیں کرتا اس پر مجھے تو لگتا ہے وہ زینہ (کالج کی بوا) کی بیٹی ہے اور خود کو افلاطون سمجھتی ہے۔“

پچھلے آدھے گھنٹے سے رجاء فون پر بڑی فنی سارہ چٹن میں رضیہ کے ساتھ کام کر رہی تھیں مگر وہ بیان رجاء کی گفتگو پر ہی تھا۔

”ہاں یار! اور دیکھو ناں میڈم ملائکہ اس کو ہر وقت Appreciate کرتی رہتی ہیں۔ جیسے اس سے زیادہ ذہین تو کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔“ وہ دل کی بھڑاس جی بھر کے نکال رہی تھی یقیناً دوسری جانب بھی اس کی ہم خیال تھی تب ہی تو گفتگو طول پکڑنی جاری تھی۔

”یار! کوئی پلان بناؤ اس کو میڈم ملائکہ کیا کوئی بھی اس کو انگریز نہ کرے۔“ اس کے لہجے میں رعوت ہی رعوت کے سوا کچھ نہ تھا۔

”زویا پلیز یار! اب تم تو کم از کم اس کی سائیڈ مت لو۔“ وہ تپ کر رہ گئی۔

”مجھے وہ بہت زہر لگتی ہے۔ I hate her۔“ اب کی بار لہجے میں نفرت سی بھر گئی۔

”کوئی اور بات نہیں تمہارے پاس۔“ وہ غصے سے بھڑکنے لگی۔ زویا دوسری جانب سے اس کے

غصے سے خطا اٹھا رہی تھی۔ سائرہ اس کی باتیں سن کر بچن سے نکل آئیں۔ اس کے لہجے و انداز پر سخت حیرت بھی تھی اور کہیں زیادہ افسوس بھی تھا کہ وہ کسی کے لیے ایسے جذبات رکھتی ہے۔

”پلیز زویا! Leave this topic“
میں اسے دیکھتا تو کیا اس کے بارے میں بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی۔ کالی کوئل ہنہہ.....“ غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنی بھڑاس نکالی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اگر وہ ابھی اس کے سامنے آجائے تو اس کا حشر کر دے گی۔

سائرہ کو قطعاً اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی کی یوں تذلیل کرے۔ دوسری جانب وہ ملن رہی۔ سائرہ نے تین چار بار پکارا مگر رجاء نہ جانے سن رہی تھی یا پھر دانستہ طور پر ان کی کر رہی تھی۔

”رجاء“ اس بار قدرے بلند آواز سے پکارا تو اس نے اس کے غیر معمولی موڈ کو دیکھ کر فون رکھنے کا ارادہ کر لیایا۔

”اوکے زویا! میں پھر بعد میں کال کروں گی۔“
”رجاء! کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں؟“ وہ مکمل طور پر آج اس سے باز پرس کرنے کے موڈ میں تھیں۔
”جی ممما! کیا کہہ رہی ہیں آپ میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔“ اس نے ابھنسنے سے اسے دیکھا۔
”ابھی تم کس کے بارے میں بات کر رہی تھیں زویا سے۔“

”ممما! وہ ایک نئی لڑکی آئی ہے کالج میں.....“ اس نے بے نیازی سے کہا۔
”تو تم سب اسی طرح سب نئی آنے والی لڑکی کو ڈسکس کرتی ہو۔“ لہجے کی ناگواریت رجاء کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سارا معاملہ اس کا ہے اور اس کی کلاس فیوز کا انہیں آخر اس میں کیا بھلائی بھلائی؟

”کیا مطلب ہے ممما؟“ اس کی تیوریاں شکن آلود ہونے لگیں۔

”مطلب یہ ہے کہ آخر تم کالج میں کیا کرنے جاتی ہو، تعلیم ڈگری کا نام نہیں ہے رجاء۔ یہ ہمیں ضابطہ اخلاق، مذہب، رہن سہن ہر ایک چیز کی اہمیت اور ہر ایک چیز کو زندگی میں شامل کرنے بلکہ کس حد تک شامل کرنا ہے اور کیسے، ہر ایک چیز کا شعور دیتی ہے۔“
”ممما! آپ کو کیا ہو گیا ہے، میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا ہے کہ آپ مجھے اس طرح ڈانٹیں یا لمبے لمبے پکچر دیں۔“ لہجے کی ناگواریت اس کے چہرے پر بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ اس کو سائرہ کا یوں سمجھانا قطعاً نہ بھایا تھا۔

”نہ تو میں تمہیں ڈانٹ رہی ہوں نہ ہی لیکچر دے رہی ہوں۔ میں صرف تمہیں تعلیم کی اہمیت اور اس کے مقصد کے بارے میں آگاہ کر رہی ہوں۔“

”ممما! میں کوئی ان پڑھ لڑکی نہیں ہوں یا ٹڈل کلاس میں رہنے والی نہیں ہوں کہ آپ مجھے اٹھنے بیٹھنے سونے جانے کا طریقہ بتائیں، مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے اپنی سوسائٹی میں کس طرح موڈ کرنا ہے۔“ وہ بکڑ کر بولی۔ سائرہ کا پکارا نہیں۔ اس سے اس قدر بدلتا لڑکی کی توقع نہیں تھی انہیں۔ انہیں یوں ہی حیران پریشان چھوڑ کر وہ اندر چلی گئی اور ان کے ذہن میں ایک سوچوں کی یلغار لانے کی گئی تھی۔

”آئی تبدیلی آگئی ہے رجاء میں اب نہ اسے تنقید برداشت ہوتی ہے نہ ہی نصیحت ہی اسے بھاتی ہے۔ ماں کی باتیں اب اسے ناگوار لگنے لگی ہیں۔ یہ کس ڈگر پر نکل گئی ہے۔ نصیحت کو برداشت نہ کرنا فرمائی میں داخل ہونے کی پہلی نشانی ہوا کرتی ہے۔“ ان کا دل ہولنے لگا۔ اس کے طور طریقوں پر وہ پہلے ہی اس سے نالاں رہا کرتی تھیں مگر اس بدیہی کی انہیں ہرگز بھی توقع نہیں تھی۔ وہ سر ہٹا کر رہ گئیں۔

☆.....☆
رجاء کالج اور کوچنگ کی کلاسز تو ریگولر جوائن کر رہی ہے مگر رزلٹ کچھ خاص نہیں آیا ہے۔ سائرہ

اس بات کو لے کر بہت فکر مند تھیں جب سے ان کو معلوم ہوا تھا کہ وہ رزلٹ میں ہاف مارکس بھی نہیں لے سکی ہے۔

”ہوں۔“ کافی دیر بعد ان کا مگن سا جواب آیا تھا۔
”لیپ ٹاپ پر انگلیاں متحرک تھیں۔“
”مجھے میں آ رہا وہ اسٹڈی میں ویک کیوں ہے۔“

وہ اس کے لاپرواہ رویے سے پریشان تھیں۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے بس انہیں رجاء کی اسٹڈی کی ہی فکر کھائے جارہی تھی۔

”آپ اس سلسلے میں بات کر کے دیکھیں رجاء ہے۔“ وہ خود کو کافی بدظن سی ہو گئی تھیں اس بات سے۔
”سن رہے ہیں میں کیا کہہ رہی ہوں آپ سے۔“ وہ اس کی عدم توجہی پر چڑھتی ہو گئی پتا نہیں وہ ٹھیک سے سن بھی رہے تھے کہ نہیں۔

”ہاں، ہاں.....“ وہ سرسری سے انداز میں لے۔ مبادا اسے معلوم نہ ہو جائے کہ وہ اس کی بات پر توجہ نہیں دے رہے۔ ان کی مکمل توجہ لیپ ٹاپ پر تھی۔

”سائرہ! یہ تو بند کر س پہلے۔“ وہ زچ ہو کر لیپ ٹاپ آگے سے ہٹانے کے لیے بڑھیں تو رضائے ان کا ارادہ بھانپتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

”کیا ہوا ڈیئر۔“ انہوں نے ان کے خفا خفا بارے کو دیکھا۔
”اس کا مطلب ہے آپ نے کچھ بھی نہیں سنا جو ہماری میں نے کیا؟“ وہ شگوہ کنال ہوئیں۔ انہیں اس سے ایسی توقع نہ تھی۔

”اب معلوم ہوا کہ رجاء آپ پر ہی گئی ہے۔“ وہ لڑکھوٹا کر انہیں بہت تاؤ آ رہا تھا۔ دونوں کی غیر اہم پر۔ ان کے کہنے پر وہ تہہ بھلا لگا اٹھے۔
”کیا مطلب ہے اس بات سے؟“ وہ مسکراہٹ

دبانے کی سعی کرنے لگے۔
”آپ سے تو کچھ بھی کہنا ہے کار ہی ہے۔“ وہ اب باقاعدہ ناراض ہو کر چہرے پر ٹائٹ کریم لگانے بیٹھ چکی تھیں۔

”سائرہ! پلیز! کم از کم ناراض تو مت ہو۔ پولو کیا بات ہے تم رجاء کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں شاید.....“ وہ بخیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

”میری تو سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کو رجاء کی کن کن باتوں پر توجہ دلاؤں۔ میں کسی بات پر خدشے کا اظہار بھی کرتی ہوں تو آپ کو میری سوچ دیا نوی لگنے لگتی ہے۔“ وہ بہت زیادہ خفا تھیں رجاء سے بھی اور ان سے بھی۔

”یار! کبھی تو رجاء کے علاوہ کسی اور پر بھی نظر کر لیا کرو۔“ وہ پھر غیر بخیدہ دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے گھور کر انہیں دیکھا جہاں بخیدگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کچھ بھی کہنا ہے سود ہے۔

”اب تو مسکرا دو یار مجھے بخیدہ بیوی بالکل اچھی نہیں لگتی۔“ ان کی مسکراتی نگاہوں کا جواب انہوں نے مسکرا کر ہی دیا۔ جانتی تھیں رضا کو بخیدہ رہ کر اپنی بات منوانا ناممکن ہے۔ اور وہ ایسے ہی تھے ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کے عادی۔ ہر بات کو لائٹ لینے والے۔

☆.....☆
”ممما پلیز! آج جانے دیں ناں۔“ وہ آج پھر ان کے سر ہو رہی تھی۔

”رجاء۔“ انہوں نے برہمی دکھائی مگر وہ اپنی ضد پر مصر تھی۔

”ممما پلیز! آج زویا نے سب فرینڈز کی پارٹی رکھی ہے میں نہیں جاؤں گی تو وہ بہت ناراض ہوگی۔“ وہ انہیں ہر طور منانے پر تلی ہوئی تھی۔
”مجھے تمہارے جانے پر اعتراض نہیں ہے رجاء! بات ہوتی ہے وقت کی۔ تمہارے ایگزٹام نزدیک

ہیں اور تمہیں گھومنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔
”مما! کہاں جلدی آ جاؤں گی، ویسے بھی میں رات کو ہی کرتی ہوں اسٹڈی اور رات تک میں واپس بھی آ جاؤں گی۔“ اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔

”اوکے چلی جاؤ مگر جلدی واپس آنا۔“ انہوں نے ہر بار کی طرح ہتھیار ڈال دیئے۔
”تھینک یو ممما۔“ وہ اس کے بائیں گال پر کس کرتی اپنے روم میں تیار ہونے چلی گئی۔

☆.....☆

”رضا! آج آپ جلدی آ جائیں۔“ انہوں نے فون کر کے رضا سے اصرار کیا۔
”کیوں؟“ ہمیشہ کی طرح سوال۔
”آج کہیں کھانے پر باہر چلتے ہیں۔“ انہوں نے وجہ بتائی۔

”تم رجاء کو ساتھ لے جاؤ مجھے آج دیر ہو جائے گی۔“ ان کے انکار پر بہت دل دکھا آج بہت آس سے کہا تھا انہوں نے۔ روز کا یہ ہی رونا تھا۔ رضا ہمیشہ لیٹ آتے اور رجاء کی آئے دن کی باریاں اور کمبائن اسٹڈیز وہ اکیلے رہ رہ کر تھک گئی تھیں اس روٹین سے۔

”پلیز رضا! آج جلدی آنے کی کوشش کر لیں۔“ اس بار وہ التجا کر رہی تھیں۔

”یار! بہت مشکل ہے Next ٹائم۔“ ان کی طرف سے صاف انکار تھا۔

انہوں نے آہستگی سے سیل نیپل پر رکھ دیا۔
”بی بی جی! میں جاؤں اب۔“ خانساں کھانا

پکانے کے بعد ان سے اجازت طلب کر رہا تھا۔
”رحمت بابا! آج کھانا آپ لے جائیں اپنے

گھر۔“ ان کے ایک ایک انداز میں تھکاوٹ سی گئی۔
”مگر کیوں بی بی؟“ وہ حیران پریشان کھڑے

تھے۔ ”سب کھانا کھا کر آئیں گے۔“

”اور آپ بی بی؟“ وہ فکر مند سی ہو لے۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ انہیں جواب دے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رحمت بابا کے جانے کے بعد

انہوں نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کھڑی گاڑی کی جانب آئیں۔ گاڑی لے کر وہ روڈ پر آ تو کئی تھیں

مگر نہیں معلوم تھا کہ جانا کدھر ہے۔ گھر سے انہیں وحشت ہو رہی تھی، گھر کا سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑنا

تھا۔ دماغ کو پرسکون کرنے کے لیے انہوں نے پارک کا رخ کیا۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ پارک

کی تمام لائیں آن ہو چکی تھیں۔ بٹنے مسکراتے کچھ بچے فٹ بال سے کھیلنے میں مگن تھے۔ کتنے بزرگ

اور کتنی ہی خواتین تھیں مگر تنہا کوئی بھی نہ تھا سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کافی دیر تک وہ اس ماحول

سے خود کو بہلائی رہیں پھر اٹھ کر گاڑی کی طرف آ گئیں۔ گاڑی ریٹورنٹ پر لا روکی۔ سر میں شدید

درد اٹھ رہا تھا۔ سو کافی پینے چلی آئی تھیں۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی ان کی نگاہ سامنے والی نیپل پر گئی۔ سامنے

والی پیئیر پر چالیس سالہ شخص قہقہوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ لڑکی کی پشت ان کی جانب

تھی لڑکی کا چہرہ دکھائی نہ دے رہا تھا مگر وہ اسے لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھیں۔ وہ سرعت سے اٹھیں

اور نیپل کی تیزی سے لڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک زوردار پھیر اس کے گال پر نشان چھوڑ

گیا۔ ایک قہر آلود نگاہ انہوں نے اس شخص پر ڈالی جس نے کچھ دیر پہلے رجاء کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”رجاء چلو یہاں سے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑتی تقریباً آدھنی ہوئی گاڑی تک لائیں۔ دروازے کے

لاکھ کھول کر اسے سیٹ پر دھکا دیا اور پھر جلدی سے دوسری جانب سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں گھر پہنچنے

تک انہوں نے کوئی ایک بات بھی رجاء سے نہیں کہی تھی۔ دل و دماغ سن ہوئے جا رہے تھے۔ یہ منظر غیر

یقینی تھا۔ ریٹورنٹ سے گھر تک کے راستے میں ایک

ہزار بار اس شخص کا چہرہ اور اس کا رجاء کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینا لگا ہوں میں گھومتا رہا۔

”کون تھا وہ؟“ گھر آ کر اس نے قدرے دیر سے سوچا تھا۔

”مم.....م.....مما وہ.....“ وہ بدحواس ہو رہی تھی سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ ہوا کیا ہے۔

”بولو کب سے یہ سب چل رہا ہے۔“ اس بار آواز قدرے بلند ہو گئی۔

”ماں باپ کو کب سے بے وقوف بنا رہی ہو بولو۔“ اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر جھجھوڑا

ڈالے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اسے اسی وقت جان سے مار ڈالے۔

”کیا ہوا؟“ رضا ابھی ابھی اندر آئے تھے اندر آتے ہوئے ان کی آواز سن چکے تھے۔

”آپ خود پوچھ لیں اپنی لاڈلی سے۔“ وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کبھی

بے طرح بدحواس ہوتی رجاء کو دیکھ رہے تھے تو کبھی ٹھٹھے میں آئے سے باہر ہوتی سارہ کو۔

”انفیر چل رہا ہے ان کا کسی انکل کے ساتھ؟“ ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے انہوں نے یوں بولا

گویا اس شخص کا غصہ نکال رہی ہوں۔ وہ انکشاف پر ہکا بکا رہ گئے۔

”آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے یہ ہمارے، کبھی کمبائن اسٹڈیز کا بہانہ، کبھی پارٹی کا بہانہ.....

اور ہم ہر بار بے وقوف بنے رہے۔“ انہیں خود پر افسوس ہونے لگا کہ وہ ہی اس کو اجازت دے دیا

کرتی تھیں جانے کے لیے۔
”بولو کون تھا وہ؟“ اس نے غصے سے ایک بار پھر

اسے جھجھوڑا۔
”مم.....م.....مما وہ سر ہیں۔“ روہانی ہو رہی

تھی۔
”سر؟“ تاسف سے انہوں نے سر ہلایا۔

”کب سے چل رہا تھا یہ جکر بولو جواب دو۔“ ان کا دماغ پٹھا جا رہا تھا۔ ایک آگ سی سینے میں دھک

رہی تھی۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ رجاء کا کیا کر ڈالیں۔ وہ خاموش رہیں۔

”تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی اپنی باپ کے عمر کے شخص کے ساتھ عشق لڑاتے ہوئے۔ ایک بار بھی تم

نے نہیں سوچا ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا تے ہوئے۔ اعتبار کرنے کا یہ صلہ دیا تم نے ہمیں۔“ غم و

غصے کی کیفیت میں وہ کبھی غصے میں بلند آواز میں چلانے لگیں تو کبھی رنجیدہ ہو جاتیں مگر اس سارے

معاملے میں رضا بالکل خاموش تھے۔
”آپ پوچھیں ناں اس سے کیوں کیا اس نے

ایسا؟“ اس کے آنسو گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔
”اب کچھ کہتے کیوں نہیں آپ اسے؟“ انہوں

نے رضا کو جھجھوڑا جو شاید صد سے کی کیفیت سے نکل نہیں پارے تھے۔

”آپ کی بی بی دی ہوئی Freedom کا نتیجہ ہے یہ، دیکھ لیا اتنی زیادہ آزادی کا انجام، ہماری

عزت خاک میں ملا دی اس نے۔“ وہ اب نڈھال سی صوفے پر ڈھسے گئیں۔ وہ چپ سادھے

دیکھتے رہے، سنتے رہے۔ پھر واش روم میں چلے گئے واش ٹین کھول کر کتنی ہی دیر ہاتھ دھوتے

رہے۔ منہ دھوتے رہے۔ واش ٹین کے اوپرنگ آئینے سے ان کا عکس دکھ رہا تھا مگر یہ بیرونی عکس

تھا اندرونی چہرے سے تو کوئی واقف نہ تھا۔ وہ کیسے رجاء سے سوال کرتے یا اعتبار کے ٹوٹنے کی

شکایت کرتے۔
ان کے لیٹ آنے کی وجہ 20 سالہ تحریم نیازی تھی

جس کے ساتھ وہ ڈنر کر کے آ رہے تھے۔ ”سارہ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا رجاء ان پر ہی گئی ہے۔ ان میں اور

رجاء میں کوئی فرق نہیں تھا۔“

☆.....☆

کلیج کے رشتے

رہے تھے۔

”جو عورت اپنے ماں باپ کی نہ بن سکی وہ میری اور میری اولاد کی کیسے بن سکتی ہے۔“ آخری وار کرتے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ عانیہ زمین پر ڈھے گئی تھی جس شخص کی خاطر بیس سال پہلے اپنے رشتوں کو ٹکرایا تھا۔ آج اسی شخص نے آسمان سے زمین پر بھیج دیا تھا۔ بیس سالوں کی ریاضتوں کو اس شخص نے انھوں میں ریزہ ریزہ کر دیا تھا جس کی خاطر عمر بھر اذیتیں سہی تھیں آج وہی شخص اپنی اولاد کے غلط راستوں پر چلنے کا مورد الزام اسے ٹھہرا رہا تھا۔ آنکھوں سے ٹپکنے والے موتی ماسی کی یاد میں قطرہ قطرہ پھل رہے تھے۔

☆.....☆

”عانیہ بیٹا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ماماں کی بچکانہ بات پر جلدی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ ”ماما! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں، مجھے احتشام سے نہیں عالیاں سے شادی کرنی ہے۔“ لاؤنج میں بیٹھے سب لوگ اس کی بات پر ششدر رہ گئے تھے۔ ”عانیہ! کیا بد تمیزی ہے یہ۔“ بھیا اس کی فضول بکواس پر دباڑے تھے۔

”بیٹا! تم جانتی ہو کارڈ بٹ چکے ہیں۔ دس دن بعد تمہاری شادی ہے۔ ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔“ ماما نے اسے خود سے لگا کر بہت نرمی سے سمجھایا تھا جب کہ بابا خاموشی سے محض اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے محبوب شوہر کو دیکھ رہی تھی جن کے منہ سے الفاظ نہیں انگارے نکل رہے تھے۔

”عانیہ بیگم! جو رش تم نے اختیار کی تھی آج وہی راستہ میری بیٹی کو دکھا رہی ہو مگر میں تمہیں کبھی ایسا کرنے نہیں دوں گا۔“

”عالیاں! اگر منال خود ہی اس لڑکے کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے تو اس میں میری کیا غلطی ہے۔“ اس نے سخت احتجاج کیا تھا۔

”اچھا.....!“ عالیاں استہزائیہ ہنسنے لگی تھیں۔ ”جب ایک ماں اپنی اولاد کی تربیت کرتی ہے تو سب سے پہلے اسے اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ ہر غلط راستے سے روکتی ہے مگر عانیہ بیگم تم یہ سب کیونکر کرو گی جب کہ تم خود بھی اچھی بیٹی اچھی بہن اچھی بیوی ثابت نہ ہو سکیں تو اچھی ماں کیسے بن سکتی ہو۔“ عالیاں کا زہر میں ڈوبا ہر لفظ عانیہ کے دل میں تیر بن کر اتر رہا تھا۔

”مگر نہیں غلطی تو میری ہے جو تم جیسی عورت سے شادی کر کے اپنی زندگی برباد کر لی۔ ایسی عورت جس نے میرے رشتوں کو مجھ سے چھین لیا اور اب میری اولاد کو مجھ سے جدا کرنا چاہتی ہے۔“ عالیاں کے لفظوں نے اس کو چھلنی کر دیا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے سامنے کھڑے اپنے محبوب کو دیکھا تھا مگر عالیاں تو جیسے پچھلے بیس سالوں کا غبار نکال



MOM & ME

for baby's delicate skin

MOM & ME کی مکمل رینج جدید سائنسی تحقیق کا نچوڑ ہے جو اپنے محفوظ اور نازک بچوں کی نازک جلد کی مکمل نگہداشت کیلئے، ماؤں کی اولین پسند ہے۔

میں ایک ہی خوبصورت بچہ ہے!! جو ہر ماں کے پاس ہے۔

PAKISTAN VIRTU
www.pdfbook



کرنے لگی تھیں۔ بھابی بہت اچھے طریقے سے ملی تھیں اور بھیا بھی ہمیشہ کی طرح بازار سے اس کی پسند کی چیزیں لینے چلے گئے تھے مگر وہ بیس سال پہلے والے بھیا کہاں تھے جو اس پر جان چھڑکتے تھے جو اس کی زندگی کے ہر رنگ سے واقف تھے اور اس کے آنسو پر تڑپ اٹھتے تھے مگر نہیں وہ محبتیں تو اس نے خود کھوئی تھیں، عالیان مرزا کی خاطر ماما، بابا اب اس جہان میں نہیں تھے مگر ان کی مہک پھر بھی ان درود یوار میں رہی بسی تھی۔ وہ اٹھ کر ماما، بابا کے کمرے میں آگئی۔ آج بھی وہ کمرہ ویسا ہی تھا۔ بھیا نے آج بھی ان کی یادوں کو سنبھال رکھا تھا اگر نہیں تھے تو اس کے دنیا کے بیسٹ ماما، بابا نہیں تھے۔ ماما کی ممتا بھری گود نہیں تھی اور بابا کا شفقت بھرا سینہ، آج بیس سال بعد اسے رشتوں کا احساس ہوا تھا تو آج وہ ان کی اہمیت جان گئی تھی۔ آج اپنوں اور غیروں میں فرق سمجھ آ گیا تھا۔ وہ خون کے رشتوں کی مضبوطی اور گہرائی کو جان گئی تھی۔ رشتوں کی مثال نازک آئینوں کی طرح ہوتی ہے اگر انہیں سینت سینت کر رکھا جائے تو ٹھیک ورنہ ذرا سی بے احتیاطی سے اگرچہ وہ ٹوٹتے نہیں مگر ان میں دراڑ ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور پھر لاکھ چاہنے کے باوجود وہ دراڑ مٹ نہیں پاتی، اس کے اور اس کے رشتوں کے درمیان بھی وہ دراڑ آج تک موجود تھی جس کی ذمہ دار وہ خود تھی، اس وقت انہوں نے اس کی خواہش پوری کر دی تھی۔ پورے خاندان میں ان کی عزت و تماشابن کر رہ گئی تھی مگر انہوں نے پھر بھی اس سے تعلق نہیں توڑا تھا مگر ان کی محبتوں میں وہ شدتیں ختم ہو گئی تھیں آج عانیہ ظہیر اپنے اٹھائے گئے اقدام پر تڑپ اٹھی تھی مگر وہ سب واپس نہیں آ سکتا تھا۔ سب ختم ہو چکا تھا آج وہ اس تکلیف دہ مقام پر بالکل تنہا کھڑی تھی۔

☆.....

رہے تھے۔
”مگر ماما! آپ لوگوں کی خاطر میں اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی یہ میرا حق ہے۔“ جو اب وہ بڑی بدتمیز سے بولی تھی۔
”چنانچہ..... خبردار جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ بھیا نے پوری قوت سے اسے پھینک مارا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی۔ پھر بھاگتی ہوئی خود کو کمرے میں بند کر گئی تھی۔ دنیا کی بیسٹ ماما، بابا کو آج اس کے تڑپنے کی کوئی پروا نہیں تھی اور جان چھڑکنے والے بھیا کے پھینکنے سے جیسے توڑ دیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی جن لوگوں کی اس میں جان تھی، وہ آج کس قدر بدل گئے تھے۔
”عانیہ بیٹا! دروازہ کھولو۔“ ماما، بابا کب سے کھڑے دروازہ بجا رہے تھے۔ عانیہ صبح سے دروازہ بند کیے بیٹھی تھی۔ وہ بھلا کب اس کو کھلی دیکھ سکتے تھے۔
”نہیں..... کھولوں گی میں دروازہ اور اگر آپ لوگوں نے میری بات نہیں مانی تو میں خود اپنی جان لے لوں گی۔“ وہ آنسو بھری آواز میں چیختی تھی تو ماما بابا ساکت رہ گئے تھے۔
”ہم تمہاری ہر بات مانیں گے، عانیہ پلیز! باہر آ جاؤ۔“ تھوڑی دیر بعد بابا کی شکستہ سی آواز سنائی دی تھی اور اندر بیٹھی نادان عانیہ ظہیر اپنی فتح پر مسکرا دی تھی پھر اس کی شادی اس کے چچا زاد ارشد شام سے کینسل کر کے عالیان سے کر دی گئی تھی۔ اس نے اپنے عزیز از جان رشتوں پر اپنی محبت کو ترجیح دی تھی۔ ساری عمر عالیان مرزا سے ہر حالت میں نبھاتی تھی اور آج اس شخص نے سب ختم کر دیا تھا۔ بڑے سے خوب صورت گھر کا دروازہ کھولتی عانیہ ظہیر بیس سال بعد وہی عانیہ تھی، جسے اپنے رشتوں سے عشق تھا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ آنکھیں جل تھل

ایسا ہی تارا رشتہ

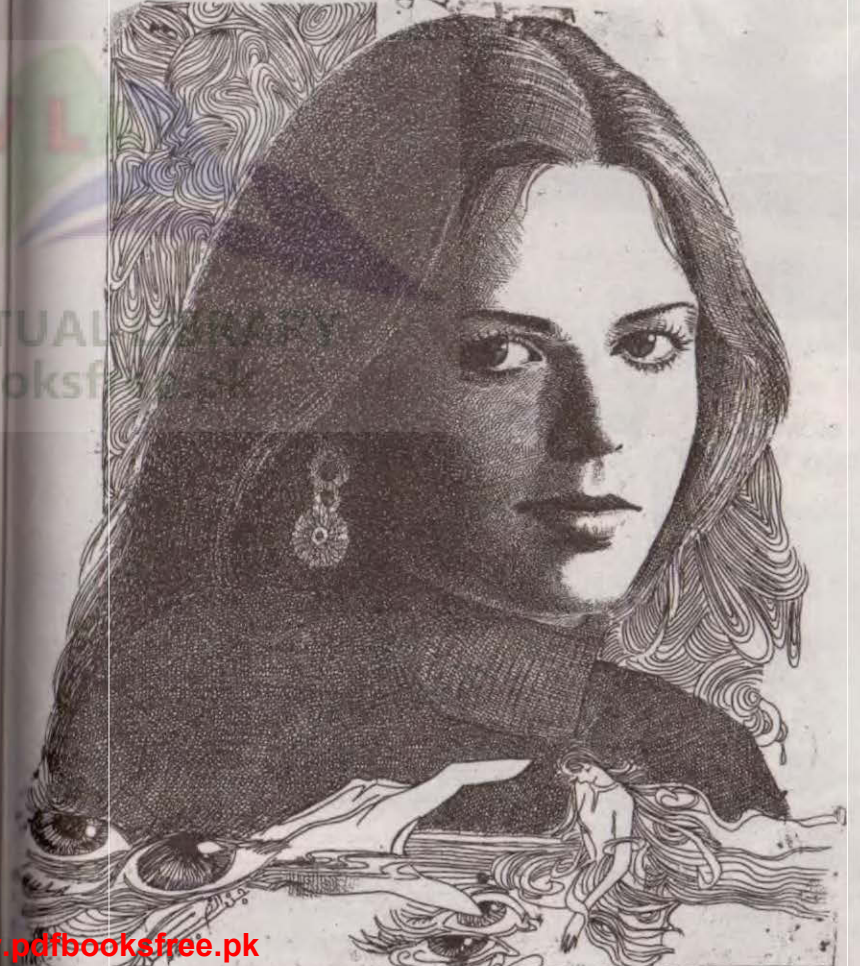
”کیوں چچا! اب آپ کو معلوم ہوا کہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا طعنہ برداشت کرنا کتنا مشکل ہے؟ یقیناً آپ کو اب بہت اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے۔“

”ہے۔“ فضل کی یہ بات سن کر کمرے میں موجود ایک مرد کا سر جھک گیا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ میں نے معاف کرنا کیوں نہیں سیکھا۔ جب کہ دوسرا مرد فضل کو ناگواری سے گھورنے لگا تھا اور وہاں موجود عورت کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

☆.....☆

پچیس سال پہلے امتیاز صاحب اور رضوانہ نے پسند کی شادی کی تھی۔ امتیاز صاحب اور رضوانہ دور پرے کے رشتے دار تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ رضوانہ اپنے والدین کی اکلونی

اولاد تھیں اور بہت ناز و نعم میں پلی بڑھی تھیں۔ امتیاز صاحب کے والدین رضوانہ کا ہاتھ مانگنے گئے تو ان کے والدین نے چند وجوہات کی بنا پر رشتہ دینے سے انکار کر دیا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب رضوانہ کے والدین کو منانے کی ہر کوشش بے کار ہو گئی تو دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔ رضوانہ اس خوش بھی کاشکار تھیں کہ وہ اپنے والدین کی اکلونی اولاد ہیں بعد میں انہیں منالیں کی اور وہ مان جائیں گے کیونکہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ کورٹ میرج



کے بعد امتیاز صاحب رضوانہ کو اس کے گھر چھوڑنے آئے تو صورت حال کا علم ہوتے ہی رضوانہ کے والدین نے دونوں کو اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم سنایا اور اپنے گھر کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔

رضوانہ کے لیے یہ بہت بڑی سزا تھی۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے والدین انہیں اس طرح گھر بدر کر دیں گے۔ بہر حال امتیاز صاحب ان کو لے کر اپنے والدین کے گھر آ گئے۔ ان کے والدین شریف لوگ تھے اور دل سے رضوانہ کو اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے نہ صرف انہیں اپنے گھر کی بہو تسلیم کیا بلکہ اس کے جائز حقوق بھی دیے۔ دونوں نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے لیکن رضوانہ اکثر اندرونی خلفشار کا شکار ہو جاتیں۔ انہیں یہ احساس کچھ کے لگتا کہ انہوں نے والدین کی نافرمانی کر کے اچھا نہیں کیا لیکن پھر امتیاز صاحب کے سمجھانے بچھانے پر نارمل ہونے کی کوشش کرتیں۔

☆.....☆

ان کی شادی کو دو ماہ کا عرصہ گزر گیا تو امتیاز صاحب کا چھوٹا بھائی منیر دس دن کی چھٹی پر لاہور آیا۔ منیر ایک پرائیویٹ بینک میں کام کرتا تھا۔ آج کل اس کی پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی۔ لہذا وہ دو تین ماہ بعد گھر آتا تھا۔ گھر آ کر جب اسے امتیاز صاحب اور رضوانہ کی شادی کی بابت معلوم ہوا تو وہ بہت چراغ با ہوا اور اس نے ”گھر سے بھاگ گئی ہوئی عورت“ کہہ کر رضوانہ کی بہت بے عزتی کی اور اپنے والدین سے مطالبہ کیا کہ وہ اس عورت کو گھر سے نکال دیں ورنہ وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اگلے دن منیر غصے میں اسلام آباد واپس چلا گیا۔ منیر فطرتاً ہی مزاج اور حاکمیت پسند تھا۔ اس کے شدید رد عمل کو دیکھ کر امتیاز صاحب کے والدین نے انہیں اپنے

دوسرے مکان میں شفٹ ہونے کا مشورہ دیا تو وہ دونوں الگ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا لیکن منیر کے دل سے رضوانہ کے لیے کدورت ختم نہ ہو سکی۔ امتیاز صاحب اور رضوانہ کی شادی کے دو سال بعد منیر کی شادی ہوئی۔ اس وقت تک امتیاز صاحب ایک بیٹے فضل کے باپ بن چکے تھے۔ منیر نے شادی کے بعد اپنی بیوی پر بھی یہ پابندی لگائی کہ وہ رضوانہ سے بات چیت اور دوستی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وقت گزرتا رہا اللہ تعالیٰ نے امتیاز صاحب کو دو بیٹے اور دیے اور منیر کو دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا۔ منیر کا سفر لاہور ہو چکا تھا۔ رضوانہ کے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے تھے لیکن انہوں نے مرتے دم تک انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ یہ چیز رضوانہ کو جینے سے جینے نہیں دیتی تھی۔ گزرے بچیس سالوں میں بارہا منیر نے رضوانہ کو اپنے طعنوں اور سخت الفاظ کی مار سے زخمی کیا تھا۔ البتہ منیر کی بیوی اور بچے اس کی عدم موجودگی میں ان سے بہت اچھی طرح ملتے تھے۔ رضوانہ بھی ان کے سب بچوں خصوصاً رابعہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ رضوانہ کے ساس سر نے منیر کی طبیعت کی سختی کی وجہ سے امتیاز صاحب اور رضوانہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی اور ان دونوں خاص کر رضوانہ نے ان دونوں کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ پانچ سال پہلے دونوں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

☆.....☆

اب پچیس سال بعد ان دونوں بھائیوں کی اولادیں جوان تھیں۔ امتیاز صاحب کی خواہش تھی کہ منیر کی بیٹی رابعہ ان کے فضل کی دلہن بنے۔ جب انہوں نے اپنی یہ خواہش اس کے سامنے بیان کی تو وہ بھڑک اٹھا۔

”میں ضرور اپنی بیٹی کی شادی آپ کے بیٹے

سے کرتا اگر وہ اس بے اعتبار عورت کا بیٹا نہ ہوتا۔“ امتیاز صاحب کے پونچھنے پر منیر نے تنکبر سے کہا۔

”تمیز سے بات کرو وہ تمہاری بھابھی ہے۔“ امتیاز صاحب بولے۔

”وہ صرف آپ کی بیوی ہے میری کچھ نہیں لگتی اور بہتر ہے آپ یہاں سے جائیں اور دوبارہ بھی یہ بات کرنے کے لیے یہاں تشریف نہ لائیں کیونکہ میں رابعہ کی بات اپنے دوست کے بیٹے سے تقریباً طے کر چکا ہوں۔ بس رمی اعلان کرنا باقی ہے۔“ منیر کو اپنے الفاظ کی سختی کا احساس تک نہ تھا۔ (نہ جانے منیر یہ بات کیوں بھول جاتا تھا کہ کورٹ میرج کا فیصلہ امتیاز اور رضوانہ دونوں کا تھا۔ پھر قصور وار تھا رضوانہ کیوں تھیں؟)

☆.....☆

امتیاز صاحب دیکھے دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئے تھے۔ یہ سچ تھا کہ اس وقت جذبات میں آ کر دونوں نے کورٹ میرج کرنے کی غلطی کر لی تھی۔ اس وقت انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کا یہ فعل ان کے بچوں کی زندگیوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا۔ یہ بھی سچ تھا کہ رضوانہ پر اسے کردار کی عورت نہیں تھیں۔ بس یہ غلطی کر بیٹھی تھیں اور آج تک اپنی اس غلطی پر پشیمان ہی تھیں کہ انہوں نے اپنے والدین کی عزت کا خیال کیوں نہ کیا؟ کیوں خود غرض ہو گئی تھیں؟ کیوں انہوں نے اپنے والدین کو منانے کی بھرپور کوشش نہ کی؟ وہ نماز شب میں اللہ سے اپنے والدین کا مان اور دل توڑنے پر معافی کی خواستگار رہتی تھیں۔

☆.....☆

اتوار کا دن تھا۔ امتیاز صاحب ناشتے کے بعد اخبار پڑھ رہے تھے کہ ان کا موبائل فون بجنے لگا۔ انہوں نے چیک کیا تو منیر کی کال تھی۔ اس روز کی کلامی کے بعد نہ تو وہ اس کے گھر گئے تھے اور نہ

ہی انہوں نے اسے فون کیا تھا۔ اب اس کی کال آئی تو اس نے انہیں فوراً گھر آنے کو کہا۔ وہ وہاں پہنچے تو انہیں منیر بہت پریشان نظر آیا۔ اس کی بیوی تو باقاعدہ رورہی تھی۔ منیر نے امتیاز صاحب کو بتایا کہ رابعہ کل یونیورسٹی گئی تو ابھی تک واپس گھر نہیں پہنچی۔ یہ سن کر امتیاز صاحب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دونوں بھائیوں نے مل کر ہر ممکن جگہ پر اسے تلاش کیا لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

محلے والوں کو رابعہ کی گمشدگی کی بھنک پڑی تو کچھ لوگوں نے یہ بات پھیلا دی کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ لوگوں کی زبانیں کون پکڑ سکتا ہے حالانکہ پورا محلہ یہ بات جانتا تھا کہ وہ بہت شریف اور باکردار لڑکی ہے۔ اس کی بائیس سالہ زندگی ان لوگوں کے سامنے تھی مگر پھر بھی لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے۔

یہ رابعہ کی گمشدگی کے تیسرے روز کی بات ہے کہ منیر کے موبائل پر صبح ایک خاتون کی کال آئی کہ آپ کی بیٹی خیریت سے ہے۔ تھوڑی دیر میں آپ کے پاس ہوگی۔ تقریباً نو ساڑھے نو بجے ایک گاڑی منیر کے دروازے پر آ کر رکی اور اس میں سے پچیس چھپن سال کی عمر کا ایک مرد، انتیس تیس سالہ ایک لڑکی اور رابعہ اترے۔ رابعہ کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے نیل بجائی۔ منیر اور اس کی بیوی دونوں باہر آئے اور رابعہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ منیر نے اس آدمی اور لڑکی کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

”پرسوں دو پہر کو آپ کی بیٹی میری بیٹی کی گاڑی سے نکل کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ میری بیٹی ڈاکٹر ہے وہ اسے اپنے اسپتال لے گئی جہاں اس کی حالت کے پیش نظر اسے امیرجنسی میں داخل کر لیا گیا تھا لیکن روڈ سے اسپتال تک آنے کے دوران آپ کی بیٹی کا بیک کوئی

اٹھا کر لے گیا۔ آپ کی بیٹی بے ہوش تھی اور ہمارے پاس آپ لوگوں کو تلاش کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسے صبح چار بجے کے قریب ہوش آیا اور تقریباً چھ بجے تک اس کے حواس بحال ہوئے تو یہ آپ کا موبائل نمبر اور اپنے گھر کا پتہ بتانے کے قابل ہوئی۔ لہذا اب میں اپنی بیٹی کے ساتھ اسے چھوڑنے آیا ہوں تاکہ آپ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ یہ دن آپ نے جس اذیت میں گزارا ہے اس کے لیے ہم باپ بیٹی دونوں آپ سے معافی چاہتے ہیں۔“ وہ آدمی بہت سلجھے ہوئے انداز میں بات کر رہا تھا۔

”کوئی بھی مسئلہ ہو تو آپ لوگ ہمیں فون کر لیجے گا۔“ اس آدمی کی بیٹی نے اپنا وینٹک کارڈ نکال کر منیر کو پکڑا دیا اور دونوں باپ بیٹی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆.....☆

جیسے ہی رابعہ کے واپس آنے کی اطلاع محلے میں پھیلی تو محلے کی چند ٹوہ لینے والی عورتیں ہمدردی کی آڑ میں اس کو اپنی باتوں سے زخمی کرنے لگیں۔ کچھ نے اس بات کا اعتبار کیا کہ اسے واقعی کوئی حادثہ پیش آیا تھا اور کچھ نے اس بات کو نمک مرچ لگا کر پھیلایا اور اس کی خوب کردار کشی کی۔ آخر کو ایک کنواری لڑکی دو راتیں گھر سے غائب رہی تھی یہ کوئی معمولی بات تھی۔ اس صورت حال سے رابعہ تو بالکل ہی بے حال ہو گئی اور منیر باہر نکلتا تو لوگوں کی زبانیں اسے بلوہان کرنے لگیں۔ رابعہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار گردانی جانی۔ منیر کے دوست نے اسی بات کو بنیاد بنا کر رشتے سے انکار کر دیا۔ رضوانہ، منیر کے رویے کی وجہ سے بہت کم اس کے گھر جاتی تھیں۔ آج جب وہ امتیاز صاحب کے ساتھ اس کے گھر آئیں تو وہ رابعہ کو دیکھ کے کٹ کر رہ گئیں۔ انہوں نے اسے گلے

سے لگا کر اس کے سر پر پیار کیا تو وہ انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی۔ رضوانہ نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اور کافی دیر اسے اپنے ساتھ لگائے بیٹھی رہیں۔ رضوانہ اور امتیاز صاحب نے دوبارہ منیر کے سامنے رابعہ کے لیے اپنی جھولی پھیلانی۔ اب حالات کچھ ایسے تھے کہ منیر کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ لہذا اس نے ہامی بھرنی۔ ایک ماہ بعد فضل اور رابعہ کی شادی ہونا قرار پائی تھی۔

☆.....☆

آج امتیاز صاحب اور منیر اسی سلسلے میں کچھ مشورہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے اور رضوانہ ان کے لیے جانے لے کر کمرے میں آئی تھیں۔ جب ان کا بیٹا فضل کمرے میں داخل ہوا اور منیر سے کہنے لگا۔ ”کیوں چچا! اب آپ کو معلوم ہوا کہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا باپ کہلانا کتنا اذیت ناک ہے؟ بھاگی ہوئی عورت کا طعنہ برداشت کرنا کتنا مشکل ہے؟ یقیناً آپ کو بہت اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے بلکہ گھر سے باہر جا چکا تھا۔

رات کو جب فضل واپس گھر آیا، رضوانہ لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ فضل وہیں چلا آیا اور ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا لیکن انہوں نے اس کے آنے اور اپنے ساتھ بیٹھنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ مسلسل کسی گہری سوچ میں کمر رہیں۔ اس کے پکارنے پر انہوں نے بڑی الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ تڑپ اٹھا۔

”کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”فضل! امتیاز صاحب اور میں نے رابعہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ ہم اس معصوم بیٹی کو بدکرداری کے طعنوں سے بچائیں لیکن تم تو خود

بقرمانے والے ہجوم میں کھڑے ہو۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ تم نے اپنے چچا سے اس طرح کی بات کہی۔“ انہوں نے ناراضی سے کہا۔

”گویا ہم تینوں بھائیوں کے ہوش سنبھالتے ہی آپ اور ابو نے ہمیں بتا دیا تھا کہ آپ لوگوں کی شادی کس طرح ہونی چاہی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کا اور ابو کا فیصلہ درست تھا لیکن اس کے باوجود میں نے چچا کی آنکھوں میں آپ کے لیے ہمیشہ جو غفرت اور حقارت دیکھی ہے وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کئی بار میرے سامنے انہوں نے آپ کو گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی بدکردار عورت کہا۔ اس لیے آج میں نے یہ سب کہہ کر چچا کو یہ احساس دلایا ہے کہ ماں یا بیٹی کے حوالے سے کوئی بھی طعنہ جھیلنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔“ اس نے گویا ماں کو اپنی اس بیزاری کی دلیل دی تھی۔

”فضل! ہمیں اپنے چچا کو معاف کر دینا چاہیے تھا وہ تو پہلے ہی لوگوں کے طعنوں سے چھلنی ہے رہی سہی کسر تم نے پوری کر دی۔“ ان کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

”انہوں نے آج تک آپ کو معاف نہیں کیا تو میں کیسے معاف کر دیتا؟“ وہ ابھی بھی اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

”اچھا بس کرو اب، صبح اپنے چچا کے پاس جاؤ اور ان سے معافی مانگو اور ایک بات مجھے سچ بتاؤ تم رابعہ سے شادی کرنے پر دل سے راضی ہو ماں؟“ انہوں نے اس کا جواب سے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

”اگر راضی نہیں ہو تو بتاؤ میں رابعہ کی شادی رحمن سے کروادوں گی کیا ہوا جو وہ اس سے ایک سال پہلے وہ میرا بہت اچھا اور احساس کرنے والا بچہ ہے۔“ رضوانہ نے بات ختم کی۔

”ای میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں رابعہ سے

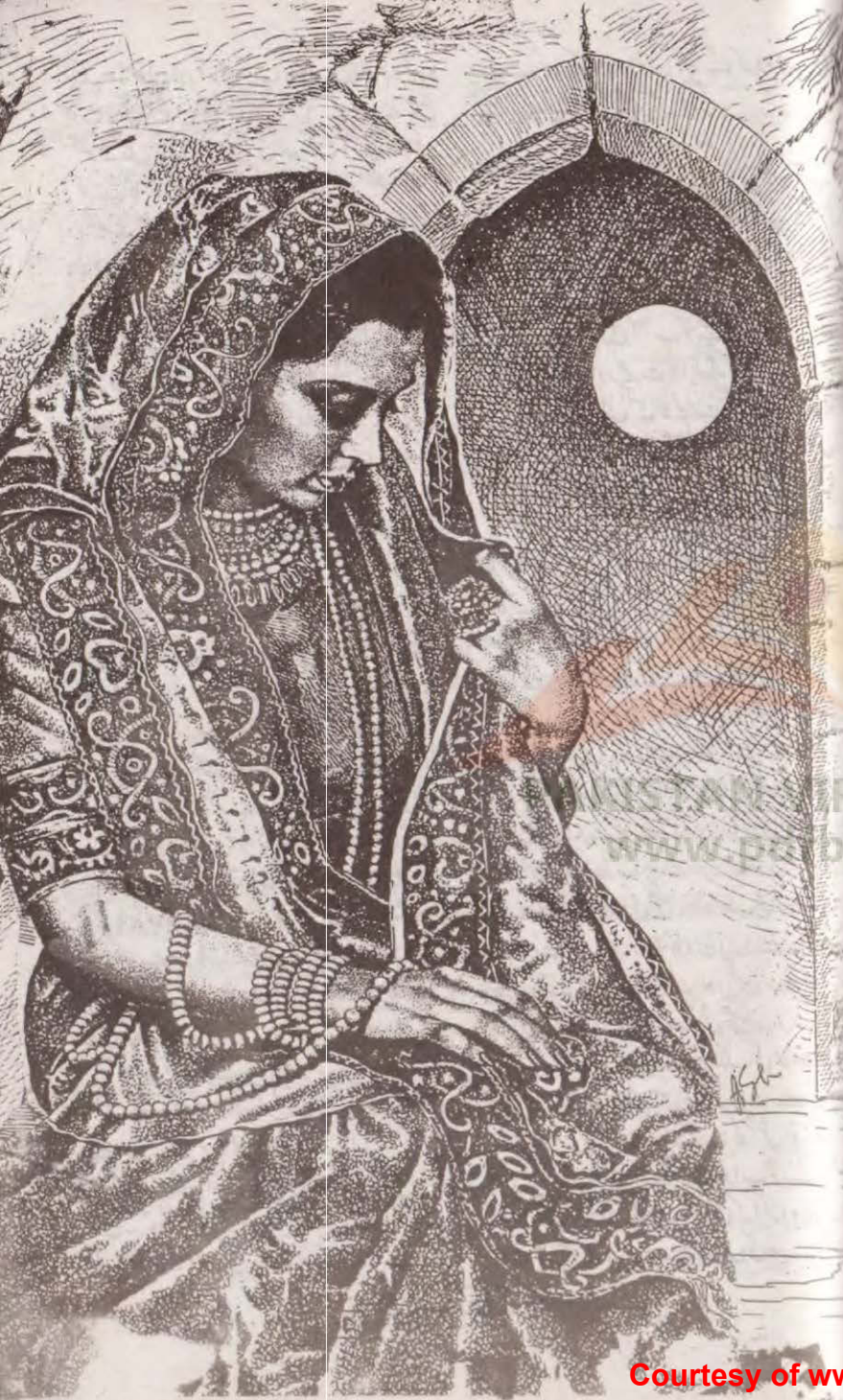
شادی نہیں کروں گا؟“ وہ رابعہ کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ ماں کی اس بات پر انہیں شکی نظر آ رہا تھا۔

”لیکن ایک بات یاد رکھنا فضل اگر تم نے شادی کے بعد رابعہ کو اس حادثے کے حوالے سے بھی تنگ کیا یا کوئی بھئی دکھ پہنچایا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بیٹا داغ دار کردار کا طعنہ برداشت کرنا خاص طور پر ایک عورت کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ میں کسی حد تک قصور وار تھی لیکن اس کے باوجود میرے لیے یہ طعنہ ناقابل برداشت ہو جاتا تھا تو اس بے گناہ کے بارے میں سوچو کہ وہ یہ طعنہ سن کر کس تکلیف سے گزرتی ہوگی۔ بیٹا! اللہ غلطی پر نادم ہونے والوں کو معاف کر دیتا ہے لیکن ہم لوگ کبھی کسی کی غلطی کو معاف نہیں کرتے مرنے کے بعد بھی نہیں۔ بلکہ ہم تو دوسروں کو ناکردہ گناہوں اور غلطیوں کی سزا بھی دیتے ہیں۔ نہ جانے ہم لوگ اتنے سنگدل کیوں ہو جاتے ہیں۔“ رضوانہ نے گلو گہرے لہجے میں کہا۔

”میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چچا سے معافی بھی مانگ لوں گا اور رابعہ کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔“ اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ فضل جا چکا تھا اور رضوانہ نے سکون سے آنکھیں موندھ لیں۔ رضوانہ رابعہ کی آڑ لے کر منیر سے اپنی بے عزتی کا خوب بدلہ لے سکتی تھیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ خود چوٹ کھائے ہوئے تھیں۔ ان کے دل نے رابعہ سے احساس کا رشتہ استوار کر لیا تھا جو سب رشتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی رشتے کے حوالے سے انہوں نے منیر کو معاف کر کے رابعہ کے زخموں کا مرہم بننے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆.....☆

راہِ الفت



”میری خواہش ہے میرے سب اسٹوڈنٹ آرمی جوائن کریں۔ ملک کے محافظ بنیں کیا آپ سب میری یہ خواہش پوری کریں گے مگر سچے دل اور اپنی مرضی سے کسی پر میں اپنی خواہش زبردستی مسلط نہیں کرتا چاہتی۔“ وہ روزانہ کسی موضوع پر تبصرہ کیا کرتی تھی۔ آج کا موضوع ”پاک آرمی“ پر تھا وہ جوش و جذبے سے ملک یا پاکستان کے بارے میں دیر تک بول سکتی تھی۔ چند ایک کے علاوہ سب نے مثبت جواب دیا تھا۔ اسے خوش محسوس ہوئی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیابی پا رہی ہے۔ وہ بہت سے بچوں کو اچھا انسان اور محب وطن بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کو پاکستان کا پاسان اور محافظ بننے کی تلقین کرتی رہتی تھی جو وہ خود نہ بن پائی تھی اپنے شاگردوں کو بنانا چاہتی تھی۔ وہ اب پھر سے پر عزم دکھائی دیتی تھی۔

☆.....☆

وہ ٹیٹ میں ناکام ہوئی تو بے حد روئی، ہر وقت کمرے میں بند رہتی، اسے یقین نہ آتا، وہ زندگی سے مایوس ہو گئی تھی۔ اسے لگتا اب زندگی جینے کا مقصد ختم ہو گیا۔ کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کا زندگی میں صرف ایک خواب تھا وہ بچپن سے یہ ہی خواب دیکھا کرتی۔ وہ عام لڑکیوں سے مختلف تھی اسے بناؤ سنگھار سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس کے کھلونوں میں گڑیا نہیں بلکہ

”میرے جسم پر لگنے والی یہ معمولی چوٹیں میری روح کو مزید تقویت بخشتی ہیں۔“ فرہادی بات سن کر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس سے بولا مگر مضبوط اور پختہ لہجے میں۔

”تم صرف اتنی سی چوٹ سے ڈر گئے؟ میں تو سینے پر گولی کھانے کے ارادے سے آیا ہوں، مجھے یہ چوٹیں ڈرا نہیں سکتیں، میرے حوصلے پست نہیں کر سکتیں۔ میرے حوصلے بے حد بلند ہیں اس پاک وطن پر میں سو بار قربان میرے بھائی۔“ لالک جان نے فرہاد کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ کتنا کم ہمت نکلا۔ بزدل نکلا۔ یہ الفاظ اس کے دل پر کوڑے برسائے لگے تھے۔ لالک جان بے حد بہادر، نڈر، حوصلہ مند اور نیک سیرت کے علاوہ خوب رو نو جوان تھا۔ اس کی ہمت و جنوں دیکھ کر فرہاد ہوش میں آیا، اس کے کچھ دیر پہلے کہے گئے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”میں تو یہاں سے جانے کی سوچ چکا ہوں۔ اتنی سخت ٹریننگ، میرا سارا جسم درد سے تڑپ اٹھا ہے۔ تم بھی میری مانو کھسو یہاں سے، آرام سے آزادی میں زندگی بسر کریں گے۔“ فرہاد کے ان الفاظ سے لالک جان کو دلی دکھ ہوا تھا۔ ان کو پاکستان آرمی جوائن کیے ابھی کچھ ماہ گزرے تھے۔

☆.....☆

ٹینک، پستول اور آرمی کپ، شوز یونیفارم وغیرہ اور تاریخی جنگوں کی کتابیں اس کے کمرے میں محفوظ تھیں اس کو جنون کی حد تک آرمی جوائن کرنے کا شوق تھا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہ ٹیسٹ میں پاس نہ ہو پائی جسمانی کمزوری کی وجہ اس کا ”شوق“ شوق بن کر رہ گیا۔ یوں ہی دن مایوسی میں گزر رہے تھے۔ ماما، بابا سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا نہ کہیں آتی جانی تھی۔ ایک دن وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی وہاں کا منظر اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔ ایک لڑکی گاؤں کے کسی اسکول میں درخت کے نیچے بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ وہ بچوں کو پاکستان کے حالات اور اس کی حفاظت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ایک غریب گاؤں کا منظر تھا۔ اس کے ذہن میں مختلف مثبت سوچیں آنے لگیں۔ وہ کچھ سوچ کر فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔

☆.....☆

”ماما، بابا میں جاب کرنا چاہتی ہو اسکول میں۔“ ناشے کی ٹیبل پر اس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ ”ہاں..... ہاں ضرور میری جان کیوں نہیں۔ ہم تو خود یہ ہی چاہتے ہیں تم فارغ نہ رہو گھر سے بھی باہر جایا کرو، تم نے تو خود کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔“ ماما نے خوشی کا اظہار کیا کہ وہ کچھ تو کرے فارغ رہنے سے اس کی حالت قابل رحم ہو گئی تھی۔

”اچھا فیصلہ ہے بیٹا! مگر آپ میرے ساتھ آفس کیوں نہیں جوائن کر لیتیں؟“ بابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بابا! میں آرمی اسکول جوائن کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے گویا ہوئی۔ اس کی بات پر ماما بابا نے ایک

دوسرے کو دیکھا وہ دونوں سمجھ گئے کہ وہ اب اس فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہوگی۔

☆.....☆

”مس کرن شجاع! کیا آپ جانتی ہیں آپ کو حسن کارکردگی کا تمغہ دیا جائے گا۔ آپ کی اعلیٰ کارکردگی پر۔“ مس روبینہ کے کہنے پر وہ الرٹ ہوئی۔

”اچھا..... ربی! آپ کو کیسے پتا چلا؟“ کرن شجاع نے خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں آفس میں کسی کام سے گئی تھی تب سر اور میڈم اس بارے میں ڈسکس کر رہے تھے۔“ روبینہ نے تفصیل بتائی۔

کرن شجاع کو لگا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ سارے اسٹاف اور پرنسپل نے اس کی کارکردگی اور جذبہ ہمت کی داد دی تھی۔ اسکول کے اکثر معاملات اس کے سپرد کر دیے جاتے، جو وہ نہایت نظم و ضبط اور آسانی سے کر لیا کرتی تھی۔ اسکول کی ایک تقریب میں اسے حسن کارکردگی کا تمغہ دیا گیا، کرن شجاع کو اس اسکول میں سات سال ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ شاگرد آرمی جوائن کر چکے تھے جن میں جذبہ، ہمت اور بہادری اس کے کوٹ کوٹ کھرہ دی تھی۔ وہ سب نہایت ایمان دار ثابت ہوئے۔ آج کا دن اس کے لیے بہت خاص تھا۔ اس نے محنت اور لگن سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

”کیا ہوا جو میں باڈر پر ملک کی محافظ نہ بن سکی مگر یہاں اسکول میں رہ کر بہت سے بچوں کو وطن عزیز کا محافظ بنانے کی کوشش تو کر سکتی ہوں۔“ آج پہلی بار وہ اپنے خواب ٹوٹنے پر شکوہ کنٹا نہیں بلکہ شکر ادا کر رہی تھی کہ اگر وہ یہاں نہ ہوتی آج تو بہت سے بچے جو اس کی وجہ سے آرمی

میں گئے محروم رہ جاتے۔ اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

”اللہ پاک جو کرتا ہے درست کرتا ہے ہم ہی سمجھ نہیں پاتے۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆

”کرن بیٹا! آپ کی میڈم محمودہ آئی ہیں۔“ ماما نے اسے کمرے میں آکر اطلاع دی وہ حیران ہوئی کیونکہ آج پہلی بار وہ ان کے گھر آئی تھیں۔ ”اچھا! خیریت تو ہے ٹھیک ہے ماما میں ابھی آتی ہوں۔“ کرن بیڈ پر بکھری کتابیں سینے لگی۔ اس کے روم میں تاریخی کتابوں کا انبار تھا۔ ہر چیز سلیقے سے پڑی تھی۔ پاؤں میں سلیپر پہنتی وہ لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

”میں خاص مقصد کے لیے آئی ہوں۔ میری بہن کا بیٹا آرمی میں ہے میں اس کا رشتہ کرن کے لیے لے کر آئی ہوں۔ دراصل کرن بہت پیاری سمجھ دار اور بہادر لڑکی ہے۔ لالک جان بے حد ایمان دار اور بہادر سپاہی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے مناسب ہیں۔ بلکہ بہترین ہیں۔ آپ لوگ سوچنے کا ناظم ضرور لیں مگر مجھے یقین ہے آپ کی طرف سے مثبت جواب آئے گا۔“ میڈم محمودہ ماما سے محو گفتگو تھیں ان کے چہرے پر امید بھری مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆

کرن لالک وارڈ روب کھولے اس کا یونیفارم نکال رہی تھی۔ جب وہ تولیے سے بال صاف کرتا واش روم سے برآمد ہوا۔ وہ پلٹی تو لالک جان اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ کرن ٹکراتے پچی وہ مسکرا دیا۔

”آپ کا یونیفارم۔“ کرن نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس نے یونیفارم پکڑ کر اس کو سائڈ پر رکھا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ”سنو! میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم جیسی باشعور، خدمت گزار، عزت کرنے والی بہادر اور ہر لمحہ مجھے سپورٹ کرنے والی شریک حیات میرا مقدر بنی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اعتراف کر رہا تھا۔ کرن محبت سے اس کا چہرہ تک رہی تھی۔

”خوش نصیب تو میں بھی بہت ہوں کہ مجھے آپ لے ایک عظیم سوچ رکھنے والے بچے اور دوسروں کے لیے جینے والے۔“ نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پاس رکھی آرمی کپ اٹھا کر جو ستاروں سے چمک رہی تھی اس کے سر پر پہنادی وہ مسکرا دیا۔ لالک جان نے اپنے سر سے آرمی کپ اتار کر کرن لالک کے سر پر رکھی تو وہ شدت جذبات سے رو پڑی، ابھی یہ کپ پہننے کا خواب تھا اس کا جو آج پورا ہو گیا اسے اپنے شریک حیات پر فخر ہوا۔

”ارے..... رو کیوں رہی ہو پلگی، جب میں تمہارا ہوں تو یہ کپ بھی تمہاری ہوئی ناں۔“ لالک جان نے اس کے ہاتھ نرمی سے تھام لیے۔ وہ اس کا خواب جان چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر لالک جان کو دیکھا۔

”ایک در بند ہوا تو دوسرا کھل گیا میں نہیں تو آپ سہی۔“ وہ مشکور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اور میرے بعد ہمارے بچے۔“ وہ شرارت سے گویا ہوا تو کرن ہلش ہوئی۔ لالک جان ہنس دیا۔ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی۔

☆.....☆

نائلہ طارق

مکمل ناول

الکھنڈ کا دل و دھڑکن

حدنگاہ تک برف کی سفید چادر نے ناہموار زمین کو اپنے نیچے چھپا رکھا تھا، رات کی گہری خاموشی میں



اونچے اونچے گھنے درخت ساکت کھڑے تھے، ان کی ٹہنیاں اور پتے روئی کے گالوں جیسی برف سے ڈھکے ہوئے تھے، شاید کچھ گھنٹوں پہلے برف باری ہوئی تھی مگر اس سے آسمان بالکل صاف تھا، آب و تاب سے چمکتا پورا چاند ہر منظر کو اس حد تک واضح کر رہا تھا کہ تار کی کانام و نشان تک نہ تھا، وہاں نہ تھی، جنگلی حد درجہ تھی، خوابناک سناٹا ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔

گہرے سیاہی مائل نیلے آسمان پر ٹٹماتے ستاروں کے جھرمٹ ماحول کے سحر کو مزید پُر اثر بنا رہے تھے، یکا یک اس پرسکون ماحول کو ایک بے چنگم سی آواز نے توڑنا شروع کر دیا تھا، آواز آہستہ آہستہ بڑھتی شور مچا رہی تھی، تب ہی آسمان پر ایک لہراتا، مل کھاتا فوکر نمودار ہوا تھا، وہ جس رفتار سے بچھا آ رہا تھا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یقیناً اس کے انجن میں خرابی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ پائلٹ کے کنٹرول سے باہر نکل چکا ہے اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہی ہوا تھا، جو صاف ظاہر تھا، ماحول کا سکون درہم برہم کرتا فوکر ایک دھماکے سے برف کی دبیز تہ سے ٹکراتا، درخت کے ساتھ جا لگا تھا، چند لمحوں تک انجن کا بھیانک شور جاری رہا تھا اور پھر دوبارہ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ مگر اس بار یہ سناٹا خوابناک نہیں تھا، سحر ٹوٹ چکا تھا، چھایا سکون بہت عجیب تھا۔

☆.....☆.....☆

چھوٹے سے کمپ کے اندر اتنی جگہ تھی کہ تین سلیپنگ بیگز اس میں آسانی سے سما گئے تھے، اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹی وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی، لیپ کی درہم روشنی میں اس نے ایک نظر دونوں بچیوں پر ڈالی تھی، جو سفر اور تفریق کی جھلک کے بعد اب گرم بستر میں پرسکون نیند سوئی ہوئی تھیں، ان دونوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ چند دنوں میں ہی ان معصوم بچیوں سے کتنا گہرا لگاؤ ہو گیا تھا، اور یہ بچیاں بھی اس سے کس قدر

مانوس ہو گئی تھیں کہ اس کے بغیر رہتی ہی نہ تھیں، حالانکہ ان دونوں سے اس کا رشتہ بس اتنا ہی تھا، کہ وہ ان کی گورنس تھی، ان کے ساتھ ساتھ ان کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ گہری سانس لے کر وہ اٹھ بیٹھی تھی، عجیب سی وحشت اور بے چینی نے اسے گھیر لیا تھا، قریب ہی ایک دوسرا کمپ بھی تھا، جہاں ان بچیوں کے ماں باپ موجود تھے، یقیناً وہ دونوں بھی سوچے تھے اسی لئے تو ان کے کمپ سے کوئی آواز نہیں انہر رہی تھی۔ تقریباً ایک ماہ پہلے اسے بہت دقتوں اور پارے مارے پھرنے کے بعد گورنس کی یہ جا ب ملی تھی، تنخواہ معقول تھی، ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں، بچیوں کی ماں اس کی ذرا سی غلطی بھی برداشت نہیں کرتی تھی اور بچیوں کے باپ سے اس کی لافلتی اور سردمہری برداشت نہیں ہوتی تھی، یہ سب اس کے لیے برداشت کرنا ایک جمجوری تھی کیونکہ پہلی بار اسے ایسی نوکری ملی تھی جہاں رہنے کے لئے اسے گھر کی چھت بھی میسر تھی، دو پیاری پیاری بچیوں کی محبت اسے ملی تھی بچیوں کے ماں باپ سارا دن اپنی جا ب کی وجہ سے گھر سے باہر رہتے تھے، اس دوران وہ سیاہ سفید کی مالک ہوئی، بچیوں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، ان کو وقت پر کھانا کھانا، اسکول بھیجنا، ان کو پڑھانا، ان کے ساتھ کھلانا، ان کی شرارتوں پر ہنسیا یہ سب اسے ہر غم بھلا دیتا تھا، تنہائی سے اسے نجات مل گئی تھی، دونوں بچیاں جڑواں تھیں، ان کی ماں کے لیے انہیں سنبھالنا اور جا ب بھی کرنا مشکل تھا، لہذا گھر اور بچیوں کے لیے وہ ہمیشہ گورنس کی ہی ضرورت مند رہی تھی، بچیوں کی ماں سے اس نے نہیں پوچھا تھا کہ اس سے پہلے جو گورنس تھی، اس نے نوکری کیوں چھوڑی؟ اسے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، ایک ماہ میں وہ بچیوں کے باپ سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی، اس سے پہلے جیسی گورنس بھی نوکری چھوڑ گئی ہوں گی یا تو بچیوں کے باپ کی وجہ سے یا پھر بچیوں کی

ماں نے ان کو نکالا ہوگا، آخر کار وہ بھی تو اپنے شوہر کی عادات و اطوار سے واقف ہوگی، اسی لئے تو وہ عورت اب اس پر بھی کڑی نگاہ رکھتی تھی، شوہر کے سامنے وہ کچھ زیادہ ہی اس کے ساتھ جتنی سے پیش آتی تھی، حالانکہ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ بچیوں کے باپ کی موجودگی میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہے، ان بچیوں کے ساتھ بہت خوش باش کرنا، مکررات ہوتے ہی کتنی سانپ اسے اپنے ارد گرد سرسراتے گھومنے ہوئے لگتے تھے، وہ کب تک ان کے زہر سے ڈر کر بچا سکتی تھی، اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کب تک وہ ان حالات کا مقابلہ کر سکتی ہے، وہ بہت کمزور تھی، لہذا میں سختیاں برداشت کرتے کرتے وہ واقعی اب کمزور ہو چکی تھی، گھنٹوں سے چہرہ ٹٹائے وہ یکدم ہلکی سی کمپ کی دیوار پر اسے ایک سایہ نمودار ہوتا دکھائی دیتا تھا، خوف سے اس کے دل کی دھڑکن رکنے لگی تھی، فکرتھا کہ اس نے کمپ کے داخلے کی زپ کھار کر اسے پہلے ہی بند کر دیا تھا، ورنہ اس سانپ کو اندر داخل ہونے سے وہ نہیں روک سکتی تھی، اس کے کانوں سے مانوس آواز نکلتی تھی، وہ اپنی بچیوں کو پکار رہا تھا۔

”بچیاں سو چکی ہیں“۔ گھبراہٹ میں وہ لاسو سے سمجھے بولی گئی تھی۔ مگر اگلے ہی پل اپنی بے ہوشی پر اس نے سر پکڑ لیا تھا، اگر وہ بالکل خاموش رہتی تو یہ فطرہ نکل سکتا تھا، مگر اب وہ وحشت زدہ نظروں سے اسے سائے کو تک رہی تھی جو رینگتا ہوا اس کے اگلے دائیں جانب آ گیا تھا، دھڑکنے، دل کو سنبھالتی وہ ٹوٹتی سننے لگی تھی۔ درمیان میں صرف ایک کمزور آواز ابھی جسے چاقو سے کاٹ کر بھی وہ اس تک پہنچ سکتا تھا۔

”لیکن ایسا وہ نہیں کر سکے گا“۔ بچیوں کی آواز ابھی نے ایک حفوظہ کا احساس اسے بخشتا تھا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ بچیاں سو چکی ہیں، میں تم

سے ہی بات کرنا چاہتا تھا“۔ سرسراتی آواز اس کے کانوں سے نکلتی تھی۔

”سنو! بہت ترسا چکی ہو تم مجھے، میرا صبر ختم ہو چکا ہے، میں تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کرنا چاہتا، میری بات مان لو، ساری آسائشیں تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا، اچھا گھر دوں گا، روپیہ، زیور جو مانگو گی دوں گا“۔

”اور جب دل بھر جائے گا تو سڑک پر پھینک دو گے“۔ وہ غراٹھی تھی۔

”یہی قیمت ہے تمہاری نظر میں ایک عورت کی؟ مجھ سے پہلے ایسی کتنی سودے بازیاں کر چکے ہو؟“

”بکواس مت کرو“۔ کھسائی آواز ابھری تھی۔

”میں اب اور تمہاری منت سماجت نہیں کروں گا، تم جیسی بے سہارا اور گلے گلے کی نوکریوں کی محتاج عورتوں کو ایسی سودے بازیاں کرنی پڑتی ہیں، بھی اپنی خوشی سے اور میری زور زبردستی سے۔ تمہیں بھی پیاری زبان سمجھ نہیں آتی، اپنی ضد نہیں چھوڑ دو گی تو ذلیل و خوار ہوگی، بہت گھمنڈ ہے تمہیں اپنی پاکبازی پر مگر میں بھی تمہیں مجبور کر دوں گا کھٹے کھٹے بڑے“۔ ابھرنی زہریلی آواز میں کچھ ایسی خشکی تھی کہ وہ فکرت کر رہ گئی تھی۔

”میرا مزید وقت برباد نہ کرو، مجھے بتاؤ کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ کیا کرنا چاہتی ہو؟ یاد رکھو مجھ تک آنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے تمہارے پاس“۔

”ایک راستہ اور ہے اور وہ یہ کہ میں اسی وقت شور مچا کر تمہاری بیوی اور بچیوں کو تمہارا بھیا تک چہرہ دکھا دوں“۔ سائے کو گھوڑی وہ لرزتے لہجے میں بولی تھی۔

”شوق سے مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، میری بیوی صرف اس بات کا یقین کرے گی، جو میں اسے بتاؤں گا“۔ استہزاء سے لہجہ پر وہ بمشکل ضبط کر رہی تھی۔

”پھر بھی تم ایسی بیوی کو دھوکہ دینا چاہتے ہو؟

تمہیں اپنی مصوم بچیوں پر بھی ترس نہیں آتا؟ کس طرح تم ان کو اپنا مکروہ چہرہ دکھاتے ہو؟“ وہ غصیلے لہجے میں بولی تھی۔

”میں ان کے ساتھ کوئی نا انسانی نہیں کر رہا، اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم مگر تم مجھے مجبور کر رہی ہو، اب تمہارے پاس صرف کل کا دن ہے، اس سے زیادہ وقت میں تمہیں نہیں دوں گا، ہر بات کی ذمہ دار صرف تم ہوگی اگر فیصلہ میرے حق میں نہ ہوا، غور سے سن لو، بس کل کا دن“۔ کاٹ دار لہجے میں اسے دھمکا تا وہ سایہ چند لمحوں بعد غائب ہو گیا تھا۔ ساکت بیٹھی وہ قدموں کی چاپ کو سنتی رہی تھی، جو دوسرے کے پک تک جا کر بند ہو گئی تھی۔ ایک سرد سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنے کندھوں پر بھاری بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں زندگی واقعی بہت ٹھن ہوئی ہے یا پھر صرف اس کے لیے ہی مشکل سے مشکل ہوتی جا رہی تھی، جھکے جھکے انداز میں اس نے سر گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

گہرے سکوت میں درخت سے لگے اس فوکر میں سے مستقل دھواں اٹھ رہا تھا، تب ہی کاک پٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور اس کے ساتھ ہی کاک پٹ سے گرنے والے انداز میں اترتا وجود دبیز برف پر لڑھکتا چلا گیا تھا، زخم کڑکڑاتے تھے تو اس کے حلق سے بھاری کراہیں بلند ہوئی تھیں۔ چند لمحوں تک اونٹھ منہ پڑے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر ارد گرد نظر دوڑائی تھی، اگلے ہی لمحوں میں اپنی ناکامی پر اسے شدید غصہ آنے لگا تھا، اس نے تو بہتر تھا کہ وہ رپو اور کی ایک گولی سے اپنا سمجھ اڑا دیتا، چند سینکڑ بھی نہیں لگتے اس دنیا سے جانے میں، اس فوکر پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ یہ اسے زیادہ آسانی سے زندگی سے نجات دلا دے گا، مگر اس نے تو ایک نئی مصیبت میں اسے لاپیدہ کر دیا تھا، خود کو کھیت کر قریبی درخت کی طرف لے جاتے ہوئے اسے

اندازہ تھا کہ اس کے ہاتھ اور پیر میں فریج پر جو مگے ہیں، سر میں ٹیسٹیں اٹھ رہی تھیں، کپٹی کے گہرے زخم سے رستا خون اس کے گریبان تک آ پہنچا تھا، اب ایسی ٹوٹی پھوٹی حالت میں نہ وہ اس جگہ سے نکل سکتا تھا نہ ہی مرنے کا کوئی اور راستہ اسے فوری طور پر مل سکتا تھا، کسی نہ کسی طرح اسے اپنے زخمی وجود کو درخت کے چوڑے تنے سے لٹکاتے ہوئے اسے اپنے زخموں کی فکر نہیں تھی، فکر انگیز چیز یہ تھی کہ بغیر کسی مدد کے وہ یہاں سے کیسے نکل سکے گا، بے شک وہ اپنی بے مقصد زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا، مگر تپ تپ کر تو ہرگز نہیں اور نہ ہی وہ کسی درندے کا شکار بننا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگل زیادہ دور نہیں ہو گا جہاں سفید بھیڑیے بکثرت ہوں گے، ان کے خونخوار جیزوں کا خیال آتے ہی اسے جھرجھری آگئی تھی، اگر وہ اپنے پیروں پر اٹھنے کے قابل ہوتا تو وہ یقیناً دھواں چھوڑتے فوکر کو جا کر دو چار لائنیں ضرور رسید کرتا، مگر اس وقت تو وہ چند بھاری بھر کم جیلہ اٹھانا اشتعال نکال سکتا تھا اور وہ ایسا کر رہا تھا۔

درخت کے تنے سے سر لٹکاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر آسمان سے زمین تک کا جائزہ لیا تھا، تیز چاندنی میں ہر چیز ٹھہری اور واضح تھی، اس کے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ اگر وہ بہت اچھے حالات میں اس جگہ ہوتا تو یقیناً اس پر فوں، جاوٹی جھگمگانی رات میں کسی کے ساتھ ہونے کی، کسی کے پاس ہونے کی تمنا ضرور کرتا، مگر ایسا تب ہوتا جب ایسا ممکن ہوتا، خواہشیں، تمناں، خواب نہ کہیں اس کے پورے ہوئے اور نہ ہی ان کے پورے ہونے کی امید وہ رکھتا تھا۔ وہ تو زندہ رہنے کی، کچھ عرصہ مزید زندگی سے جڑے رہنے کی امید بھی توڑ چکا تھا، آخر اس زندگی سے ملا ہی کیا تھا، غم، تنہائی، بے وفائی، نارسانی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ چند دن اور اس دنیا میں رہا تو مکمل طور پر اپنا چنی تو ازان کھودے گا۔ دن رات فرسٹریشن

اور ڈپریشن کے زیر اثر رہنے کے بعد اور بھی کیا سکتا تھا۔ وہ جنگ آچکا تھا خود کو برسوں رکھنے کے لیے بے اثر لال، پبلی، میلی گولیاں لگتے لگتے، کب تک؟ آخر کب تک؟ پوری منصوبہ بندی کے بعد انتہائی فیصلہ کرتے ہوئے اس نے خود کو سزائے موت سنائی تھی، اسے یاد تھا فوکر کا توازن ہوا میں بکڑ رہا تھا اور وہ اپنے ہماری جوتے سے اس کا کنٹرول سسٹم توڑ پھوڑ رہا تھا اور جب فوکر برف سے ڈھکی نا ہوا رخ سے ٹکرانے پوری رفتار سے جا رہا تھا، تو اس نے پہلی اور آخری برسوں سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں، مگر جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک بار پھر نا کام ترین قرار دینے پر وہ کوئی شرمندگی محسوس نہیں کر رہا تھا۔

وجود میں اٹھتی ٹیسوں کو ضبط کرتے ہوئے اس کی سانس پھولنے لگی تھی، بوسیدہ لباس پر بس اس نے ایک پرانی جیکٹ چڑھا رکھی تھی، اسے اب سردی کی شدت محسوس ہو رہی تھی، اچانک کچھ یاد آنے پر اس نے اسے اس ہاتھ کو حرکت دی تھی جس میں تکلیف قدرے کم تھی، کچھ تلاش کے بعد اسے جیکٹ کی اندرونی جیبوں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ اور لائٹر مل گیا تھا، کچھ ڈھارس لی تھی، اس وقت وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا، اپنے آپ کو ہر چیز سے بے تعلق رکھنا چاہتا تھا، مگر سگریٹ کے کش لینے ہوئے اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کان لگا کر وہ چند لمحوں تک باہر کسی کی غیر موجودگی کا یقین کرتی رہی تھی اور پھر بغیر کسی آہٹ کے کپ کی زپ کو کھوڑا نیچے کر کے باہر نکلیں دوڑائی تھیں اور جیسے سب کچھ بھول گئی تھی، دور تک پھیلے خاموش منظر نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، آسمان سے پرستی دو دھیا چاندنی برف پوش زمین میں غم ہو رہی تھی، اونچے درخت خاموش کھڑے کسی آہٹ کے منتظر تھے، اسے یاد آیا تھا، آج پورے چاند کی رات

ہے، نظر آ رہا تھا کہ رات اپنے پورے جو بن رہی، ایک لمبے کورک کر اس نے کچھ سوچا تھا اور پھر اپنا کرم کوٹ بازو میں دبا لی جیکے سے کپ سے باہر نکل آئی تھی، سر اٹھائے آسمان کو دیکھتی وہ بہت زندہ تھی، تاروں سے جگمگاتا آسمان اس پر جھکا آ رہا تھا، رات کی سحر انگیز خاموشی میں عجیب سی ترنگ بھری تھی، موسیقی کی دلکش لہریں اسے اپنے ارد گرد پھلتی محسوس ہو رہی تھیں، آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے ہی اچانک وہ بری طرح چونک گئی تھی۔ دور ایک درخت کے اوپر سے اسے گاڑھا دھواں اٹھتا دکھائی دیا تھا، چند لمحوں تک وہاں جا چکی نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے یقین کرنا پڑا تھا کہ ضرور وہاں کوئی حادثہ ہوا ہے، حادثہ ہوا تھا تو یقیناً کوئی حادثے کا شکار بھی ہوا ہوگا، دھوکے کے گولے دیکھتے ہوئے اسے وہی بے چینی محسوس ہوئی تھی جو اس وقت محسوس ہوئی تھی جب ایمر جنی وارڈ میں کوئی سیریس کیس آتا تھا، ایک ذمہ دار نرس کی طرح وہ ڈاکٹر کے پیچھے ہی ان کی مدد کے لیے تیار ہوتی تھی، اس کی ماں بھی ایک نرس تھی، اس پروفیشن سے لگاؤ اور محبت اسے اپنی ماں کی وجہ سے بھی تھی، انہوں نے اپنی ساری زندگی بیماروں کی دادرسی اور ان کی تیار داری کے لیے وقف کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ بہت آسانی سے اپنی ماں کے اس پروفیشن کو اپنا سکتی ہے کیونکہ اس کے پاس بھی ایک ایسا دل تھا جو انسانوں کی ہمدردی اور رحم سے بھرا ہوا تھا، مگر اس پروفیشن میں قدم بھانے کے لیے صرف رحم دل اور وفادار ہونا ہی کافی نہیں تھا، وہ اپنی یاں کی طرح مضبوطی سے قدم بھانے میں ناکام رہی تھی، وہ ایسے قابل عزت پیشے سے نفرت نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسے جاری بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ زندگی کی دوڑ میں شامل رہنے کے لیے اس نے ان گنت نوکریاں حاصل کیں اور پھر ان کو چھوڑ دیا، جس کام میں عزت پر آج آنے لگے اسے چھوڑ دینا ہی بہتر تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

شاید اس کی قسمت میں ہی ایسے حالات سے دوچار ہونا لکھا تھا، ورنہ اور بھی تو عورتیں ہیں اس دنیا میں جو بہت بہتر طریقے سے تنہا اسٹرل کرنی ہیں اور کامیاب زندگی حاصل کرتی ہیں۔ سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اس نے ایک ارادہ کر لیا تھا اور پھر دیر نہیں کی تھی کہ کیمپ میں جا کر اس نے اپنے بیک کو اغنایا تھا، سوئی ہوئی بیچوں کی طرف سے اطمینان کرتی وہ دھپے قدموں کیمپ سے نکل آئی تھی، دوسرے کیمپ پر پہنچ کر ڈال کر اس نے اپنے کیمپ کے داخلی حصے کو باہر لے بیٹھتی ڈوریوں سے اچھی طرح باندھ دیا تھا، باہر جلتی آگ میں اس نے چند مزید سوکھی لکڑیاں ڈال دی تھیں، تاکہ آگ بجھنے نہ پائے اور جنگلی جانور، کیڑے وغیرہ کیمپوں کے قریب نہ آنے پائیں۔ چلتے ہوئے اس نے حفاظت کے لیے ایک تیز دھار چاقو بھی ساتھ رکھ لیا تھا، جنگل سے جانوروں کی کڑیہ آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں، کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ کسی درندے سے اس کا سامنا بھی ہو سکتا تھا، تیز نیلگوں روشنی میں اس کے قدموں کے نشان برف کی دبیز تہہ پر بنتے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

سگریٹ کا بچا کلوا ایک طرف پھینک کر اس نے اپنے پیر کارخ پر لٹا جا رہا تھا، اور اس کو بخش میں اس کی کراہیں نکل گئی تھیں، اس نے پہلے سوچا تھا کہ فوکر کے قریب جا کر اس میں سے کوئی ایسی چیز نکال لائے جو ہتھیار کا کام کر سکتا ہو، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھیڑ یا اس کے بچے خون کی بوسٹھتہا یہاں تک آجائے اور منٹوں میں اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے، اب اس نے کوئی ایسا گناہ بھی نہیں کیا تھا کہ ایسی بھیانک موت مرتا، فوکر تک جانے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا تھا، فی الحال کیونکہ اپنے زخمی وجود کو حرکت دینا اس کے لیے بہت تکلف کا باعث بن جاتا تھا وہ اپنے ارد گرد ہی کوئی ایسا پتھر یا لکڑی تلاش کرنے لگا تھا جو قریب

ترین ہو اور اس کے بچاؤ کے کام آسکے۔ ابھی وہ اپنی تلاشیں نظر میں ادھر ادھر دوڑا رہا تھا کہ کچھ آہٹ سی اسے محسوس ہوئی تھی، اس کی رگوں میں خون محمد ہونے لگا تھا کیونکہ اس وقت وہ کسی بھیڑیے سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا۔ خطرے کی سمت کو بھاگنے کے لیے اس نے تیزی سے اپنے ارد گرد کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا اور پھر کچھ سینکڑوں بعد ہی اپنے دائیں جانب اس کی آنکھیں جم گئیں تھیں، اسے لگا تھا کہ اس کے دماغ میں بھی شاید کوئی اندرونی چوٹ آئی ہے، کیونکہ جو اسے دکھائی دے رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ سرخ گرم کوٹ میں بلیوں سر پر ادنی اسکارف لپیٹے تیزی سے اس جانب آئی وہ اس کے وہم کو یقین میں بدلنے لگی تھی، دوسری جانب کچھ فاصلے پر رک کر اس نے درخت سے پشت لگا کر بیٹھے زخمی شخص کو دیکھا تھا جو مکمل طور پر اس کی طرف ہی متوجہ تھا۔ فوکر کے آٹھے دھوئیں کو اور بھی اس شخص کو دیکھتی وہ کچھ دیر تک صورتحال کا اعجازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی تھی اور پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک فون نکال لیا تھا، آسمان صاف تھا اور اسے امید تھی کہ فون کے مکمل مل جائیں گے، وہ فوری طور پر ریسکیو کو کال کر کے اس حادثے کے بارے میں بتانا چاہتی تھی اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ فون کوٹ کی جیب میں واپس رہتی وہ تیزی سے اس شخص کی جانب آئی تھی جو دو رنگ نظروں سے اسے دیکھا اب تک اس کی موجودگی کا یقین کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

”فکرمٹ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا، کیا تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“ تیزی سے بیک سے پانی کی بوتل نکالتی وہ ہمدردی بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

دوسری جانب پانی کی بوتل دیکھتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چھہ رہے ہیں، وہ بھی سمجھ گئی تھی سو فوراً کپ ہٹا کر بوتل

سے تھادی تھی۔ وہ غناٹ پانی حلق میں اٹھیل رہا تھا، اس دوران کاشن کا ہنڈل وہ اٹھاتی اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس کی کینٹی پر کانی گہرا زخم تھا، بہتے خون کو روکنے کی ضرورت تھی، ابھی اس نے زخم کو صاف کرنا ہی چاہا تھا کہ اچانک وہ جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھپک گیا کہ وہ پیچھے کی طرف گرتے گرتے بھٹک رہی تھی۔

”یہ کیا حرکت ہے، میں تمہاری مدد کر رہی ہوں، زیادہ خون بہنے سے تمہاری زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ اس سلوک پر وہ اپنے غصے کو ضبط نہیں کر سکی تھی۔

”کون احمق زندہ رہنا چاہتا ہے؟“ وہ جس طرح سے آنکھیں نکال کر غرایا تھا وہ حق دق رہ گئی تھی۔

”اپنے آپ کو ان حالات سے میں نے خود دوچار کیا ہے، کھینک کوئی کمی رہ گئی تھی ورنہ تمہیں یہاں میری لاش ملتی، کتنا اچھا ہوتا کہ میں یہاں برف میں دفن ہو جاتا۔“ آخری جملہ اس نے شدید مایوسی اور حسرت سے کہا تھا۔

”اوہ... تو تم یہاں خودکشی کرنے کے ارادے سے آئے تھے؟“ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی وہ تائید چاہتی تھی۔

”تم نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ یہ حادثہ کیا ہے؟“

”کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے؟“ وہ جھلائے انداز میں بولا تھا، دوسری جانب وہ چند لمحوں تک اس کے خون آلودہ چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔

”کیوں مرنے چاہتے ہو؟“

”مر مر کر جینے سے بہتر ہے ایک ہی بار مر جانا اور کچھ؟“ اس کے منہ سے لہجے پر وہ چپ رہی تھی جبکہ دوسرے جھٹکنا اسے ٹوٹے پھوٹے فوکر کو دیکھنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے، یہ تمہاری زندگی ہے جو جا ہو کر دگر مجھے میرا کام کرنے دو۔“ قطعی لہجے میں پوچھتے ہوئے وہ پھر اس کا زخم صاف کرنے قریب ہوئی تھی۔

”دور رہو۔“ پھر بھڑکتے ہوئے وہ اسے دور دھکیلنا چاہتا تھا مگر وہ بروقت اس کا ہاتھ روک گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک لمبا نیچر اس کے چہرے پر رسید کر چکی تھی۔

”اتنی تہذیب نہیں تمہارے پاس کہ کسی عورت کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہئے۔“ وہ اس پر برسی تھی جو سناتے میں گہرا منہ کھولے اسے تنک رہا تھا۔

زناتے دار تھپڑ نہ جانے اس کی حیات کو سن کر دیا تھا یا بیدار مگر پھر وہ اسے روک نہیں سکا تھا، جو کافی احتیاط اور تیزی سے اس کا زخم صاف کر رہی تھی، حالانکہ اندر ہی اندر وہ کچھ ڈر گئی تھی اور اس کے رد عمل کے لئے تیار بھی تھی، مگر ایسا کچھ ہوا نہیں تھا، وہ اس دوران بھی بالکل شانت رہا تھا جب وہ اس کے خون کو صاف کر رہی تھی۔

”میں نے بیڑیج کر دی ہے فی الحال مگر تمہارے زخم کو اسٹچر کی ضرورت ہے۔“ پیچھے ہٹتی وہ بولی تھی اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھتی اس کے کچھ بولنے کی منتظر رہی تھی، جو سر جھکائے مکمل خاموش تھا۔

”اور کہاں چوٹ لگی ہے؟ اپنے پیروں پر اٹھ سکتے ہو تم؟“

”نہیں،“ شاید میرے ہاتھ اور پیر دونوں میں فریکچر ہو گئے ہیں۔“ اپنے ایک پیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بلی آواز میں بولا تھا۔

”پھر اپنے پیر کو حرکت نہ دو، ایک گھنٹے کے اندر اندر ریسکیو والے یہاں پہنچ جائیں گے۔“ اس کی تسلی پر وہ بری طرح چوٹ لگا تھا۔

”تم نے ریسکیو کو یہاں بلا لیا، میری اجازت کے بغیر ان کو اطلاع کیوں دی تم نے؟“ وہ دھاڑا اٹھا تھا۔

”تم اتنا غصہ کیوں کرتے ہو، میری آنکھوں کے سامنے ایک حادثہ ہوا ہے، میرا فرض تھا کہ میں تمہاری مدد کے لیے یہاں ریسکیو کو بلائی، مجھے پہلے سے نہیں

پتہ تھا کہ تم یہاں خود کو مارنے آئے ہو۔ اس کے معذرت خواہانہ لہجے پر وہ بس خوشخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میرا نام ساشا ہے، میں یہاں ایک فلیکی کے ساتھ کیپنگ ٹرپ پر آئی ہوں، اس فلیکی میں دو چھوٹی بچیاں ہیں، میں ان کی کورس ہوں۔“ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے وہ اس کے متوجہ ہونے کی خاطر قیاسی جو دوسری طرف نظر پھیرے ہوئے تھا۔

”میں جانتی ہوں تم میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے، مگر میرا قصور اتنا بڑا بھی نہیں ہے، تم پہلے ہی اپنی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔“ اس کے کہنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”ناکامیوں کے سوا مجھے اس زندگی سے ملا بھی کیا ہے، موت حاصل کرنے نکلا تو اس میں بھی ناکامی، نفرت ہے مجھے اپنی ناکامیوں سے اور اس ناکام زندگی سے۔“ وہ انتہائی تلخ لہجے میں بولا تھا۔

”ناکامی تو میں نے بھی بہت سیکھی ہے اور سمیٹ رہی ہوں، مگر میں اپنی زندگی سے کبھی نفرت نہیں کر سکتی اور نہ ہی میں اتنی بزدل ہوں کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔“

”مگر میں بزدل ہوں، میری ناکامیوں نے مجھے بزدل بنا دیا ہے، لیکن میں اگلی بار مات نہیں کھاؤں گا دوبارہ خود کو مارنے کی کوشش کروں گا اور تب تک کوشش کرتا رہوں گا، جب تک کامیاب نہ ہو جاؤں۔“

”کتنا اچھا ہوا گریہ کوشش تم اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے کرو۔“ وہ بولی گئی۔

”اور تمہیں یہ لگتا ہے کہ میں نے یہ کوشش نہیں کی ہوگی؟“ وہ ناگواری سے بولا تھا۔ ”میری زندگی میں اب ایسا کچھ نہیں رہا جس کے لیے میں زندگی کی تمنا کروں۔“

”ایسا کیا تھا جواب باقی نہیں رہا اور اب تمہیں

اس کے بغیر زندہ رہنا بھی پسند نہیں؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھی، جواباً کھٹکے کھٹکے انداز میں وہ آنکھیں بند کرتا سر جھکا گیا تھا۔

”پتہ ہے آج پہلی بار تمہیں دیکھتے ہوئے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرے سامنے ایک ایسا انسان ہے جسے میں اپنی لکھنوں اور ناکامیوں کے بارے میں بتاؤں، شاید میری باتیں تمہارے لئے اہم نہ ہوں مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ پہلی بار ایک غمگسار مجھے ملا ہے، جس کے پاس وقت ہے میرے دل کی بات سننے کے لیے، کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ میں بہت توجہ سے تمہارے دل کی بات سنوں گی، تمہارے غم کو سمجھوں گی؟“ اس کے سوال پر وہ نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”کچھ دیر بعد دیکھو یہاں آجائے گی اور تم چلے جاؤ گے، جانے سے پہلے کیا تم مجھے کچھ وقت کے لیے اچھا دوست سمجھی نہیں سمجھ سکتے؟“ اس کے خاموشی سے دیکھنے پر وہ مزید بولی گئی۔

”ساشا...“ یہ نام بتایا تھا تم نے اپنا؟“ اس کے سوال پر ساشا نے سر ہلایا تھا۔ دوسری جانب وہ گہری سانس لیتا جھگڑاتے آسان پر نظر جمایا تھا۔

”میرے دل میں بھی اب ایسا کچھ باقی نہیں رہا جو تمہیں بتا سکوں، میں جانتا ہوں تم مجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ میں کیوں خودکشی کا مرتکب ہوا؟“ آسان پر نظر جماتے وہ ایک ہل کو خاموش ہوا تھا۔

”ایک انسان دنیا کو سمجھنے کے لیے، اس میں شامل ہونے کے لیے جب تیار ہوتا ہے تو اس کے پیچھے سہارا دینے کے لیے کچھ رشتے ہوتے ہیں، جو اس کی ہمت بندھاتے ہیں، دنیا کے سمندر میں اگر اس کا توازن بگڑے تو اسے سنبھالتے ہیں، آگے بڑھانے کے لیے اسے ڈھارس دیتے ہیں، اس کے آتسو پونچھتے ہیں، اس سے محبت کرتے ہیں، مگر میں ان سب ہی رشتوں سے محروم تھا، دن سڑکوں پر رات

بارک کی بچوں پر گزارتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلا کہ ایک گھر کی خواہش کتنی شدت سے دل میں جڑ پکڑ چکی تھی، میں خواب میں خود کو ایک خوبصورت گھر میں دیکھتا تھا، جہاں میرے ارد گرد کچھ ایسے رشتے ہوتے جو مجھ سے محبت کرتے اور میں ان سب کے درمیان بہت خوش ہوتا... اور جب آنکھ کھلتی تو وہی ہراساں کرتی تنہائی میرے گرد ہوتی، پھر میں نے جاگتی آنکھوں سے بھی ایک گھر کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے، کچھ اور خواب بھی اس خواب کے ساتھ جڑ گئے، کسی کا ساتھ، عمر بھر کا ساتھ، چاہنے اور چاہے جانے کے خواب، مگر ان سب خوابوں کو بغیر دینا بہت مشکل تھا، میں جدوجہد کرتا رہا، دن رات ایک کر دیئے، گھر بنانے کے لیے بہت سارا پیسہ چاہئے تھا اور مجھے ایک بڑی رقم جمع کرنی تھی، اسی جدوجہد کے دوران مجھے وہ ملی جس سے ملنے کے بعد مجھے لگا تھا کہ اس کے بغیر تو میرا گھر، گھر کہا ہی نہیں سکے گا۔“ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے وہ ساکت بیٹھی اسے سن رہی تھی جو بولتا جا رہا تھا۔

”میں جس اسٹور میں سلاز میں تھا وہ وہیں میرے ساتھ کام کرنے آئی تھی، میں شاید اس کی نظر میں کوئی کشش نہ رکھتا تھا، مگر وہ تو پہلی لڑکی تھی جو پہلی نظر میں میرے دل میں اتر گئی تھی، دن رات لو کر بیاں کرتے ہوئے میرے پاس اتنا وقت نہیں بچتا تھا کہ میں کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزاروں، مگر وہ دن کی شفٹ میں میرے ساتھ ہی اسٹور میں کام کرتی تھی، میں نے بھی صاف طور پر اسے اپنے جذبات سے آگاہ نہیں کیا، مگر وہ جانتی تھی، پیچھاتی تھی کہ میں اسے کتنا چاہنے لگا ہوں، پھر ایک دن میں نے اس سے بس اتنا کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اس نے مجھے انکار نہیں کیا مگر کوئی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی، ایک معمولی درکار پر دوپزل اسے ملتا تو اس آسان پر تو نہیں پہنچا سکتا تھا، اس نے بس اتنا

کہا کہ میں پہلے ایک گھر بناؤں، کوئی اچھا بڑا بس شروع کروں، اس سے پہلے شادی کا کوئی جواز نہیں بنا، یہ تو میں بھی جانتا تھا مگر میں اس کے اسی جواب سے خوش تھا، میری جدوجہد اور تیز ہو گئی، دو کے بجائے میں نے تین تین نوکر بیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ گھر کے ساتھ ساتھ مجھے بڑا بس بھی شروع کرنا تھا، رقم اور چاہئے تھی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ اسٹور چھوڑ کر شہر کے ایک دوسرے بہت بڑے اسٹور میں سلاز گول کی جاب کرنے چلی گئی، کیونکہ وہاں اسے اچھی سہولت مل رہی تھی اور میں اس کی خوشی میں خوش تھا، مگر میں اسے نہیں بتا سکا کہ اس کا چند گھنٹوں کا ساتھ ختم ہو جانا میرے دل کو کتنا صدمہ پہنچا رہا ہے، مجھے یہ یقینان تھا کہ اس نے مجھ سے تعلق پہلے کی طرح قائم رکھا ہے۔ میں اسے فون کرتا، روزانہ لچ بریک میں لچ کرنے کے بجائے اس سے ملنے اس کے اسٹور تک پہنچ جاتا، وہ بھی بہت خوشی سے ملتی، ہمارے درمیان کچھ باتیں ہوتیں جن کے سہارے میں دوسرے دن تک اس سے ملنے کا انتظار کرتا۔“ بولتے بولتے وہ یکدم چپ ہو گیا۔ ساشا نے اسے بولنے پر مجبور نہیں کیا تھا اسے اندازہ تھا کہ اس وقت وہ کہیں اور ہی پہنچا ہوا ہے، زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اتنا وہ پھر بولنا شروع کر چکا تھا۔

”پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا، اس نے سردہری سے پیش آنا شروع کر دیا، اس نے میرے فون بھی اسٹینڈ کرنے بند کر دیئے مگر میں نے دل میں اس کے خلاف بدگمانی نہیں آنے دی، اس اسٹور میں وہ منجھری پوسٹ پر آگئی تھی، اس کا کام اور ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں، مگر میں تو وہی تھا، وہ میرے لئے ہر کام، ہر ذمہ داری سے پہلے تھی۔ ایک دن جب میں اس سے ملنے گیا تو پہلی بار وہ مجھے اسٹور کے اندر لے گئی، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ اپنے اسٹور کے مالک سے مجھے ملانا چاہتی ہے۔ میں حیران تھا کہ آج

اچانک وہ ایسا کیوں جا رہی ہے، مگر میں تو ہر معاملے میں اس کی خوشی میں خوش تھا، میں پہلی بار اس خوش پوش انسان سے مل رہا تھا، جس نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے منہ کے بل گردایا تھا، میں جس کے ساتھ اپنے گھر کو آباد کرنا چاہتا تھا وہ خود مجھے بتا رہی تھی کہ وہ اس شخص سے شادی کرنے والی ہے، ایک ہفتہ پہلے ہی ان دونوں نے انجمن رنگ ایک دوسرے کو پہنائی تھی، پچھلے ایک ہفتے سے میرے خواب ایک ایک کر کے جل رہے تھے اور مجھے خبر تک نہ ہو سکی اور جب خبر ہوئی تو ان خوابوں کی را کہ میرے ہاتھوں میں تھی، جن کو ساتھ لئے میں خاموشی سے ان دونوں کے درمیان سے نکلتا وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔

”تم نے اس سے کوئی سوال کوئی شکایت نہیں کی؟“ ساکت نظروں سے اس کے چہرے پر پھسلے دو قطروں کو دیکھتی وہ ہنسنے لگی تھی۔

”نہیں... اس دن میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکا تھا کہ ایک دن پہلے ہی میں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا ہے، پھر یہ بھی بتانا پڑتا کہ اس گھر کو خریدنے کے بعد میرے پاس صرف وہی چند روپے بچے ہیں جو اس وقت میرے والد میں پڑے مجھ پر ہنس رہے تھے۔“ وہ ٹوٹے لہجے میں بولا تھا۔

”اسے میری ضرورت نہیں تھی، اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی، جو اسے اچھا گھر، پڑ آسائش زندگی دے سکے، معاشرے میں جس کا ایک مقام ہو، جو بھاری بینک بیلنس اور کامیاب بزنس کا مالک ہو، اور وہ شخص اسے مل گیا تھا، میرے پاس کیا تھا، جس پر اکڑ کے میں اس سے سوال کرتا، میں نے بھی اسے ایک اچھا تھک تک نہیں دیا تھا، کیا شکایت کرتا اس سے؟ میری غلطی تھی، دن رات کی محنت کے بعد بھی مجھے جیسے ناکام انسان کو خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں تھا، میں جس عورت کو جیتی تھی نہیں دے سکتا تھا، ہوئی میں ڈنر کروانا اور ڈنر نہیں کر سکتا تھا، جس پر خرچ کرنے کے

لیے میرے پاس بے تحاشہ روپیہ نہیں تھا، اس عورت کی بے وفائی پر میں اس سے کیا شکایت کرتا؟“ وہ یکدم مشتعل ہوتا بول رہا تھا۔

”مجھ جیسے انسان کو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے، جو ایک ایک خوشی کے لیے ترستار ہا ہو، جس کو ٹھکرایا تو جا سکتا ہے مگر گلے سے نہیں لگایا جا سکتا، میری زندگی شرمندگی اور ناکامی کا دوسرا نام ہے اور میں اس کا بوجھ اس لئے نہیں اٹھا سکتا کہ میں ٹوٹ چکا ہوں، میری روح تھک چکی ہے، ہر مقصد فوت ہو چکا ہے۔“ بچنے لہجے میں بات ختم کرتا وہ خاموش ہو گیا تھا۔

”جتنی سچائی سے تم نے مجھے یہ سب بتایا ہے، اسی سچائی سے میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تم ایک بہت اچھے انسان ہو، تم کہتے ہو کہ تم نے کوئی کامیابی حاصل نہیں کی، مگر ہر کامیابی سے بڑی کامیابی ہے اچھا انسان بننا، دولت، شہرت تو کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے، تمہاری دوسری بڑی کامیابی یہ ہے کہ تم نے اپنا پہلا خواب حاصل کر لیا، اسے تعبیر دے دی، تم نے اپنی محنت سے ایک گھر حاصل کر لیا ہے، زندگی صرف ایک عورت تک آ کر ختم نہیں ہو جاتی، یہ اس عورت کی بد نصیبی ہے کہ اس نے تمہاری اور تمہارے جذباتوں کی قدر نہیں کی، مگر یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہیں ایک ایسی عورت سے چھکا رامل گیا جو دولت اور آسائشوں کے لئے شاید دس سال بعد بھی یا پھر کسی بھی موڑ پر تم سے دامن چھڑا سکتی تھی، تب کیا کرتے تم؟ کیا یہ بہتر نہیں ہوا کہ وقت پر تمہیں معاف اور غلطی کے بارے میں معلوم ہو گیا۔“ اس کے قائل کرنے والے انداز پر وہ دس خاموش تھا، اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھا کہ ساشا کی کسی بات نے اسے متاثر نہیں کیا ہے۔

”دنیا کی ہر عورت کو دولت اور آسائش کی ضرورت نہیں ہوتی، کم از کم مجھے تو نہیں، جانتے ہو

میں ایک ایسے شخص کا ساتھ چاہتی ہوں، جو مجھ سے ٹاکس ہو اس کے بعد اگر مجھے اس کے ساتھ سڑک کے کنارے بھی رہنا پڑے تو میں ہنسی خوشی رہوں گی، کیونکہ میری چھت، میرا سائبان اور محافظ وہی تو ہو گا، میں یہ نہیں چاہوں گی کہ وہ دن رات میری محنت کا دم بھرے یا مجھے سامنے بٹھا کر دن میں دس بار محبت کا اظہار کرے، ہاں لیکن اگر میں کہیں کم ہو جاؤں اور اسے کہیں دکھائی نہ دوں، تو وہ بائگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتا پھرے، میرا نام لے کر چیخے گا، اس کے حلق میں خراشیں پڑ جائیں۔“ اس کے بلند لہجے پر کوفت سے سر ہلاتا وہ دوسری سمت دیکھنے لگا تھا جبکہ اس کے تاثرات پر ساشا کچھ

”معاف کرنا میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گئی۔“ وہ

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس کے سوال پر وہ کچھ

”اگر تم اپنا نام نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں، میں نے کچھ وقت کے لئے مجھے اپنا تمسکرا کچھ کراچے والی بات بتائی میرے لئے یہی...“

”شیونیل۔“ وہ درمیان میں ہی بول اٹھا تھا۔

”شیونیل نام ہے میرا۔“ اس کے سپاٹ لہجے پر وہ اس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

”تم گورنس ہو، بچوں کی نگرانی کیسے کرتی ہو گی، نہیں تو خود کسی کی نگرانی میں رہنے کی ضرورت ہے۔“ اس کے تنقیدی لہجے پر ساشا نے ابھی نظروں

”تمہا یہاں تک آ گئی ہو، جانتی ہو یہ کتنی خطرناک ہے، ہو سکتی ہے تمہارے لئے؟“ وہ بولا تھا۔

”جانتی ہوں مگر مجھے عادت ہو چکی ہے خطروں کا سامنا کرنے کی، تمہا زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے یہ تم

ہو یا نہ ہو، تمہائی سے اور خطروں سے لڑتے ہو، زندہ رہنے کا طریقہ تو آئی جاتا ہے۔“ وہ ہلکی آواز میں بولی تھی۔

”کیوں تمہا زندگی گزار رہی ہو، شادی کرلو۔“ وہ بولا تھا۔

”تم کرو گے مجھ سے شادی؟“ ساشا نے فوراً سوال کیا تھا، مگر اگلے ہی بل اس کی حیران نظروں پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی اور ہنسی ہی چلی گئی تھی۔ شیونیل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا جس کی ہنسی رک چکی تھی، مگر چہرے پر ہنسی کے معدوم ہوتے تاثرات موجود تھے۔ بڑھتی چلتی سے بھاؤ کے لیے وہ بازوؤں کو اپنے گرد مضبوطی سے لپیٹ بیٹھی تھی۔

”دکب سے گورنس کی جاب کر رہی ہو؟“ شیونیل نے پوچھا تھا۔

”بس کچھ ہی عرصہ گزرا ہے۔“ وہ مختصر جواب دے کر ارد گرد دیکھنے لگی تھی۔

”اس سے پہلے کیا کام کرتی تھیں؟“

”اس سے پہلے بھی بہت جگہ مختلف نوکریاں کیں، مگر جاری نہ رکھ سکی کہیں... اور شاید اب یہ گورنس کی نوکری بھی چھوڑنی پڑے۔“

”اس کی کیا وجہ ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”عزت اور عزت نفس سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی چیز اہم نہیں ہوتی، میں بھی ان کا سودا نہیں کر سکتی، اس لئے ہر نوکری سے ہاتھ دھوئے پڑتے ہیں۔“ نیم برف کو انکی سے ادھر ادھر کرتی وہ مدہم لہجے میں بولی تھی اور پھر یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”مگر میں ان حالات سے ہار کر موت کو گلے نہیں لگا سکتی، پھر تم مرد ہو کر اتنی بزدلی کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہو؟“

”تمہارے اس سوال کے باوجود میں دوبارہ خود کسی کی کوشش کروں گا۔“ وہ سر لہجے میں بولا تھا۔

”میری ایک بات مانو گے؟ انکار مت کرنا۔“

ساشا کے التجائی لہجہ پر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”میرے اور تمہارے حالات تقریباً ایک جیسے ہیں، آج ہم دونوں یہاں سے ایک نیا عزم، ایک نیا عہد لے کر جدا ہوتے ہیں کہ اگلے تین ماہ تک ہم اپنی اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی کام پابی حاصل کریں گے، یہ ایک طرح کا مقابلہ ہوگا، مگر ہم دونوں کے پاس تین ماہ کے لیے ایک مقصد ہوگا، یہاں سے جاتے ہوئے نہ تم تنہا ہو گے اور نہ میں۔ میں اپنے لئے نہیں تمہارے لئے کوئی کام پابی حاصل کرنے کی کوشش کروں گی اور تم میرے لئے، اگر یہ سوچ ساتھ ہوگی تو ایک جذبہ اور جوش ہماری کوشش میں شامل ہو جائے گا، اب تک ہم اپنے لئے زندگی میں جدوجہد کرتے رہے ہیں، اب یہ تبدیلی اپنی زندگی میں کر کے دیکھتے ہیں، میں جانتی ہوں تم اندر سے بزدل نہیں ہو، بس تین ماہ تک کی بات ہے اس دوران تم خودی کا ارادہ ترک کرو۔“

”اور تین ماہ گزرنے کے بعد کیا ہو گا؟“

شیونیل نے پوچھا تھا۔

”تین ماہ بعد آج کی ہی تاریخ میں ہم اسی جگہ ملیں گے۔ اس کے فوراً کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”اس میں تمہاری ہی نہیں میری بھی بھلائی ہے، یہاں سے جاتے ہوئے مجھے بڑا حاسر تو ہوگی کہ میں تنہا نہیں ہوں، کوئی ہے جو میرا انتظار کر رہا ہے، مجھے واپس اس کے پاس جانا ہے، کہیں تمہیں میری باتیں اعتماد نہ تو نہیں لگ رہیں؟“ ایک ہل کو رک کر ساشا نے اس سے پوچھا تھا۔

”پتہ نہیں، مگر اس سب سے کیا حاصل ہونے والا ہے؟“ وہ کچھ ہنسی سے بولا تھا۔

”یہ تین ماہ کے بعد معلوم ہو جائے گا، اس دوران ہم اپنی اپنی کوشش میں ایک دوسرے سے کیا

عہد تازہ رکھیں گے، ہر صبح ایک نئے عزم کے ساتھ کوشش شروع کریں گے، مجھے یقین ہے کہ اس مقابلے میں تم مجھ سے ہارنا ہرگز نہیں چاہو گے، ویسے ہار جیت کا فیصلہ آج کے دن ہی ہوگا۔“

”اس وقت تو رات ہے۔“ شیونیل کا لہجہ غیر سنجیدہ ہی تھا۔

”اچھا یاد دلایا، دن سے لے کر رات تک ہم یہاں ایک دوسرے کا انتظار کریں گے، آنے میں مجھے یا تمہیں رات بھی ہو سکتی ہے، ان پہاڑوں کے درمیان پہنچنا تمہارے لئے آسان ہو سکتا ہے مگر میرے لئے نہیں۔“

”اس جگہ ہی آنے کی وجہ کیا ہے؟“ شیونیل نے پوچھا تھا۔

”اس لئے تاکہ جوش و خروش قائم رہے، ویسے بھی مجھے یہ جگہ بہت پسند آتی ہے، کسی اچھے انسان سے اچھی جگہ ہی ملا جائے تو اچھا رہتا ہے۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”تم تنہا یہاں تک کیسے آؤ گی؟“

”وہ میرا کام ہے اور تم کیسے آؤ گے؟ تمہارا فوکر تو جاہ ہو چکا ہے، تم نے کتنی رقم خرچ کی تھی اسے خریدنے کے لیے؟“ ساشا نے پوچھا تھا۔

”یہ تو بالکل ناکارہ فوکر تھا، سستے داموں پر میں نے اسے کھاڑ خانے سے اٹھایا تھا، میں نے بس اس کی اتنی مرمت کی کہ یہ مجھے اڑا کر کسی پہاڑ سے کھرا دیتا۔“

”مگر اب یہ فوکر تمہارے منصوبے کو دھوئیں میں اڑا چکا ہے۔“ ساشا نے کہا تھا۔

”مجھے واپس کب جانا ہے، یہ سیکو کا ہیلی کاپٹر بھی یہاں پہنچنے والا ہوگا، کیا تم راضی ہو اس مقابلے کے لیے؟“ ساشا کے سوال پر اس نے ایک ہل کو کچھ سوسا

تھا۔

”میں کیسے یقین کروں تمہارا کہ تین ماہ بعد

یہاں ملو گی؟“

”بالکل اسی طرح جیسے مجھے تم پر یقین ہے کہ تم ضرور وعدے کے مطابق مجھے یہاں ملو گے، میں بھی تم سے یہاں ملنے کا وعدہ کرتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ پر سوچ انداز میں شیونیل نے ہلایا تھا۔

”تمہارا بہت شکریہ، میں بہت خوش ہوں۔“ وہ بولی تھی اور اگلے ہی لمبے دو دوں چوک اٹھے تھے دور کیس سے ہیلی کاپٹر کی مدد ہم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”ہمارا نام اب شروع ہو رہا ہے، مجھے امید ہے کہ تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔“ ساشا نے اگلت میں کہا تھا۔

”کیوں ناں ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی کوئی نالی دیں تاکہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونے کا یقین رہے؟“

”میں اپنے چہرے پر تمہاری نشانی لے کر جا رہا ہوں، یہ پتھر مجھے تین ماہ بعد بھی یاد رہے گا۔“ وہ ہلکی سی بولا تھا۔

”نہیں، کوئی ایسی چیز میں تمہیں دوں گی، جو میں میرے بارے میں اچھا سوچنے پر مجبور کرے۔“ وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولی تھی۔ دوسری طرف شیونیل نے حیرت سے اسے دیکھا تھا، جواپنی

کران سے زنجیر اتار رہی تھی۔

”میں یہ نہیں لے سکتا، رکو۔۔۔“ شیونیل نے اسے روکنا چاہا تھا، مگر وہ ان سنی کیے اس کی جینٹ کی اگلت میں زنجیر ڈال چکی تھی۔

”اب تم بھی جلدی سے اپنی کوئی چیز دو۔“ ہیلی کاپٹر قریب آتا جا رہا تھا، ساشا کی جگت نے اسے ہلایا تھا۔

”میرے پاس یہ رسٹ وایج ہی ہے، میں اسے

کھول نہیں پاؤں گا، تم خود لے لو۔“ شیونیل نے اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”کمال ہے، تم رسٹ وایج پہن کر خود کشی کرنے نکلے تھے۔“ اس کے ہاتھ سے رسٹ وایج اتارتی وہ مسکرائی تھی جبکہ شیونیل نے پہلی بار بغور اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”تم مجھے اپنا ایڈریس یا کھٹیکٹ نمبر دے دو، یا مجھ سے لے لو۔“ وہ بلاسوچے سمجھے ہی بول گیا تھا۔

”یہ دونوں چیزیں دوں گی تھی اور تم سے لوں گی بھی، مگر تین ماہ مکمل ہونے پر آج کی ہی تاریخ میں۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی اور پھر آسمان کی طرف دیکھتی

اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ شیونیل کی نظریں اس پر ہی جمی تھیں جو سامنے ہی اپنا ادنی اسکارف ہاتھ میں پکڑ کر ادھر ادھر ہلاتی، ہیلی کاپٹر کو نیچے آنے کا اشارہ دے رہی تھی، سر پر چکر کاٹا ہیلی کاپٹر لینڈ کرنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا جب اس کے تیز شور

اور ہوا کے جھکڑوں میں وہ بھانکتی ہوئی واپس اس کے پاس آئی تھی۔

”اگر دوبارہ تم پر خود کشی کرنے کا اور مایوسی کا ایک ہو تو میری نشانی کو دیکھنا اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا۔“ ہیلی کاپٹر کے شور میں اس کی بلند آواز

سننے ہوئے شیونیل کو اچانک یہ احساس ہوا تھا کہ وہ کسی بھی طور پر اسے خودی سے باز رکھنا چاہتی ہے۔

”میں تمہیں بہت مس کروں گی اور تم۔۔۔؟“ وہ پوچھ رہی تھی، اثبات میں سر کو حرکت دیتا وہ بس اس کو دیکھ رہا تھا، تیز ہواؤں سے اس کے بال چہرے پر پکھر

رہے تھے مگر اس کے چہرے پر ہلکی چمک کو چھپائیں سکے تھے۔

رہسکونے بہت تیزی سے اپنا کام کیا تھا، جس وقت وہ شیونیل کو اسٹریچر پر ڈال کر ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے تھے، ساشا اس کے ساتھ ہی چل

رہی تھی، وہ بالکل خاموش تھی مگر آخری بار جب ساشا

کی طرف اس نے الوداعی نظر ڈالی تو اس کی آنکھیں شیوکیل کے دل و دماغ میں نقش ہو گئی تھیں، اس کی آنکھوں میں جو تاثر، جو احساس تھا، اسے وہ نہیں بھول سکتا تھا، ساشا کا چہرہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا، مگر وہ اس کی آواز سن سکتا تھا، وہ آج کی تاریخ بار بار دہرائی تھی، یہی کاپر فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔

سر اٹھائے وہ آسمان پر دو غائب ہوتے یہی کاپر کو دیکھ رہی تھی، جواب ایک سیاہ نقطے کی طرح دکھائی دے رہا تھا، اسے پتہ نہیں چلا کہ کب اس کا چہرہ ایک گرم سیال سے بھینک چلا گیا تھا، پہلی بار وہ کسی اپنے جیسے ٹوٹے بھرے انسان سے ملی تھی، مگر اب وہ جا چکا تھا، لیکن واپس یہاں آنے کے لیے، اسے بھی اب واپس کب تک جانا تھا، انتہائی تیزی سے وہ بھاگتی جا رہی تھی، اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں ایک رستہ واضح چاند کی تیز روشنی میں چمک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایک جھپٹے دیکتے اسٹور سے باہر نکلتے ہوئے اس کے پیروں میں ہلکی سی لڑکھراہٹ موجود تھی، مکمل ریٹ نہ کرنے کے باعث اس کے فریج پر اتنی جلدی بہتر نہیں ہونے والے تھے مگر اسے پرواہ نہیں تھی، سر اٹھا کر اس نے اسٹور کے ماتھے پر جھپٹے بورڈ کو دیکھا تھا، ایک خوشی کی رقع اس کے دل میں جاگ اٹھی تھی، ایک ماہ کے مختصر عرصے میں اگر یہ کامیابی اس نے حاصل کی تھی تو اس کا محرک صرف وہی تھی، جس کی نشانی اس وقت اس کی ہتھیلی پر موجود تھی، چند گھنٹوں تک وہ اس معمولی سی زنجیر کی غیر معمولی چمک دکھ کو دیکھتا رہا تھا اور پھر دوبارہ اسٹور کا طائرانہ جائزہ لیا تھا، یہ اسٹور اس کی ملکیت تھا، اسے خریدنے کے لیے اسے اپنے اس گھر کو فروخت کرنا پڑا تھا، جو اس کا پہلا خواب تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے ایک بہتر فیصلہ کیا

تھا، اسے امید تھی کہ یہ اسٹور کامیابی سے چلے گا، یہ بزنس سیٹ ہو گیا تو وہ دوبارہ پہلے سے ایک بہتر گھر خرید سکے گا اور اسے معلوم تھا کہ اس مصروف علاقے میں اس کا کام اچھی طرح سے چلے گا۔

ایک ہفتہ ہاسپٹل کے بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ یہ ساری منصوبہ بندی کرتا رہا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایک سرے سے اپنی زندگی کی شروعات کرنا چاہتا تھا، خود کشی کے بارے میں اب وہ کسی حال میں نہیں سوچتا چاہتا تھا، کیونکہ وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ چکا تھا، موت کتنی بھیانک ہو سکتی ہے یہ جان لینے کے بعد وہ اب زندہ رہنا ہی بہتر سمجھتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگلے دو ماہ میں شاید وہ کچھ اور کامیابیاں بھی حاصل کر سکے گا، مثلاً وہ اپنے اسٹور کے باہر ایک چھوٹی سی فلاور شاپ بھی شروع کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا اور اس کے علاوہ وہ کسی اچھے علاقے میں صرف ایک کمرے کا ہی فلیٹ کرائے پر لینا چاہتا تھا، فی الحال تو اس کا اسٹوریس اس کی رہائش گاہ بنا ہوا تھا، اسے یقین تھا کہ اگلے ایک ماہ میں وہ یہ دونوں کام بھی کامیابی سے کر لے گا، یہ عزم اور حوصلہ اسے ایک ایسی ہستی سے ملا تھا جس کا چہرہ گزرے ایک ماہ میں اسے کہیں دکھائی نہیں دیا، مگر وہ مستقل اس کے ساتھ تھی، وہ اپنے لئے نہیں اس کے لیے کامیابیاں حاصل کرنے کی جدوجہد میں تھا اور اسی لئے وہ کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ پتہ یقین تھا، اپنے لئے جتنا کوئی متاثر کن چیز نہیں ہوتی، کسی اور کے لیے خود کو زندگی میں آگے بڑھاتے رہنا بہت خوبصورت مشقت ہوتی ہے، گزرے دنوں میں اسے یقین ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ویک اینڈ پر رات گئے تک اسٹور پر کسٹمرز کا رش لگا رہتا تھا، اپنے سیکڑ میں کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے باہر فلاور شاپ پر دوسرے سیکڑ میں کی مدد بھی کرنی پڑی تھی، اس کا ہر دن مصروف سے مصروف

ہوتا جا رہا تھا، اسے کھانے پینے کا وقت بھی بہت مشکل سے مل پاتا تھا، اس کے ریلوے کسٹمرز کی تعداد بڑھتی تھی کیونکہ وہ سب کے ساتھ بہت خوش اخلاقی اور مہربانی سے پیش آتا تھا، اس کے دونوں سیکڑ میں بہت مختصر اور بھرپور منہ تھے لہذا وہ ان کا بھی بہت خیال رکھتا تھا، ایک چھٹی کا دن اسے ملا تھا، اس میں بھی کرنے کے لیے بہت کام ہوتے تھے۔ آدھا دن اسٹور کے گروام میں حساب کتاب کرتے ہوئے گزرتا اور پھر رات، گئے تک اپنے فلیٹ کی حالت درست کرنے میں وہ کھن پکھناتا رہتا تھا، یہ فلیٹ اسے اچھے علاقے میں مل گیا تھا مگر اس کی حالت بہت اتر تھی، اس کے پاس وقت کی کمی تھی لہذا وہ آہستہ آہستہ ہی فلیٹ کو اپنے مطابق سدھار رہا تھا۔

دن سے رات تک وہ کتنا ہی مصروف ہو، مگر جب تھک کر وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹتا تو بھی اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ ہوتا تھا، جس کے لیے وہ اپنے آپ کو اس زندگی میں ایڈجسٹ کر رہا تھا، وہ بھی اسے کسی خواب کی طرح لگتی اور بھی ایک محکم حقیقت، ہر رات سونے سے پہلے وہ اس بازگشتی سہری زنجیر کو دیکھتا نہیں بھولتا تھا، بھی وہ سوچتا کہ ”جانے ساشا کو اتنا وعدہ یاد ہے یا نہیں... وہ اس وقت کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ کیا وہ وعدے کے مطابق اس سے ملنے طے شدہ جگہ پر پہنچے گی بھی یا نہیں؟“ یہ سوچیں بھی بھی اسے بہت زیادہ بے چین کر دیتی تھیں، مگر دل کو ایک اہانتا سا یقین تھا، بھی ساشا کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے حیرت ہوتی کہ کتنی آسانی سے وہ اسے اور اس کی زندگی کو بدل چکی ہے کوئی رابطہ نہ ہونے کے باوجود... اس کے بارے میں سوچنا شیوکیل کا ایک واحد پسندیدہ مشغلہ تھا، اپنے دل کی بدلتی کلیات پر وہ حیران نہیں تھا، یہ احساس بہت اہمیت کا تھا کہ اس دنیا کے کسی حصے میں ایک ایسا

انسان موجود ہے جو اس سے ملنے کے انتظار میں ہے، جس نے اسے یاد رکھا ہوا ہے، ہاں، اس کے دل کو یقین تھا کہ ساشا نے بھی ایک دن کے لیے اسے نہیں بھلایا ہوگا، جس طرح وہ اسے نہیں بھولا، وہ آج بھی اس کی آنکھوں کے اس تاثر کو نہیں بھول سکا تھا جو آخری بار اس نے ساشا کی آنکھوں میں دیکھا تھا، جس کے زیر اثر آج بھی اس کے دل و دماغ تھے، بہت شدت کے ساتھ وہ تیسرے ماہ کے اختتام اور طے شدہ تاریخ کا انتظار کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت زیادہ پر جوش تھا، مقررہ تاریخ اب بہت قریب تھی، ساشا کی آواز مستقل اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی، وہ زندگی میں پہلی بار اتنا خوش تھا کیونکہ وہ کسی کے لیے چند کامیابیاں حاصل کر کے جا رہا تھا، ساشا نے اس کے لیے کیا، کیا حاصل کیا ہے، یہ خیال اسے بہت اکیسا بیٹھ کر رہا تھا۔

مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے اس نے سفر کا آغاز کرنے کی تیاری کر لی تھی، برقیاری نے شہر کے معمولات کو کچھ ڈسٹرب کر دیا تھا، وہ جانتا تھا کہ شمالی حصے میں پہاڑوں پر برف کے طوفانوں کا آغاز ہو چکا ہے، یہ چیز اسے بہت فکر مند کر رہی تھی، وہ کرائے پر ایک فوکر لے کر جا رہا تھا مگر ساشا اتنے خراب موسم میں وہاں کس طرح پہنچ سکے گی، ان پہاڑوں پر پورا سال برف پڑتی تھی اور اب تو وہاں طوفانی ہواؤں کے ساتھ برف پڑ رہی تھی، بہر حال وہ واپس نہیں تھا، بہت اچھی امیدوں کے ساتھ وہ اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایسے خراب موسم میں ان پہاڑوں کا رخ کرنا اپنی جان جو کھم میں ڈالنے کے مترادف تھا، مگر ایک انجانی سی طاقت نے اسے ہر خطرے کو باریک بینی سے دیکھا تھا، وہ حوصلہ عطا کیا تھا۔ فوکر کو کسی محفوظ جگہ اتارنے

میں کافی وقت لگ گیا تھا، جس وقت اس نے زمین پر قدم رکھا ہر برف میں جنس رہے تھے ہر چیز برف میں چھپی ہوئی تھی، کچھ رات جو برف کا طوفان آیا تھا اس کی شدت میں بہت حد تک کمی آگئی تھی، مگر برف مسلسل گر رہی تھی۔ بج بڑے ہواؤں سے اس کا وجود محفوظ تھا، کیونکہ سر سے ہر تک وہ گرم اور بھاری لباس میں ملیں تھا۔ مگر اس کا چہرہ سردی کی شدت سے سفید پڑ چکا تھا، برف میں دھنستے پیروں کو کھینچتا وہ اسی مانوس درخت تک پہنچا تھا، وہاں بیٹھتے ہوئے اس کا انتظار شروع ہو چکا تھا مگر ابھی صبح کے 7 بجے تھے، سورج کا نام و نشان تک نہ تھا، ہر طرف لگسا لگسا اندھیر اور برقی برف دکھائی دے رہی تھی۔ برقی ہواؤں سے چہرہ بچانے کے لیے اس نے منظر کو ناک تک لپیٹ لیا تھا، اس کے اندر جوش دلولہ یہ برفانی ہوائیں ٹھنڈا نہیں کر سکتی تھیں۔

وقت بہت سستی کے ساتھ گزر رہا تھا، اس کی آنکھیں ہر اس سمت کو جانچ رہی تھیں جہاں سے ساشا کے آنے کی امید اسے ہو سکتی تھی، اس کے بارے میں ہی سوچتا وہ وقت کے جلد از جلد گزرنے کا انتظار کر رہا تھا، تاکہ وہ وقت آجائے جب وہ اپنی محسن سے ملے گا، اسے بتائے گا کہ وہ اس کے لیے کیا کر چکی ہے، اسے اور اس کی زندگی کو ایک ملاقات میں کس قدر حیرت انگیز طور پر بدل چکی ہے۔ جو اس نے کیا، ایسا کچھ بھی کسی نے اس کی زندگی کے لیے نہیں کیا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتا جا رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، یہاں آتے ہوئے دل کو جو دھڑکا سا لگا تھا وہ اب بڑھنے لگا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ راستہ بھول گئی ہو“۔ یہ خیال آتے ہی وہ درخت کے پاس سے اٹھ گیا تھا اور اس پاس کے حصے میں چاروں طرف گھومنا شروع کر دیا تھا، اس امید پر کہ شاید ساشا کی موجودگی کے آثار دکھائی دے جائیں اور وہ خود اس تک پہنچ جائے، مگر

بہت دیر گزرنے کے بعد بھی اسے کوئی آثار دکھائی نہ دینے نہ کوئی مانوس پکار سنائی دی تھی۔ ایک عجیب سے خوف نے اسے گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی زندگی سے نفرت نہیں کرنا چاہتا تھا، دوبارہ اپنی زندگی کو فنا نہیں کرنا چاہتا تھا، دوبارہ تنہا نہیں ہونا چاہتا تھا، جیسے جیسے شام سر پر آرہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ اس کا صبر کا اختتام ہو رہا ہے، اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی یا پھر وہ ہانگوں کی طرح چیخا چلنا شروع کر دے گا، اپنے آپ کو کوسے کا یا پھر عورت، وعدے اور وفاداری سے اس کا اعتبار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

پہاڑوں پر اس موسم میں شام اور دن بہت مختصر ہوتے ہیں مگر وقت نہیں... شام کے گانچ رہے تھے اور رات، کا اندھیرا ہر سمت پھیلنے لگا تھا، اس کا جذبہ جواب دے گیا تھا، وہ یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ ساشا نے اسے دھوکہ دیا ہے، وہ اسے بھول چکی ہے، یا واقعی طور پر وہ اسے خودکشی سے روکے رہنے کے لیے ایک سراب کے حوالے کر گئی تھی، اس کا دماغ اشتعال سے تپ رہا تھا مگر دل حد سے بے چارہ چور تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، دل مستقل دماغ کے خلاف تھا، اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ساشا نے اسے دھوکہ نہیں دیا وہ یقیناً اسے نہیں کہیں ملے گی، دل کا شور اس حد تک بڑھا کہ وہ انتہائی جنون کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا، اگر اس کا دل سچ کہہ رہا ہے تو وہ ایک جگہ زکا نہیں رہے گا، ہر حال میں اسے ہر طرف تلاش کرے گا، وہ ایسی جگہ تکسکی کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا، اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا، ایک بار پھر طوفان نے شدت اختیار کرنی شروع کر دی تھی، برف پر بھاگتے ہوئے وہ کئی بار اس میں جنس کر گیا تھا، تھک کر رکتے ہوئے اس نے چاروں سمت نظریں دوڑائی تھیں، کہیں کوئی کپ بھی نظر نہیں آ رہا تھا، برف کا طوفان اسے زیادہ دور تک دیکھنے کی اجازت نہیں

دے رہا تھا۔ مگر وہ ہار نہیں مان رہا تھا۔
”ساشا... ساشا...“ وہ حلق کے بل چیخا ہے
سمت بڑھتا جا رہا تھا۔

”ساشا... سیش... سیش...“ بھیا تک جھکڑوں نے اسے برف پر اونڈھے منہ کر دیا تھا، اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک وہ اسی حالت میں طوفان کی زد میں بڑا رہا تھا، اس کا حلق پکارتے پکارتے پھل چکا تھا، اب کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، اسے سچ کو قبول کر لینا چاہیے تھا، زندگی میں ہر چہرہ آپ، کو دوبارہ دکھائی نہیں دیتا، حالانکہ آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں مگر نہیں دیکھ پاتے، وہ چہرے رہنمائی کے لیے آپ کی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں، آپ کو منزل کا پتہ دے کر خود کہیں کم ہو جاتے ہیں۔

ہر سمت اب تاریکی اور برف کا شور چٹا چٹا طوفان تھا، بمشکل وہ اپنے پیروں پر اٹھا تھا، اور بے سمت خود کو آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا، اس کے ہر انداز میں جھکن تھی، مایوسی تھی، وہ قدرت سے ہار گیا تھا، ساشا نے لہجہ کہا تھا آج کی تاریخ فیصلے کی تاریخ تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ جیت کس کی ہوگی، مگر بس یہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ ہار چکا ہے، بھیا تک طوفان کے بے پرواہ وہ اس چل جا رہا تھا، چلتا جا رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، کسی بھی وقت برف اس کی قبر بن سکتی تھی مگر اس کی ساری حیات مر چکی تھیں، برف بن چکی تھیں۔

برفانی ہواؤں کے جھکڑوں سے آنکھوں کو جاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دیکھا، اسے دور درختوں کے جھنڈے کے اوپر کچھ دھواں سا پھیلنا نظر آ رہا تھا، حیرت اس کا جانب جاتے ہوئے اب وہ ایک چھوٹا سا کیمپن دکھائی دینے لگا تھا، دھواں اسی کیمپن کی چینی سے نکل رہا تھا، اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جنگل کے لرپے سے کیونکہ عموماً ایسے کیمپن جنگل میں شکار کے لیے یا کیمپنگ کے لیے آنے والوں کی سہولت کے

لیے موجود ہوتے تھے، یہ کیمپن بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھا، لہذا وہ طوفان سے بچنے کے لیے وہاں پناہ لے سکتا تھا، چنی سے اٹھتے دھوئیں سے پہلے ہی یہ ظاہر تھا کہ کیمپن میں کوئی انسان موجود ہے، دروازہ اندر سے لاک تھا، اس نے طوفان کے شور کی وجہ سے بہت زوردار آواز میں دروازے کو دھڑ دھڑا دیا تھا، ایک بار نہیں دو مرتبہ بار مگر دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اندر سے کسی کے کھانسنے کی مدہم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اندر جو کوئی بھی تھا وہ اس کے لئے دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا۔

”تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس طوفان کے رکنے تک یہاں پناہ لینے دو، تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا“۔ اس بار دروازہ پینٹے ہوئے وہ بلند آواز میں چیخا تھا اور کامیاب ہوا تھا، کیونکہ اس بار دروازہ اندر سے کھل گیا تھا۔ سرعت سے اندر داخل ہو کر اس نے بمشکل طوفانی ہوا کو پچھاڑتے ہوئے لکڑی کے دروازے کے ہینڈل کو دیوار میں نصب ہک میں اٹکا دیا تھا، اپنے لباس سے برف جھاڑتے ہوئے اس نے فری ٹوٹی کمر سے اتار کر اس انسان کو دیکھا تھا جو آتش دان میں لکڑیاں ڈال رہا تھا، اس کی پشت سے نظر ہٹا کر شیونیل نے کیمپن کا جائزہ لیا تھا جو کہ بہت چھوٹا سا تھا، کیمپن میں آتش دان میں سلتی آگ کی تاریخی روشنی ہی چمکی تھی، یہ کیمپن بہت بوسیدہ لگ رہا تھا، باہر طوفان کی بھیا تک آوازیں عروج پر جاری تھیں، پتہ نہیں یہ کمزور سا کیمپن طوفان کی شدت کو برداشت کر سکے گا بھی یا نہیں، فری ٹوٹی دوبارہ پینٹے ہوئے وہ بے اختیار آگ کی حرارت لینے آتش دان کے قریب بڑھا تھا مگر چاک اس کے قدم لکڑی کے فرش پر جم گئے تھے، نظریں اس کے چہرے پر ساکت تھیں جو یک تک آتش دان پر چھتی لکڑیوں سے اڑتی چنگاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنے لمحوں تک وہ ٹرائس کی سی کیفیت میں اس کو پچھاننے

کی کوشش کر رہا تھا جو اس کی موجودگی سے بالکل غافل نظر آرہی تھی، اس کے بڑھتے قدموں کی آہٹ پر بھی متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

بچوں کے بل بیٹھا وہ چند لمحوں تک دنگ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی، مگر وہ اس کے چہرے کو کیسے بھول سکتا تھا، یکدم وہ اس کے شانوں کو ہاتھوں میں جکڑ کر اپنی طرف متوجہ کر چکا تھا۔

”میں صبح سے ہاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں، تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ نہیں جانتا اسے کیا ہوا تھا مگر وہ چیخ اٹھا تھا، ”وہ اسے اٹھا کر شیخ دینا چاہتا تھا۔ بے رونق زرد آنکھیں پھیلانے وہ چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھپکتے غصے اور تیرنی نمی کو دیکھتی رہی تھی، اس کے سونے کے لب بچھ گئے تھے، اگلے ہی لمب وہ ایک جھپکے سے اسے پرے ہٹا چکی تھی، ایک لمبے کو وہ شدید بے یقینی سے اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں اسے لئے اجنبیت کو دیکھتا رہا تھا۔

”مجھے بتاؤ... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس بار وہ بولا تو لہجہ بدتم تھا۔

”اپنی موت کا انتظار...“ اس کا برف جیسا رخ لہجہ شیونیل کو دنگ کر گیا تھا۔

”مگر کیوں...؟“

”کیونکہ یہی ایک ایسا کام ہے جس کے لئے مجھے دھکے، ٹھوکر س نہیں کھانی پڑیں گی، اور نہ ہی ذلت اٹھانی پڑے گی“ اس کے لرزے سر دلچے پر وہ بس ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، جس نے چہرے کے ایک بیک کو آتش دان کے قریب کیا تھا اور پھر اس پر سر رکھتی ٹھنڈی نم لٹ تھی۔

شیونیل کو وہ ایک لاش کی طرح نظر آرہی تھی، اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

”طوفان رکنے کے بعد تم چلے جانا، اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا، میں اپنی

موت کا انتظار نہیں کروں گی، میری خودکشی کے ذمہ دار تم ہو گے، آج یا کل مجھے مرنا تو ہے، کھا لینا میری لاش کو ورنہ چھوڑ دینا بھوکے بھیڑیوں کے لئے۔“ بند آنکھوں کے ساتھ وہ کپکپاتی آواز میں بولی تھی اور چہرہ بازوؤں کی پٹنجی میں چھپا لیا تھا، سنائے میں گھرا وہ اس کی ٹھنڈی کھانسی کی آوازیں سن رہا تھا، کبکین کی چھت سے درختوں کی ٹکرائی شاخوں کا شور گون رہا تھا، باہر طوفان غضب ناک رخ اختیار کر چکا تھا۔

گلوڑی کے فرش پر سبز کرلیٹی وہ ٹھنڈی کھانسی کے ساتھ کانپ بھی رہی تھی، اس کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی، جس کے دل و دماغ میں بھونچال اٹھ رہے تھے۔

”ساشا! مجھے بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کیوں مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہیں پہچانا چاہتیں؟“ سوال کرتے ہوئے وہ رکا تھا، اسے ایک بار پھر کھانسی کا دورہ اٹھا تھا، شیونیل سرعت سے بیک سے پانی کی بوتل نکالتا اس کی طرف کیا تھا۔

”پانی پیو“۔

”مت آؤ میری موت کے راستے میں“۔ چہرہ بازوؤں میں چھپائے وہ چپٹی تھی۔

”تم کیوں مرنا چاہتی ہو؟“ چند لمحوں بعد شیونیل نے سوال کیا مگر اس نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

”اگر تم مرنا چاہتی ہو تو مجھے خودکشی سے کیوں روکا تھا تم نے؟ کیوں اپنی سنہری باتوں میں الجھا کر مجھے موت کے راستے سے بھٹکا یا تھا؟“ وہ بچھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”میں تمہیں نہیں جانتی، اب اپنا منہ بند کرلو“۔

چہرے سے ہاتھ ہٹائے بغیر وہ غرائی تھی، یکدم شیونیل کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا تھا، آخر وہ بھی تو اسی مرحلے سے گزر رہا تھا، جس میں موت اور مرنے کے علاوہ کچھ بھائی نہیں دیتا، اس وقت بہت مضبوط اور نرمی کے مظاہرے کی ضرورت تھی۔

”ساشا! تم نے مجھے دوست کہا تھا مگر سمجھا نہیں، لیکن میں نے تمہاری ہر بات مانی تھی، تم نے مجھے یقین دیا تھا کہ تم میرے ساتھ ہو... کیا تمہیں یاد ہے کہ ہمارے درمیان تین ماہ پہلے ایک عہد ہوا تھا، ایک مقابلہ بھی؟ تمہیں یاد ہے کہ آج قیلے کی تاریخ تھی، تین ماہ پہلے ہم جدا ہوئے تھے آج کے دن ملنے کے لئے؟“ وہ اسے بولنے پر افسوسا رہا تھا مگر وہ بس چہرہ چھپائے ٹھنڈے سے ٹھہر رہی تھی۔

”کیا تم نہیں جانتا جا ہوم کی تین ماہ میں، میں نے کیا، کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں تمہارے لئے؟ میں کتنا خوش تھا یہاں آتے ہوئے کہ تم سے ملوں گا، بہت ساری باتیں کرنی تھیں تم سے اور...“

یکدم وہ خاموش ہوا تھا کہ ساشا ایک جھپکے سے اٹھ بیٹھی تھی مگر وہ شیونیل کی طرف متوجہ نہیں تھی، کانٹے ہاتھوں سے اس نے اپنے بیک سے کوئی چیز نکالی تھی اور شیونیل کی جانب پھینک دی تھی، وہ چیز اس کے سینے سے ٹکرائی اب نیچے پڑی تھی، خاموشی سے وہ اسے دیکھتا رہا تھا، جو ایک بار پھر بیک پر سر رکھتی گلوڑی بن چکی تھی، گہری سانس لے کر شیونیل نے اپنی رست واپس اٹھائی تھی۔

”تم میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہی ہو ساشا! میں یہاں تک صرف تمہارے لئے آیا تھا، تم کہیں نظر نہ آئیں تو میں ہاگلوں کی طرح تمہارا نام لے کر چیخ رہا تھا، پکار رہا تھا تمہیں، یہ طوفان بھی مجھے دھپکے چلے جانے پر مجبور نہیں کر سکا، کیونکہ میرے دل کو یقین تھا کہ تم یہاں ہو، میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔“

وہ جھپکے جھپکے لہجے میں بولتا اس کے لاغر وجود کو دیکھ رہا تھا جو ہر تھوڑی دیر بعد کھاس رہی تھی، شیونیل کا دل اس کی حالت پر پھٹل رہا تھا جو بات تک کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، تب ہی اسے دیکھتے ہوئے شیونیل بکھ چوکا تھا، ساشا کے سر پر وہی ادنی اسکارف تھا، اس کے وجود پر وہی کوٹ تھا جو پہلی ملاقات میں اس

نے زیب تن کیا ہوا تھا، اس کے جوتے بدرنگ اور مٹی دھول سے ابٹے ہوئے تھے، شیونیل کی دنگ نظریں تیزی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں، اسے دیکھ کر اندازہ لگانا اب مشکل نہیں تھا کہ اس نے کئی دنوں سے کوئی بہتر خوراک نہیں لی ہے، وہ قافہ زدہ دکھائی دے رہی تھی، اس کے کمزور وجود پر موجود لباس بوسیدہ تھا جو اسے برفانی ہواؤں سے بچانے رکھنے کے لیے ناکافی تھا، وہ کون کون سی صوتیں اٹھاتی رہی ہے اور کیوں؟ یہ پوچھنے کیلئے شیونیل کو اس کی تاکید بھلا کر اس کے قریب جانا پڑا تھا، اس سے پہلے کہ وہ بچہ کر محرومیت کرنی شیونیل نے سرعت سے اس کے ہاتھ پکڑ کر روک لئے تھے۔

”جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دے دو، اس کے بعد میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا، جواب نہیں دو گی تو ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔“ اس کے قطعی لہجے پر ساشا نے چند لمحوں تک اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے ٹکالنے کی کوشش کی تھی مگر پھر ناکام ہو کر شعلہ بار نظروں سے اس کے چہرے کو ٹھونکنے لگی تھی۔

”تم یہاں کب آئیں گے؟ اتنے خراب موسم میں تم کیسے یہاں پہنچیں؟“ اس پر جھکا وہ جواب اس کی آنکھوں میں بھی ڈھونڈ رہا تھا مگر ساشا سختی سے لب بچھے چہرہ دوسری طرف پھیر گئی تھی۔

”میں اب تمہارے منہ پر پھینک مارنے والا ہوں، جواب دو مجھے، کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ میں گھنٹوں سے یہاں بٹک رہا ہوں تمہارے لئے اور تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہو۔“ اس کی ضد اور ڈھٹائی نے شیونیل کا ضبط ختم کیا تھا جو وہ اس پر چننا تھا۔

”صرف گھنٹوں میں گھبرا گئے، میں یہاں کئی دنوں سے اپنی موت کے لیے بٹک رہی ہوں۔“ ساشا کے سر دلزتے لہجے پر وہ ساکت رہ گیا تھا۔ دوسری جانب وہ اس کی کمزور پڑتی گرفت سے ہاتھ چھڑائی اٹھ بیٹھی تھی۔

MOVEETA®

The Touch of Softness

Quality Tissue No More An Issue

نفاست اور سہولت موویتا شوکی بدولت

VIRGIN PLUS سے تیار کردہ پاکستان کا واحد پرنٹڈ نشہ

ایکٹر ملائم، ایکٹر احتقان صحت، ایکٹر سہولت

جذب کرتے آسانی سے صاف کرتے روانی سے

Super Soft

لڑا دہ کھات ... زیادہ نفاست

Perfumed Sandoog

دلاؤ بر خشیو سے ہر پور نشہ بچہ

Super Soft Roll
& Kitchen Roll

نرورت بھی ... سہولت بھی

دیکھ کر اس کے حواس اڑ گئے تھے۔

”ساشا...“ حلق کے بل چیخا وہ برق رفتاری سے کسی چھلاوے کی طرح اس تک پہنچا تھا، شدید تکلیف سے وہ کراہ اٹھا تھا، بھاری لکڑیاں ایک کے بعد ایک اس کی پشت پر گرتیں ریڑھ کی ہڈی کو چٹا رہی تھیں، دونوں ہاتھ اس کے ساکت وجود کے اطراف فرش پر جمائے وہ جھکا بمشکل ان وزنی لکڑیوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھا، اور وہ جو ایک لمحہ پہلے موت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر نجات کا سوچ رہی تھی، اب بے حس و حرکت گنگنگا ہوں سے اس کو تک رہی تھی جو اس کی ڈھال بنا ہوا تھا۔

”جلدی نکلو، میں اور نہیں روک سکوں گا۔“ وہ اذیت سے چیخا تھا۔

ساشا کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی تھی، تیزی سے رینگتی وہ اس کے حصار سے تکی چلی گئی تھی۔ ایک جھٹکے سے لکڑیوں کے بوجھ سے لٹکا وہ دیوار سے جا ٹکرایا تھا، گہری گہری سانسیں بھرتے ہوئے شیونیل نے چھت کو دیکھا تھا، وہاں سپورٹ کے لیے اب بھی کچھ لکڑیاں اپنی جگہ پر قائم تھیں، مگر کوئی بھر و سہ نہیں تھا، یہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی، دوسری نگاہ شیونیل نے اس پر ڈالی تھی جو سامنے ہی کیمین کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

”کتنا اچھا ہوتا اگر تم یہاں نہ ہوتے۔“ ساشا نے کا پتی آواز میں دیوار کا سہارا لے کر چلنا چاہا تھا مگر بری طرح لڑکھائی تھی، شیونیل سرعت سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

”ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“ ہانپتے ہوئے وہ اسے بڑے دھکیل گئی تھی۔

”رک جاؤ ساشا!“ شیونیل کی آواز پر وہ اور تیزی سے دروازے کی سمت بھاگی تھی، مگر اگلے ہی پل وہ منہ کے بل فرش پر بکھر گئی تھی، شیونیل نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھنے میں مدد دینی چاہی تھی، تب ہی

”میں تین ماہ سے یہیں موجود اپنی موت کے انتظار میں ہوں کیونکہ میں اس دنیا میں واپس نہیں جانا چاہتی جہاں ہر دوسرا مرد مجھ پر ہاتھ صاف کرنے کی نیت رکھتا ہے، میں ڈر کر نہیں لیتا چاہتی، اسٹریٹ وا کر نہیں بننا چاہتی، میرے لئے دولت حاصل کرنا مشکل نہیں مگر میں زمین پر قدم جمانے کے لیے گندگی میں نہیں اتر سکتی... تم جہاں سے آئے ہو، واپس چلے جاؤ، مجھے میرے راستے پر جانے دو۔“ بلند آواز میں چیختی وہ پھٹ پڑی تھی۔ شیونیل بس دنگ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، جو بیک آئل دان سے دور ہٹائی اب کیمین کے وسط میں کھڑی بن چکی تھی۔

اس جگہ پر چند دن سے زیادہ قیام کرنا ناممکن تھا، یہ جگہ ایک جتنے جتنے انسان کے لیے برف کا جہنم تو بن سکتی تھی مگر زندگی گزارنا یہاں اپنے آپ میں خود کشی کی جانب پہلا قدم تھا، وہ تین ماہ سے دن رات یہاں عس طرح سانس لے رہی تھی، شیونیل کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھی؟ پتہ نہیں کتنے لمحوں تک وہ اس لڑتے، کانپتے وجود کو تکتا رہا تھا، حالات سے مقابلہ کرتے کرتے یہ تھک کر ٹوٹ جانے والی کمزور لڑکی اپنی موت کا انتظار کرتی اس کی روح تک کو بچھوڑ گئی تھی۔

باہر جاری طوفان کی چنگھاڑیں کیمین کی خستہ حال دیواروں سے ٹکرائی تھیں، ساکت بیٹھا وہ وقتاً فوقتاً ابھرتی کھانسی کی آوازوں کو سن رہا تھا، دل میں کوئی چیخ رہا تھا کہ وہ اسے اس طرح سسک سسک کر موت کے راستے پر جاتا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اس سے کیمین زیادہ جو وہ اس کے لیے کر چکی تھی، اب اس کی باری تھی، کچھ چونک کر سر اٹھا تا وہ کیمین کی چھت کو دیکھنے لگا تھا، چھت کو سپورٹ دینے کیلئے بھاری لکڑیاں نصب کی گئی تھیں، خطرہ بھاٹنے میں اسے دیر ہو گئی تھی، تیز چرچاہٹ کے ساتھ لکڑیوں کو ایک کے پیچھے ایک نیچے کی طرف آتے

نے اس کی جمل فصل آنکھوں میں جھانکا تھا۔

☆.....☆.....☆

زناتے دارچٹروں کی بارش نے اس کے وجود کو سن کر دیا تھا، کانوں تک وہ ذلت و اذیت سے سرخ ہو گئی تھی۔

”میں نے جنہیں شریف اور تنہا لڑکی سمجھ کر اپنی بچیوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے گھر میں جگہ دی، مگر تم تو اول درجے کی آوارہ اور بدکردار ثابت ہوئی ہو، مجھے پہلے ہی تم پر شک تھا، تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی میرے شوہر کو ہراساں کرنے کی، اسے میرے خلاف درغلانی کی؟“ کمال پر ہاتھ رکھے وہ ساکت نظروں سے اس خوفناک عورت کے عتاب کو دیکھ رہی تھی، جو اس پر چینی چکھاڑتی الزامات کی بارش کرتی دونوں چھوٹی بچیوں کے سامنے اسے زمین میں اتار رہی تھی۔

”اچھی طرح جانتی ہوں میں تم جیسی عورتوں کو جو نوکری کے بہانے گھروں میں جگہ بناتی ہیں اور پھر گھر کی مالک بننے کے لیے اوجھے جھگڑے استعمال کرتی ہیں، اب دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کرتی ہوں، یہاں سے واپس جاتے ہی پولیس کو کال کروں گی ایسی رپورٹ بنواؤں گی کہ کسی شریف گھرانے میں تمہیں نوکری نہیں ملے گی، پھر بس مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا“۔ مزید اس کے پرچنے اڑانی وہ عورت پلٹ کر اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئی تھی، جو اپنی سانپ جیسی چنگی آنکھوں سے ساشا کو دیکھتا اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”مجھے اپنی بچیوں کے ساتھ فوراً یہاں سے جانا ہے، مگر یہ ہمارے ساتھ نہیں جانے گی، سامان کیونکہ اب، ہوئی کیسپنگ“۔ اپنے شوہر کو ہدایت دے کر اس نے شعلہ بار نظروں سے ساشا کو دیکھا تھا اور پھر سبھی کھڑی بچیوں کو چھٹی ہوئی کپ کے اندر چلی گئی تھی۔ ساٹ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی

کھانسی کے ایک زوردار جھکے کے ساتھ اس کے منہ سے خون کی بوچھاڑیں نکل کر فرش پر پھیل گئی تھیں، شیونیل کے ہونے ایک پل کے لیے اڑے تھے مگر اگلے ہی پل شیونیل کے سنبھال کر اس نے دوبارہ ساشا کو اٹھانا چاہا تھا، مگر ایک بار پھر خون کا فوارہ فرش کو رنگ گیا تھا، بلند کراہوں کے ساتھ وہ بے دم ہو کر سرواہیں فرش پر گر گئی تھی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شیونیل نے بمشکل پہلے خود کو سنبھالا تھا اور پھر اس کے نیم جاں وجود کو اٹھا کر آتش دان کے قریب لے آیا تھا، زار و قطار روتے ہوئے وہ پانی کے چند ٹھونٹے ہی لپیٹ لی تھی، اس کا وجود بچے کی طرح کانپ رہا تھا، شیونیل نے اپنا ادنیٰ سوسٹر اور گرم کٹ بھی اس کے گرد لپیٹ دیا تھا، اپنے دستانے اور فرکی ٹوپی بھی اسے پہنا دی تھی۔ آتش دان کی دیوار سے پشت لگا کر بیٹھے ہوئے شیونیل نے اس کا سراپے ٹکھنوں پر رکھ لیا تھا۔

”ہمت مت ہارو، سب ٹھیک ہو جائے گا، تم بھول گئی تھیں مگر مجھے یاد ہے کہ میں تمہارے ساتھ تھا اور اب بھی ہوں، تم نے مجھے تنہا چھوڑا تھا پھر میں کیسے جنہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں“۔ مدہم آواز میں وہ اسے تسلی دے رہا تھا جو دھوکے کی طرح چلتی سانسوں کے ساتھ سک رہی تھی۔

”کیوں اتنی اذیت اٹھاتی تم نے؟ مجھے ایک نئی امید دے کر خود کیوں مایوسی کے اندھیروں میں چلی گئیں؟ مجھے سب کچھ دے کر خود کیوں بکھر گئیں؟ تین ماہ اتنا طویل عرصہ تو نہیں ہوتا، میرے لئے تھوڑا سا اور حالات سے مقابلہ جاری رکھیں، کیوں کیا تم نے ایسا؟“ اس کے سوالوں پر ساشا کی سسکیاں بڑھ گئی تھیں۔

”کیا ہوا تھا میرے جانے کے بعد؟ ایسا کیا ہوا تھا کہ تم یہیں کی ہو کر رہ گئیں، دنیا سے ہر تعلق توڑ لیا؟“ اس کا چہرہ اپنی طرف اٹھاتے ہوئے شیونیل

زہر پلے مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے آڑ کا تھا۔ ”دیکھا تم نے اپنی خند کا انجام، تم چاہتیں تو انجام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا مگر... خیر، مجھے افسوس تو ہے لیکن میرا کوئی قصور نہیں، میں نے جنہیں بہت وقت دیا تھا، مگر تم نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا، ویسے ابھی ایک راستہ باقی ہے تمہارے لئے، اپنے فون کی بیٹری کے ختم ہونے تک کا وقت ہے تمہارے پاس، اس جگہ سے تم ایک دن میں نہیں نکل پاؤ گی، بس ایک فون یا میسج بھی کافی ہوگا، ساری مشکلیں حل کر دوں گا تمہاری“۔ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اسے کچھ سمجھا تا وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

اپنا بیک اٹھا کر جانے سے پہلے اس نے یہ کیا تھا کہ بھاری پتھر سے اپنے فون کے پرچنے اڑا دیئے تھے، بے ہمت چلتے ہوئے اس کے دماغ میں دھماکے اور بے ہمتی، بہت فرمانبرداری کر لی تھی اس نے زندگی کی مگر آج جو ہوادہ سب اسے باغی کر گیا تھا، آریا پار، موت یا زندگی، اس کے علاوہ کوئی سوچ اس کے اہن میں نہیں تھی، کہ اب پارا سے ہونا نہیں اور زندگی کی اب ضرورت نہیں۔

☆.....☆.....☆

باہر پہاڑی طوفان کا شور دھیرے دھیرے کم ہوتا ہا رہا تھا، جنین کی چھت سے ٹکراتیں درختوں کی شاخیں ابھی بھی بھری ہوئی تھیں..... مگر پتہ نہیں کیوں سکون و طمانیت کی لہریں شیونیل کو اپنے دل میں لٹکتی محسوس ہو رہی تھیں، اسے خبر تھا کہ ایک بلند اور مضبوط کردار ہستی اس کے ساتھ اس کے قریب

”تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کو گھر کا ڈر واپس اس جگہ آ سکتا تھا، جنہیں یہاں تلاش کر کے کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا، ایسا نہ ہوتا تب بھی یہاں اٹھنا تک جانور ہیں، میں جانتا ہوں، جنہیں اپنی زندگی کی پروا نہیں تھی مگر تم نے ایک بار بھی میرے

بارے میں نہیں سوچا؟ میرا تو ایسا کوئی دن نہیں گزرا جس میں، میں نے تمہارے بارے میں نہ سوچا ہو، کیا ایک بار بھی جنہیں مجھ سے کیا گیا وعدہ یاد نہیں آیا تھا؟“ شیونیل کے سوالوں پر وہ بے بس خاموش تھی۔

”جنہیں یہ تو یاد ہو گا آج ہمارے درمیان مقابلے کا فیصلہ ہونا تھا؟“

”تین ماہ تک میں کس جہان میں تھی مجھے خود خبر نہیں، کب دن ہوتا، کب رات کچھ پتہ نہیں...، جنہیں یہاں دیکھنے کے بعد...“ اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی، کھانسی کا ہلکا سا ایک دوبارہ اٹھا تھا۔

”یانی پیو...“

”نہیں“۔ وہ انکار کر گئی تھی۔

”فیصلہ تو ہو گیا، میں تمہارے لئے کوئی اچھی کامیابی حاصل نہیں کر سکی، جہاں تھی وہیں ہوں، تم جیت گئے میں ہار گئی“۔ وہ لرزتے لہجے میں بولی تھی۔

”نہیں، کامیابی تو وہ ہے جو تم نے حاصل کی ہے، شیطان کے شر سے دور رہ کر، دولت اور آسائش کو ٹھوکر مار کر تم نے اپنے آپ کو میرے لئے بچا کر رکھا ہے، تمہاری یہ ایک کامیابی میری ہر کامیابی پر بھاری ہے“۔ شیونیل کی بات ادھوری رہ گئی تھی، ساشا پر کھانسی کا ہلکا سا حملہ ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات موسلا دھار بارش کے بعد صبح کی یہ ہلکی ہلکی نرم دھوپ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، ہر منظر رات بھر بارش میں دھل کر گھبرا گیا تھا، نم چمکتی سڑک برآتی جانی گاڑیاں، اپنی اپنی منزل کی سمت جاتے لوگ، سب کچھ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا، ان سب لوگوں کے درمیان وہ بھی تھی، اسٹارف گردن میں ڈالے سفید براتی سوسٹر کی پائیکس میں ہاتھ اڑے ہر طرف کا جائزہ لیتی حالانکہ فلیٹ سے اسٹور تک کا واکنگ ڈسٹینس 5 منٹ سے تھوڑا ہی زیادہ ہوگا، مگر

جس طرح وہ ہر شاپ کے سامنے رک کر ڈپلے میں رکھی چیزوں کو بغور دیکھ رہی تھی لگتا نہیں تھا کہ اس کے 10 منٹ میں بھی اسٹور بیچ سکے گی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ آج پھر لیٹ ہو چکی ہے، اس کے انداز میں کوئی جگت نہیں تھی۔

ایک شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے ڈپلے میں رکھی ایک جیکٹ نے اس کے قدم روک لئے تھے۔ آگے بڑھنے کے بجائے وہ فوراً شاپ میں داخل ہو گئی تھی۔

”ہلو ساشا! کیسی ہو؟“ کپڑے بیگز میں لٹکاتی عورت نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”ایک دم پر فیکٹ“۔ وہ مسکرائی تھی۔

”لگتا ہے آج پھر کسی جیکٹ پر دل آ گیا ہے تمہارا؟“

”ہاں، تم بالکل ٹھیک سمجھیں، اس پر جیکٹس بہت سوٹ کرنی ہیں اور یہ والی تو اور بھی زیادہ اچھی لگے گی۔“ مسکراتے ہوئے اس نے وہ ڈارک بیو جینز کی جیکٹ بھی ڈی پر سے اتار لی تھی۔

”بل اسٹور پر ہی بیچ دینا براہ مہربانی۔“ جیکٹ بازو پر ڈالے وہ جانے کے لیے پلٹی تھی۔

اسٹور کے باہر حسب معمول اس نے فلاور شاپ پر رک کر اپنا من پسند ریڈ روزا اٹھا لیا تھا۔

”کام کیسا چل رہا ہے؟“

”بہت اچھا مگر آج باس کا موڈ بہت خراب ہے، صبح صبح لیٹ آنے پر مجھے بہت ڈانٹ پڑی ہے اور تم مجھ سے بھی زیادہ لیٹ آتی ہو۔“ سیزمین نے اسے خبردار کیا تھا۔

”اس کا موڈ ہمیشہ خراب ہی رہتا ہے، اس کی ساری خوش اخلاقیات بس کسٹمرز کے لیے ہی ہوتی ہیں۔“ لاپرواہی سے بولتی وہ اسٹور کی جانب بڑھی تھی۔

دھیرے سے گلاس ڈور کھلتی وہ اندر داخل ہوئی

تھی، سامنے ہی وہ شاپ پر کام کرنے والے لڑکے کے سر پر کھڑا سامان کے کاشن ترتیب سے رکھوا رہا تھا، ایک ہی گاہک تھا جو کاؤنٹر سے اپنا سامان سمیٹ کر جانے ہی والا تھا، دبے قدموں وہ کاؤنٹر کی جانب بڑھی تھی۔

”ساشا! یہاں آؤ۔“ عقب سے ابھرتی آواز پر اس کے قدم رک گئے تھے، گہری سانس لے کر اس نے کاؤنٹر کے پیچھے موجود سیزمین کو دیکھا تھا جو مسکراتے ہوئے دوبارہ بل بنانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

رست و راج میں وقت دیکھنے کے بعد اس نے اسٹور سے نکلنے کا گاہک کو دیکھا تھا اور پھر کافی ناگواری سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو ہدایت کے مطابق سامنے آ کر کھڑی تھی۔

”مجھے ایک بات بتاؤ، تم اس اسٹور میں کام کرنے آتی ہو یا تفریح کرنے؟ دو دن پہلے ہی میں نے تمہیں وقت کی پابندی نہ کرنے پر اسٹور سے فارغ کرنے کی بات کی تھی، مگر مجھے اسی دن تمہیں یہاں سے نکال دینا چاہئے تھا، آج دیر سے آنے کا کیا بہانہ ہے تمہارے پاس؟“ عصبانی نظروں سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

”وہ...“ ایک پل کو رک کر ساشا نے اسے دیکھا تھا۔

”میری طبیعت صبح کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“

”میں کسی دوسرے سارے سے نہیں آیا ہوں، جو تم مجھے اپنی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی اطلاع دے رہی ہو۔“ اس کے سفید جھوٹ پر وہ بھڑک اٹھا تھا۔

”تمہارے روز روز کے بہانے میرے گلے تک آچکے ہیں، یہاں کام کرنا ہے تو ڈپلے سے در نہ من مانی کی اجازت کسی کو نہیں دوں گا۔“ اس کا لیکچر جو شروع ہوا تو سب ہی لیپٹ میں آنے لگے تھے۔

”اب رکی کیوں ہو، جاؤ جا کر اپنا کام سنبھالو۔“

اس کے بری طرح جھڑکنے پر ساشا کا چہرہ سخت سے مزید سرخ ہو گیا تھا، اگلے ہی پل اس نے بازو میں لٹکی جیکٹ اس کے ہاتھوں میں تقریباً چلتی تھی اور پھر کاشن کو اٹھاتے لڑکے کو آواز دی تھی۔

”یو پکڑو اسے۔“ عصبانی انداز میں ساشا نے ریڈ روز اس لڑکے کی سمت بڑھایا تھا جو حق درق ہو گیا تھا، مگر اس سے پہلے شیوئیل نے وہ ریڈ روز ساشا سے چھیننے والے انداز میں لے لیا تھا۔

”اپنا کام کرو۔“ شیوئیل کے گھر کرنے پر وہ لڑکا فوراً پیچھے ہٹ گیا تھا جبکہ ساشا پہلے ہی بگڑے تیوروں کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف آ گئی تھی۔

”تم ناشتے میں اسے کتنی مرچیں دیتی ہو؟“ سیزمین نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا اور اسٹور کا نفوس ایجن اور کپ اس کے حوالے کیا تھا۔

”اس سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے؟“ ایجنر نے ہنسنے لہجے میں بولی تھی۔

”اوکے... اوکے، اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو ورنہ کسٹمرز کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش نہ آنے پر تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی بیکسر سننا پڑے گا۔“

سیزمین نے ہنستے ہوئے التجائی تھی، تھوڑی دیر بعد وہ اپنی مسکراتے ہوئے کسٹمر کو ڈیل کر رہی تھی، اس ناظم بہت بڑھ جاتا تھا، سیزمین کے ساتھ ساتھ وہ بھی کھنچ کر کھینچ رہی تھی، شیوئیل فارغ ہوتا تو وہ بھی ان دلوں کی مدد کے لیے کاؤنٹر پر آ جاتا تھا، وارننگ کے باوجود اسٹور میں کام کرنے اپنی مرضی کے وقت پر آتی تھی مگر شام ہوتے ہی اسے اسٹور سے جانا ہوتا تھا، پھر اس کی جگہ مستقل شیوئیل کو سنبھالنی ہوتی تھی۔

کاؤنٹر کی طرف جو سامان ختم ہوا تھا، اسے لئے وہ گودام میں آتی تھی، کاشن ہاتھوں میں سنبھالے وہ پلٹی گئی جب شیوئیل اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا تھا۔

”سنو! میرے لئے جیکٹ لیتے ہوئے تم نے اس کی قیمت پر نظر ڈالنے کی زحمت کی تھی؟“

”تم نے اس کی قیمت دیکھ لی، کیا یہ کافی نہیں؟“ وہ ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی تھی۔

”ہاں صرف دیکھنا کافی نہ تھا، مجھے اس کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے، لیکن پھر بھی تمہارا شکریہ۔“

”اب سامنے سے ٹو، مجھے جانا ہے۔“ خاطر میں لائے بغیر وہ بولی تھی۔

”تم نے بچ کرنے سے انکار کیوں کیا؟“

”یہ سوال کرنے کی اب بھی ضرورت ہے؟“ وہ ناگواری سے بولی تھی۔

”غلطی تمہاری تھی، اور میرے لئے اسٹور پر کام کرنے والا ہر ملازم برابر ہے، نہ میں غیر ذمہ دار ہوں اور نہ غیر ذمہ داری برداشت کر سکتا ہوں، یہ تم جانتی ہو، اب ناراضی دور کرو، یہاں بچ نہیں کرنا تو میرے ساتھ باہر کہیں بچ کے لیے چلو۔“

”نہ مجھے نہیں جانا ہے، نہ تم سے کوئی بات کرنی ہے، سامنے سے ٹو ورنہ یہ کاشن تمہارے سر پر دے ماروں گی۔“ وہ بھڑک کر بولی تھی۔

”مج میرے غصہ کرنے کا تو صرف ایک بہانہ ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں تنگ کر رہی ہو۔“ اسے راستہ دیتا وہ شکایتی لہجے میں بولا تھا۔

”جب جانتے ہو تو مانتے کیوں نہیں میری بات؟“ وہ جھلائی تھی۔

”کیونکہ نہ میں وہاں جانا چاہتا ہوں اور نہ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

”یہ بات تم پہلے بھی کر چکے ہو اس لئے پورمت کرو اب۔“ ساشا نے فوراً اس کی بات کاٹی تھی۔

”اس ویک اینڈ پر تم مجھے وہاں لے جا رہے ہو بس۔“ قطعی لہجے میں اس نے فیصلہ سنایا تھا۔

”صیش...“ شیوئیل کی جھلائی آواز ان سن کر

کیے وہ کاؤنٹر کی جانب بڑھتی اس وقت یکدم رکی تھی جب اسٹور میں داخل ہوتا شخص خود بھی اسے دیکھ کر دنگ سا ہوا تھا، ساشا کا چہرہ بس ایک پل کے لیے ہی

سفید ہوا تھا، مگر اگلے ہی پل وہ اپنی طرف بھاگتی بچیوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، جن کے لیے آج بھی اس کے دل میں بے تحاشہ محبت موجود تھی۔ گھنٹوں کے بل بیٹھ کر اس نے دونوں بچیوں کو گلے سے لگایا تھا اور پھر نظر اٹھا کر شیونیل کو دیکھا تھا جس کے لیے یہ بچیاں اور ان کا باپ کسی تعارف کا محتاج نہیں تھے۔ لہذا اس شخص کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے میں شیونیل نے دیر نہیں کی تھی۔

”ساشا سے آپ سب کا اتنا ذکر سنا ہے کہ کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہی۔“ بظاہر وہ مسکراتے ہوئے اس شخص سے مخاطب ہوا تھا ورنہ حقیقتاً وہ اس شخص سے ہاتھ ملانے کے بجائے اس کے منہ پر گھونے رسید کرنا چاہتا تھا۔ جس ہستی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، یہ شخص کس طرح اس ہستی کو ہر اس سال کر کے موت کی آرزو کرنے پر مجبور کر چکا تھا، بہت مشکل تھا اس کے لیے ساشا سے کئے گئے وعدے کو نبھانا، کم از کم اس وقت جب وہ شخص اس کے رو برو موجود تھا۔ شیونیل کی خوش اخلاقی اس کی آنکھوں کا ساتھ نہیں دے پاری تھی اور یقیناً اسی لئے اس شخص کا چہرہ فتن تھا، اس کے لیے یہ صورتحال بہت اچانک تھی۔ شیونیل کے لہجے میں ساشا کے لیے جو استحقاق تھا، وہ اس شخص کو اتنا الجھا گیا تھا کہ کچھ بول بھی نہیں سکا تھا، شیونیل نے اس شخص کی نظروں کے تعاقب میں ایک نظر ساشا کو دیکھا تھا جو بچیوں سے باتیں کرتے ہوئے ان کو چاکلیس دے رہی تھی، وہ واقعی بچیوں سے مل کر بہت خوش تھی۔

”ساشا آپ کی بیٹیوں سے بہت پیار کرتی ہے، بہت خوبصورت بچیاں ہیں آپ کی۔“ شیونیل کی چبھتی نظروں نے اس شخص کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کیا تھا۔

”وہ میری بچیوں پر بہت ہی مہربان رہی ہیں، وہ خود بہت اچھی خاتون ہیں۔“

”یہ بات میں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔“ سر دلچے میں شیونیل نے اس شخص کی بات کافی سنی، جبکہ وہ شخص اتنا گڑبڑایا کہ مزید کچھ کہے بغیر سامان کی لسٹ نکال سلازمین کی طرف بڑھ گیا تھا، جب تک وہ کاؤنٹر پر رہا شیونیل وہیں زکا سے گھورتا رہا تھا۔ ساشا مستقل ہر طرف سے غافل بچیوں میں گن گئی۔ اپنا سامان لے کر اس شخص نے غلطی سے بھی شیونیل یا ساشا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی، غلٹ میں اپنی بچیوں کو پکارتا وہ اسٹور کے گیٹ کی سمت بڑھ گیا تھا۔

بچیوں کو گیٹ تک ساشا خود چھوڑنے لگی تھی، جس وقت وہ واپس پلٹی چند گاہک ایک ساتھ ہی اسٹور میں آ گئے تھے، مگر شیونیل کے تاثرات دیکھنے کے بعد وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس شخص سے سامنا ہونے پر تم مشتعل ہرگز نہیں ہو گے۔“ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ساشا نے مدہم آواز میں یاد دلایا تھا۔

”تم مشتعل ہونے کی بات کر رہی ہو، میں انکاروں پر لوت رہا ہوں، میں اس آدمی کی گردن توڑنا چاہتا تھا۔“

”خود کو پریشان مت کرو اب، میں جانتی ہوں تم میرے لئے کتنے پوزیو ہو۔“ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساشا نے اس کے تھے چہرے کو دیکھا تھا جبکہ ناگواری سے سر جھکتے ہوئے شیونیل کی نظریں اسٹور میں داخل ہوتی شخصیت پر ساکت ہو گئی تھیں، کچھ حیرت کے ساتھ ساشا نے اس نازک اندام کی لڑکی کو دیکھا تھا جس کا چہرہ ریشمی لانی زلفوں کے درمیان چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اگلے ہی پل ساشا بری طرح چوکی تھی جب اس نے شیونیل کو بے اختیار ہی کیفیت میں اس لڑکی کی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔

”میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں اچانک اس

سامنے دیکھ کر میں کس قدر خوش ہوں، جانتے ہو میں کچھ دن سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی مگر ناکام رہی، مجھے لگا میں نے اپنے سب سے اچھے دوست کو کھودیا ہے، آخر تم کہاں تھے؟“ اس لڑکی کی چبھتی آواز ساشا تک پہنچ رہی تھی مگر وہ شیونیل کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے چھپ سی گئی تھی، ہونٹوں کی طرح وہ شیونیل کی چوڑی پشت کو دھمتی بہت آکروڑ سائل کر رہی تھی، جب سلازمین نے اسے لگا لیا تھا، ناچار اسے کاؤنٹر کی طرف آنا پڑا تھا کیونکہ کسٹمرز کا رش بڑھنے لگا تھا۔

کسٹمرز سے ڈیل کرتے ہوئے وہ کافی بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی رہی تھی کہ شیونیل ضرور اپنی دوست سے اسے ملوایں گا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا، کچھ دیر بعد ساشا نے دیکھا وہ دونوں اسٹور سے نکلنے پر ایک کی طرف جارہے تھے، وہ بالکل سنائے میں رہ گئی تھی، رگوں میں لہو ابلنے لگا تھا۔ دو گھنٹے اس نے کانٹوں پر گزرا رہے تھے، جس وقت شیونیل واپس آیا بالکل نارمل نظر آ رہا تھا جبکہ ساشا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گریبان پکڑ کر جھجھوڑتی مگر اس وقت وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی لہذا اس نے فوراً ہی اسٹور سے جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

”تم وقت سے پہلے جا رہی ہو، میرا منہ بند کرنے کیلئے کوئی بہانہ ہی کر دو۔“ شیونیل نے کچھ ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے یہاں سے جانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں، اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہاری محتاج ہوں۔“ مدہم آواز میں غرائی وہ اسے دنگ کر گئی تھی اور پھر تیز نظروں سے اسے دیکھتی سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

”ہیش ادو منٹ رو، میں تمہیں گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔“ اسٹور کے باہر شیونیل نے اس کا راستہ روکا تھا۔

”نہیں۔“ ساشا نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا مطلب، نہیں...؟“ وہ حیران پریشان ہوا تھا۔

”نہیں کا مطلب ہے نہیں، نہیں، نہیں۔“ حلق کے بل چیختے ہوئے ساشا نے ایک جھٹکے سے اسے سامنے سے ہٹایا تھا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سرخ رنگ کی ہلکی پھلکی سی ناکی میں ملبوس وہ آئینے کے سامنے آئیٹھی تھی، بالوں میں برش پھیرتے ہوئے وہ مستقل اپنے غصے کو کم کرنے کی کوشش اس لئے بھی کر رہی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی شیونیل ساری رات گھر کے باہر گزار دے، از دوامی زندگی کی یہ پہلی جھڑپ کافی شدید قسم کی اس لئے بھی ثابت ہو رہی تھی کہ یہ ایک خاموش جھڑپ تھی، کم از کم ساشا کی طرف سے تو مکمل خاموشی تھی۔ شیونیل کی کوشش کے باوجود نہ وہ اس سے بات کر رہی تھی نہ ہی وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار تھی۔ آج کا عجیب دن اور اتفاقات، سب کچھ کافی حیران کن تھا، ایسا نہیں تھا کہ شیونیل کو اس کی ناراضی کی وجہ معلوم نہیں تھی اور وجہ تو صاف صاف ساشا کے چہرے پر اس وقت بھی نظر آ رہی تھی جب وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ اسٹور سے نکلی تھی۔ ساشا اسے کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر اسے نظر انداز کئے جا رہی تھی، ضبط ختم ہوا تو غصے میں وہ بھی گھر سے باہر چلا گیا تھا۔

بالوں کو میمر بیڈ میں قید کرتے ہوئے اس کے کانوں سے پھر ایک آواز نکلتی تھی، ایک بل کو رک کر اس نے گہری سانس لی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیڈروم کی کھڑکی کی سمت آ گئی تھی۔

باہر گہری رات کا سناٹا تھا، مجھے کے پاس ہی وہ اسے ٹھٹھا دکھائی دیتا تھا، لب بچنے وہ اسے دیکھتی رہی

تھی جو سرکٹ کا بجا ہوا کھڑا ایک طرف اچھالنے کے بعد واپس کھبے کی طرف آیا تھا اور ایک بار پھر ایسی زوردار شور ماری تھی کہ کھبا بچھنا اٹھا تھا۔

”اب کھبے پر لائیں برساتے رہو گے یا اور بھی آؤ گے؟“ ساشا کی غصیلی آواز پر اس نے سراٹھایا تھا مگر تب تک وہ پردہ چھوڑ کر کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔

ناخنوں کی تراش خراش کرتے ساشا نے بس ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی جو کمرے میں داخل ہوتا دکھائی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”اکھاڑ آئے کھبا؟“ اس کے سر دلچے نے شیونیل کو لگا دیا تھا۔

”اگر مزید کچھ دیر تم مجھ سے لاطلق رہیں تو اکھاڑ دیتا۔“

”اب اندازہ ہوا تمہیں کہ لاطلقی اور نظر انداز کر دینے کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔“ سرعت سے اٹھ کر اس کے مقابل آئی وہ جیسے لچھے میں بولی تھی۔

”مجھے بھی تکلیف ہوئی تھی اس وقت جب تم سب کچھ بھلائے اس ڈان کے پیچھے پیچھے چلے گئے تھے، تم تو خوشی سے پاگل ہوا تھے ہو گئے کہ تمہاری سابقہ کام محبت تمہیں ڈھونڈتے ہوئے تم تک آچکی ہے، ویسے اسے دیکھنے کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ اس کی بے وفائی کے غم نے تمہیں کیوں خودکشی کے لیے تیار کر دیا تھا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میری نیت پر شک کر رہی ہو، میں ماضی کی غلطیوں کو دوبارہ کیسے دہرا سکتا ہوں ساشا! مجھے اپنا حال اور مستقبل عزیز ہے کیونکہ ان میں تم میرے ساتھ ہو، تم سے پہلے اور نہ ہی تمہارے بعد کوئی ایسا چہرہ رہا ہے جسے میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوں۔“

”تو پھر وہ سب کیا تھا جو آج ہوا ہے؟“ ساشا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”میں جب سے گھر آیا ہوں، تم سے اسی بارے

میں بات کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں مگر تم کچھ کہنے سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔“ گہری سانس لے کر شیونیل نے اس کے ناراض چہرے کو دیکھا تھا اور پھر اسے شانوں سے تمام کر قریب کر لیا تھا۔

”اس عورت کا آج مجھ سے ملنا، میرے لئے بالکل ایسا تھا جیسے کوئی پرانا دوست اچانک سر راہ مل جائے، اگر مجھے موقع ملتا تو میں ضرور اسے تمہارے پاس لاتا، تمہارا تعارف اس سے کرواتے ہوئے مجھے بہت فخر محسوس ہوتا اور مجھے فخر کرنا بھی چاہئے۔

دراصل وہ بہت جلجت میں تھی اور مجھ سے اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کرنا چاہتی تھی، اسٹور میں رک کر وہ ان معاملات پر بات نہیں کر سکتی تھی، میری غلطی یہ تھی کہ میں اسے انکار نہیں کر سکا، ایک دوست اور

شنا ساس کی حیثیت سے وہ اگر آئندہ کبھی بھی اپنا کوئی مسئلہ کرے میرے پاس آئی تو میں آگے بھی انکار نہیں کر سکوں گا، لیکن آگے میں تمہیں اعتماد میں لے کر ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا، جو آج ہوا وہ آئندہ کبھی نہیں ہو گا۔“

”مسائل اور پریشانیاں شیر کرنے کے لیے صرف تم ہی کیوں؟“ ساشا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”شاید... اسے اب احساس ہوا ہو کہ میں اس کے ساتھ ٹھکس تھا، وہ مجھ سے ہی اتنی ذاتی باتیں کر سکتی ہے۔“

”وہ مسائل، پریشانیاں اور ذاتی باتیں تم مجھے بتانا پسند کرو گے؟“

”اس کی شادی شدہ زندگی کافی حد تک بگڑ چکی ہے، وہ اپنے شوہر سے ناخوش ہے، ہر دن کے لڑائی ٹھکروں سے بیزار ہو کر وہ اب اپنے شوہر سے الگ ہونا چاہتی ہے۔“

”پھر تم نے اسے کیا مشورہ دیا؟“

”اس کی ساری باتیں سننے کے بعد مجھے معلوم ہوا

کہ ساری غلطی اس کے شوہر کی نہیں ہے، میں نے اسے کافی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کبھی بھی طرح اپنی شادی کو نہ توڑے، مگر وہ میرے اس مشورے سے خوش بالکل نہیں تھی۔“

”ظاہر ہے وہ اس قسم کے مشورے لینے تمہارے پاس آئی بھی نہیں تھی۔“ ساشا نخوت سے بولی تھی۔

”کیا مطلب؟“ شیونیل نے جس طرح چونک کر پوچھا تھا، ساشا کو وہ اول درجے کا احمق دکھائی دیا تھا۔

”مطلب کو جنم میں بھیجو، تم نے اسے میرے بارے میں بتایا؟“

”ہاں، کافی دیر تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔“ اس کے سادہ سے لچھے پر ساشا کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”تمہاری ناراضی نے مجھے بہت ڈسٹرب کر دیا تھا، اب اگر تم نے مجھ سے بات کرنا ختم کیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا، تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میری زندگی کا سب سے اہم مقصد اور وجہ تم ہو۔“

”میں یہ بھی بھول بھی نہیں سکتی۔“ ساشا نے مسکراتے ہوئے اس کے گریبان پر ہاتھ رکھے تھے۔

”ایسا نہیں ہے کہ مجھے تمہاری نیت پر شک ہوا تھا، مجھے خود سے زیادہ تم پر بھروسہ ہے مگر یہ ہے کہ تم بہت مصوم اور سادہ ہو، تمہیں کوئی بھی عورت بہت آسانی سے بے وقوف بنا سکتی ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ وہ فوراً پولا تھا جبکہ ساشا بری طرح چونک کر اسے سمجھنے لگی تھی جو بالوں پر ہاتھ پھیرتا بے شکل مسکراہٹ چھپا سکا تھا۔

☆.....☆

بہت اچانک اس کی آنکھیں کھلی تھیں، ہر کو حرکت دینے بغیر اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی تھی، چند لمحوں تک وہ نیم تاریکی میں بوسیدہ دیواروں کو تکتا رہا تھا، دل، دماغ بالکل خالی تھے، اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ

وہ کس جگہ موجود ہے، جانے اس پوزیشن میں وہ کب سے بیٹھا تھا کہ سارا جسم اس تاریک اور بے ہوشی میں اکرچکا تھا، اپنے سن وجود کو ذرا حرکت دیتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا تھا،

اس نے بخور تاریکی میں چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ آتش دان میں بس چنگاریاں سلگ رہی تھیں، اگلے ہی لمحے اس کی نظریں ایک ساکت بصرے، وجود پر جم گئی تھیں، ایک جھکنا سا اسے لگا تھا۔ ایک لمبیل خوبصورت خواب سے واپس اس کے حواس حقیقت کی دنیا میں اسے پہنچ لائے تھے، اب کسی طوفان کا شور

کیبن کی بوسیدہ دیواروں سے نہیں گھرا رہا تھا، موت جیسے سنائے میں اسے صرف اپنی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، دماغ میں بس ایک ہی نام گونج رہا تھا، قریب ہی اس بے حس و حرکت پڑے وجود کو

تکتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ کئی بار پکارنے کے باوجود وہ بالکل خاموش اور ساکت تھی، خوف کا غلبہ اس پر طاری ہو گیا تھا، وہ خود میں بہت نہیں پاتا تھا کسی بھی ایک حقیقت کا سامنا کرنے کی۔ اسے یاد تھا رات میں طوفان کا زور قدرے کم ہوا تھا مگر وہ تھا نہیں تھا،

ایسے میں کسی مدد کی تلاش یا اپنی مدد آپ... سب لا حاصل تھا، اسے یاد تھا، ساشا کی خاموشی اور بے حس و حرکت وجود نے اسے بھی پتھر ادا کیا تھا، ہڈیوں کو کڑکڑا دینے والی ٹھنڈ سے بھی وہ لاطلقی بس آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش میں تھا، نیند

کب اس پر غالب آئی وہ نہیں جانتا تھا۔

ایک بار پھر ہمت کر کے اس نے ساشا کو پکارا تھا مگر کوئی جواب اب بھی نہیں آیا تھا، اسے یاد تھا، رات میں کھاسی کے حملے کے دوران ساشا نے اس کے گھٹنے سے سر ہٹا لیا تھا، جس پوزیشن میں شیونیل نے آخری بار اسے دیکھا تھا وہ اب بھی اسی پوزیشن میں نظر آ رہی تھی، ایک ایک لمحہ قیامت لگ رہا تھا، وہ اسے مجھوڑ کر اٹھانا چاہتا تھا مگر حقیقت اس کی جانب

ہاتھ بڑھاتے ہوئے شیونیل کے ہاتھ انجانے خوف کے تحت کانپ رہے تھے، اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، بمشکل وہ اپنے پیروں پر اٹھا تھا، نظریں اس کے ساکت وجود پر جمائے وہ اٹل قدموں پیچھے ہٹا چلا گیا تھا، کیمین کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ بدستور کانپ رہا تھا، وحشت سے دل حلق میں آ رہا تھا، اس نے پہلے اپنے باپ اور پھر ماں کو موت کی آغوش میں جاتے دیکھا تھا، ان کے چہروں پر وہ موت کی اذیت دیکھ چکا تھا، اور اب اس مقام پر جبکہ وہ اپنی منزل کے انتہائی قریب تھا، اگر ایک بار پھر موت کے سیاہ شعلے نے اس سے زندہ رہنے کا یہ ایک منقصد بھی چھین لیا، یہ آخری سیڑھی بھی گر گئی تو وہ جاننا تھا وہ کبھی نارل نہیں ہو سکے گا، شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا، وہ بہت مایوس تھا، شدید مایوس، بے حس و حرکت اس وجود کی جانب وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا، کوئی کیسے اپنے ہی وجود کو قبر میں دھکیل سکتا ہے؟ مگر اسے یہ کام کرنا تھا۔

کیمین کا دروازہ کھل چکا تھا، باہر طوفان کے گزر جانے کے بعد گہری خاموشی کا راج تھا، آسمان صاف تھا، ہر سمت برف کی دیز چادر پھیلی ہوئی تھی، کھلتے دروازے سے اندر آتی تیز رفتاری نے کیمین کی تاریکی کو مکمل ختم کر دیا تھا، دروازے کا سہارا لے وہ بمشکل اپنے قدموں پر کھڑا کسی خوفزدہ سہجے کی طرح سر جھکائے ہوئے تھا، اسے اپنی سزا کا سامنا کرنا تھا، برف کے جہنم میں وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا، وہ جانتا تھا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، اسے خود سے نفرت ہو چکی تھی، وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکا تھا اس ہستی کے لیے جس کے ساتھ رات بھر وہ ایک خوبصورت خواب میں جیتا رہا تھا، وہ خوابوں اور حسرتوں میں ہی جینے کیلئے اس دنیا میں آیا تھا، کل رات وہ آخری خواب اس کی آنکھوں میں اُتر آیا تھا، اس ایک خواب میں اس نے اپنی پوری زندگی جی لی تھی، اب اس لمحے وہ بستر

مرگ پر پڑے ایک ضعیف العروہ وجود کی طرح لاغر اور بے بس تھا، انسان پیدا ہونے کے بعد اس دنیا میں جگہ اور مقام بنانے کے لیے سختیاں جھیلتا ہے، روپیہ، مکان، کامیابی حاصل کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا حق ادا کر دیا ہے... اور پھر بس ایک ٹھوکرا کافی ہوتی ہے اس خوش فہمی سے باہر آنے کے لیے، ایک ساتھ کچھ گرم قطرے اس کی آنکھوں سے گرتے لکڑی کے خستہ حال فرش پر قابو ہو گئے تھے، اس کی بھی ساری جدوجہد اور کامیابیاں بے معنی ہو چکی تھیں، معنی تو وہ ہستی رکھتی تھی جس کے لیے اس نے کامیابیاں حاصل کی تھیں، دل کی بڑھتی اذیت اسے کراہنے پر مجبور کر چکی تھی جب ایک آہٹ نے اس کی سانسیں روک دی تھیں، ایک ہل کو وہ ساکت رہا تھا مگر پھر ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تھا، دھندلائی نظریں اس پر جم گئی تھیں جو اپنے نحیف وجود کو بیٹھی اٹھ بیٹھی تھی، شیونیل کی آنکھوں کے سامنے پھر کوئی خواب چل رہا تھا یا پھر ایک اور دھوکا۔

”تم جا رہے ہو؟“ مدہم کمزور سی آواز شیونیل کے کانوں میں گونجی تو کسی تھی۔

”کل رات کئی دن بعد میں اتنی بے خبر اور گہری نیند سوئی تھی، تمہاری آواز مجھے سنائی دے رہی تھی، مگر میں بس سونا چاہتی تھی“ ایک بار پھر کانوں سے طعنائی آواز نے شیونیل کو زمین و آسمان کے درمیان مطلق کر دیا تھا، ساکت نظروں سے فرش پر بیٹھی ساشا کو دیکھتے ہوئے اس کا چہرہ سوجھ گیا تھا، وہ اور کیا بول رہی ہے، اس بار اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، بغیر ہلکے جھپکائے اسے نکلتا وہ بمشکل اپنے قدموں کو اس کی جانب ہٹا رہا تھا۔

”ابھی موسم ٹھیک ہے، تمہیں اب جانا چاہئے۔“ ساشا کی آواز حلق میں گھٹتی تھی۔ ابھی نظروں سے وہ اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جو گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا، شدت ضبط سے اس کی

گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں، چہرہ انگارہ ہو رہا تھا۔ ”ہاں، میں اب جانا چاہتا ہوں، خواب کے ہر لمحے کو حقیقت میں بدلنے کے لیے۔“ اس کے لرزے بھاری لہجے نے ساشا کو گنگ کر دیا تھا، ساکت نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو اس کے ہاتھ تمام کراہتی آنکھوں سے لگا رہا تھا، عورت کے آنسو مرد کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے ہیں، لیکن ایک مرد کے آنسو عورت کو کس حد تک کمزور کر سکتے ہیں، وہ اب یہ جان چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

کیمپ لگانے کے لیے وہ پتھر کے ذریعے ایک مضبوط لکڑی کو بھر بھری زمین میں گاڑ رہا تھا، جب اسے اپنے قریب کوئی چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی تھی، ایک بہت صحت مند سا خرگوش زمین کو سونگھتا ہوا اس کے پیروں کے نزدیک آچکا تھا، بڑبڑا کر اٹھتا وہ دور ہو گیا تھا۔

”ساشا! میں یہاں کیمپ نہیں لگا سکتا۔“ جھلائے انداز میں وہ اسے بتا رہا تھا جو ان کی گئی تھی۔

”سہیش! میں تم سے بات کر رہا ہوں، تم تنہا رہی ہو؟“ جوتے سے اس خرگوش کو پیچھے دھکیلا وہ تقریباً چلایا تھا اور پھر ایک طرف پھینکتا تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھ گیا تھا، جو بخستہ پانی کے چھوٹے سے تالاب کے کنارے سے ذرا ہٹ کر نرم گھاس پر اطمینان سے بیٹھی تھی، سرخ سرخ گاجروں کا ڈھیر اس کے سامنے رکھا تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی، ہر تھوڑی دیر بعد وہ گاجر تالاب کے دوسرے کنارے کی طرف اچھال رہی تھی جہاں خرگوشوں کا خاندان اچھل کود کر رہا تھا۔

”تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہوگا مگر میں یہاں بکھرے کے لیے بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا۔“ شدید ناراضی سے بولتا وہ اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

”شیونیل! میری خوشی کے لیے جب تم یہاں آ

ہی گئے ہو تو اپنے عمل سے بھی اس احسان کو ظاہر کرو، چھوٹی چھوٹی سی بات کو لے کر یہ اچھا وقت برباد نہ کرو، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں آ کر تم مجھ سے کوئی بحث نہیں کرو گے۔“ سمجھانے والے انداز میں وہ اسے یاد بھی دلا رہی تھی۔

”مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں ہے ساشا! مگر مجھے جانوروں کی اس نسل سے شدید وحشت ہے اور یہاں ان کی تعداد نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“ وہ کوفت سے بولا تھا۔

”یہ اتنے معصوم ہیں شیونیل! تمہیں تو ان پر رحم کرنا چاہئے، یہاں ایسا سازگار موسم ان کے لیے بہت نایاب ہے، اور نہ برف کے طوفان ان کو بلوں سے نکلنے ہی نہیں دیتے، دیکھو، سب کتنے خوش ہیں، میں ان سب کو پہچانتی ہوں اور یہ مجھے کیونکہ میں نے کافی وقت ان کے ساتھ گزارا ہے۔“

”اسی لئے تمہیں مجھ سے زیادہ ان کی پرواہ ہے، میں ان سب سے واقف اب جیسے ہو رہا ہوں۔“

”تم کب جیسلس نہیں ہوتے؟ تمہارے اسٹور کے کسی کسمرے اگر میں ایک سے دو بار مسکرا کر بات کر لوں تو یہ تک بھی تمہیں جیسلس کر دیتا ہے۔“ ساشا نے خشکی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”مجھے یہ سچ قبول کرنے میں کوئی شرمندگی نہیں، لیکن پوزیو تو تم بھی میرے لئے بہت ہو، اسی لئے تو گھر میں بور ہونے کا بیہانہ کر کے روز اسٹور میں کام کرنے آ جاتی ہو، مگر مجھے پتہ ہے کہ تم مجھ پر نظر رکھنے آتی ہو کہ میں اسٹور پر آنے والی عورتوں سے کتنی خوش اخلاقی سے پیش آ رہا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے شیونیل نے اس کی چڑھتی ابرو کو دیکھا تھا۔

”تمہیں جو سمجھتا ہے سمجھو مگر سچ تو یہ ہے کہ میں اسٹور پر تمہاری مدد کرنے اس لئے آتی ہوں کہ تمہیں تم اسٹور پر کسی سٹلر کرل کو نہ رکھ دو، تاکہ تمہارا اور تمہارے ملازمین کا دل بھی خوب لگہ رہے۔“ اس کے جملے سن کر

انداز پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”میں تم سے کبھی بچ سننے کے لیے بے تاب تھا، مگر میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسٹور میں کبھی کوئی سبزوگرل نہیں رکھوں گا، جنہیں مجھ پر اعتبار ہونا چاہئے۔ اسے بازو کے گھیرے میں لیتا دے بولا تھا۔

”مگر میں برا ہوتا تو کبھی تم جیسی نیک دل اور وفادار ساتھی زندگی بھر کے لیے میری نہ ہوتی۔“ اس کے ملائم بالوں کی خوشبو سانسوں میں اتارتا وہ بولا تھا۔ ”مجھے تم پر مکمل اعتبار ہے مگر مجھے اسٹور پر تمہارے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے، تم جانتے ہو مجھے کتنی نوکریاں کرنی پڑی ہیں، کام کے بغیر میرا گزارہ مشکل تھا، اب مجھے تم نے اتنی آسائش مہیا کر دی ہے کہ مجھے کام کرنے کی ضرورت نہیں، مگر مجھے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ہو چکی ہے۔“ وہ بولی گئی۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ اب تم اپنی اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش کرو، کام کو خود پر سوار کرنے کے بجائے آرام کرو، میرے لیے اچھے اچھے کھانے بناؤ، مجھ پر توجہ دو، ویسے تمہارا کیا خیال ہے ہم چار پانچ بچے افروز تو کر سکتے ہیں؟“ اس کے سوال پر ساشا نے جس طرح کرنٹ کھا کر اس کے شانے سے سر اٹھایا تھا، وہ مکمل کر ہنسا پیچھے گھاس پر گر گیا تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتا تمہیں ہر کام اتنی جلدی جلدی کیوں کرنا ہوتا ہے۔“ حیرت و حُکلی سے وہ اس کے مسکراتے چہرے کو ٹھوکر رہی تھی۔

”مجھے ابھی طرح یاد ہے جب تم مجھے یہاں سے لے گئے تھے مجھ میں جان بھی باقی نہیں تھی، میں ہاسٹل میں ایئرمنٹ می اسٹورم نے وہیں مجھے شادی کی رنگ پہنا دی تھی، اس بات کو چھ ماہ گزر چکے ہیں، مگر مجھے تمہاری جلد بازی پر آج بھی غصہ ہے، تم از کم میرے ہاسٹل سے ڈسچارج ہونے کا تو انتظار کر لیتے۔“ ساشا کو اچانک ہی دل کا غبار نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

”مجھے بھی یاد ہے، ہاسٹل میں اس وقت نرس

نے میری درخواست پر ہماری ایک یادگار تصویر بھی اتاری تھی، جو کہ ہر وقت میرے والٹ میں موجود رہتی ہے، تم دیکھنا چاہو گی؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ چیخ اٹھی تھی۔

”میں اس تصویر کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔ اف۔۔۔ میں اس میں کس قدر بھیاں لگ رہی ہوں شیو نیل! اگر تم ایک بار غور سے مجھے دیکھ لیتے تو شادی کی رنگ وہیں پھینک کر بھاگ جاتے۔“

صدے سے بولتی وہ اس وقت ہول اٹھی تھی جب شیو نیل نے اس کی گردن میں لپٹا اسکارف اپنی طرف کھینچا تھا، وہ کراہ اٹھی تھی جب سر نرم گھاس سے ٹکرایا تھا، جھنجھلائی نظروں سے وہ اسے دیکھنے لگی تھی جو فوراً ہی اس کی جانب جھکا تھا۔

”ہاں، میں نے اس وقت تمہارا چہرہ نہیں دیکھا تھا، مگر اب تو دیکھ سکتا ہوں، بس تم چڑچڑمت کرنا۔“ اس کے حقیقی خیر لہجے پر وہ مسکرائی تھی۔

”میں چڑچڑ نہیں کروں گی، لیکن اب اگر غور سے دیکھنے پر مجھ میں کوئی کی نظر آئی، تو میں جنہیں کل کر دوں گی۔“ اس کے دھمکانے پر وہ مسکرایا تھا۔

”تم نہیں قل کیے بغیر بھی روح بھی لیتا آتا ہے، تمہاری آنکھیں یہ کام بہت آسانی سے کرتی ہیں، ان آنکھوں کے علاوہ نہ میں نے پہلے کچھ دیکھنا چاہا تھا نہ اب کچھ اور دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کے خوابناک لہجے اور لود پتی نگاہوں نے ساشا کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا، اس کی بند پالکوں کو یوں میں جذب کرنا وہ اس وقت ہوش میں آگیا جب کوئی چیز اس کی پشت سے ٹکرائی تھی، آنکھیں کھولتے ہوئے ساشا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جو اپنے عقب میں کچھ دیکھتا پیچھے ہوا تھا، قریب ہی اس موٹے تازے خرگوش نے اسے اس طرح ہڑپڑا کر اٹھنے پر مجبور کیا تھا کہ ساشا بے ساختہ ٹھکھلائی ہوئی اٹھ نہ سکی تھی۔

”میں جنہیں پوری سنجیدگی سے بتا رہا ہوں کہ ان

خرگوشوں سے میری جان جاتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کارکوچ سے ڈر کر تم میری جان ہڈاب میں ڈال دیتی ہو، میں اب چند منٹ بھی یہاں نہیں رکوں گا۔“ وہ بے طرح خراب موڈ میں فیصلہ سنانا وہاں سے گیا تھا۔

”ٹھیک ہے ہم یہاں سے سامان سمیٹ کر تمہاری پسند کی جگہ پر کیمپ لگاتے ہیں، مگر تم مجھے طعنہ دینے کا بہانہ مت ڈھونڈا کرو، کارکوچ سے ڈرنا دنیا کی ہر لڑکی کا حق ہے۔“ حُکلی سے اسے جتانی وہ اس کے پیچھے ہی جا رہی تھی۔

مکھانجا اندیرا ہر سمت چھاننے لگا تھا، کھلے آسمان کی وسعتوں میں ٹھٹھاتے ستارے بہت حیرتی سے نمودار ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ رخ بستہ حُکلی بھی فضا میں ڈیرے جما چکی تھی۔ گرم دستانے ہاتھوں پر چڑھائی دو کیمپ سے نکل آئی تھی، سامنے ہی شیو نیل آگ کے چھوٹے سے لاؤ کے گرد بیٹھا اس میں مزید لکڑیاں ڈال رہا تھا، آگ کی رنگ بدلتی روشنی میں وہ ساشا کو بہت اچھا لگتا تھا، چند لمحوں تک وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

”تم ٹھکن محسوس کر رہی ہو شاید؟“ اس کی جانب متوجہ ہوتا وہ بولا تھا۔

”نہیں، میں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں، کیونکہ اس وقت تمہارے لئے یہاں مجھ سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہے، تمہارے کام بھی نہیں۔“ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ساشا نے اسے دیکھا تھا جو دھیرے سے ہنسا تھا۔

”اب یہ شکایت تو نہ کرو، زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کام ضروری ہے، جبکہ زندہ رہنے کے لیے میرے لئے تمہاری ضرورت زیادہ اہم ہے۔“

ہاتھ جما ڈتا وہ آگ کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔

”اب اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو، کیا میری بات پر یقین نہیں آیا؟“ اس کی خاموشی پر وہ بولا تھا مگر

اس وقت حیران ہوا تھا جب جواب دینے کے بجائے ساشا نے اس کے سینے سے سر ٹکا دیا تھا۔

”مجھے تمہاری ہر بات پر یقین ہے، تم بہت اچھے ہو، میرے لئے بہت اہم ہو مگر تمہاری طرح میں یہ سب لفظوں میں نہیں کہیں سبھا سکتی۔“ مضبوط بازوؤں کے حلقے میں وہ دم ہم لچھ میں بولی تھی۔

”جنہیں لفظوں کی ضرورت نہیں ہے، میں جانتا ہوں جس طرح تم جانتی ہو کہ تم میرے لئے کیا ہو۔“ فرکی ٹوپی میں چھپے اس کے سر کو دھیرے سے تھپتھپاتا وہ بولا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں کیمپ میں چلنا چاہئے، باہر تو یہ ٹھنڈی برداشت سے باہر ہونے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر اس کا برا اثر ہو۔“

”مگر میں ابھی باہر کچھ دیر چھل قدمی کرنا چاہتی ہوں، انکار مت کرنا۔“ اس کے اصرار پر انداز پر شیو نیل کو راضی ہونا پڑا تھا۔

آج بھی رات پورے چاند کی رات تھی اور اپنے چوبن پر بھی، حد نظر تک برف کی پہن سفید چادر بھی تھی، دو دو حیاروشنی میں نہانے درخت ساکت ٹھہرے اس رات کے ظلم میں قید دکھائی دے رہے تھے، ہاتھ تھا سے دھیرے دھیرے چلتے وہ دونوں آسمان کی جانب متوجہ تھے، جہاں جھلملاتے لاتعداد ستارے آنکھوں کو بہوت کر رہے تھے۔

”دیکھو! یہاں سب کچھ کتنا حسین لگتا ہے، اب تو بتا دو کہ تم یہاں کیوں نہیں آنا چاہتے تھے؟“ چلتے چلتے ساشا نے اسے مخاطب کیا تھا۔

”کوئی خاص وجہ نہیں۔“

”مجھے ٹال رہے ہو؟“ ساشا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”خاص نہ ہو مگر کوئی وجہ تو ہے، ورنہ تم نے اس سے پہلے کبھی میری کوئی بات ماننے سے انکار نہیں کیا تھا۔“

اس کے شکایتی لہجے پر شیو نیل نے اسے دیکھا تھا۔

القریش پبلی کیشنز کے نئے ناول شائع ہو گئے ہیں

اب کر میری رفوگری

مصنفہ سائرہ رضا

قیمت

600/- روپے

رگ جاں جو قریب تھے

مصنفہ صالحہ محمود

قیمت

600/- روپے

دل کی دہلیز پر

مصنفہ اشتیاق فاطمہ

قیمت

600/- روپے

میرے ہمنوا کو خبر کرو

مصنفہ فاخرہ گل

قیمت

600/- روپے

زندگی کی حسین راہ گزر

مصنفہ سمیرا شریف طور

قیمت

400/- روپے

وہ اک لمحہ محبت

مصنفہ سمیرا شریف طور

قیمت

400/- روپے

دردِ دل

مصنفہ نبیلہ عزیز

قیمت

900/- روپے

زرد پتوں کا شجر

مصنفہ نایاب جیلانی

قیمت

400/- روپے

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور

فون: 37652546 - 042-37668958

”شاید میرے اندر موجود خوف مجھے یہاں آنے سے روک رہا تھا، مجھے وہی رات یاد آ جاتی ہے جب میں دوبارہ مایوسی کا شکار ہوتا لیکن تک پہنچا تھا، وہی طوفانی رات جب تمہاری حالت نے میرا دل بند کر دیا تھا اور تم موت کے انتظار میں کچھ سوچتے سمجھتے کے لیے تیار نہیں تھیں، میں جب جب اس جگہ کے بارے میں سوچتا ہوں مجھے وہی بھیاںک رات یاد آ جاتی ہے، اس سچ سے قطع نظر کہ میں نے یہاں ایک بار نہیں دوبارہ نہیں پایا تھا۔“

گہری سنجیدگی سے وہ بتا رہا تھا۔
”لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ اگر تم اس بھیاںک رات کا سامنا نہ کرتے تو میں اس خوبصورت رات میں تمہارے ساتھ نہ ہوتا۔“ ساشا نے کہا تھا۔
”ہاں، یہ بات بھی قابل غور ہے۔“ وہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

”کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ ہم اپنے بچوں کو یہ کسے بتائیں گے کہ ہم کن حالات میں ملے تھے؟“
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ساشا نے اچانک کہا تھا۔
”ان پر کیا اثر پڑے گا یہ جان کر کہ ان کے ماں باپ نے اپنی اپنی زندگی سے بیزار ہو کر کس طرح خود کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی، ہم کس طرح ان کو یہ تربیت دیں گے کہ حالات کی غلطیوں سے بھگ آ کر زندگی سے نفرت کرنا غلط ہے؟“ وہ مدہم تشویش زدہ لہجے میں بولی تھی۔

”میرا یقین کرو، وہ ہم پر غر کریں گے، جب ہم ان کو یہ بتائیں گے کہ ہم نے کس طرح واپس خود کو زندگی کی طرف موڑا تھا، کس طرح ایک دوسرے کو سہارا دے کر ایک دوسرے کی سوچ کو بدلا تھا، زندگی سے پیار کرنا سکھایا تھا، اپنے تجربے کے بعد ہم ان کو زیادہ گہرائی سے سمجھائیں گے کہ زندگی سے مایوس ہونے کے بعد بھی واپس پلٹنے کا ایک راستہ موجود ہوتا ہے، ہمیں وہ راستہ خود تلاش کرنا پڑتا

”خاکر ہے یہ کسی موسیقی کی آواز تو ہرگز نہیں تھی، یہاں خونخوار جانوروں سے تمہاری دوستی ہو گی مگر وہ مجھے بالکل برداشت نہیں کریں گے، تمہاری باتوں میں مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں بغیر کسی ہتھیار کے اتنی دور نکل آیا ہوں۔“ اس کا ہاتھ گرفت میں جکڑے تیز قدموں سے واپس کپ کی طرف جاتا وہ اسے گھر کر رہا تھا۔
”اگر میں ان خونخوار جانوروں کی دوست ہوں تو تمہیں فکر نہیں کرنی چاہئے، میں ان کو سنبھال سکتی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”میں فکر کرنے پر مجبور ہوں، کیونکہ تمہارے خوبصورت ہتھیار مجھے تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکتے ہیں، مگر تمہارے دوستوں سے مجھے نہیں بچا سکتے۔“ شیونیل کے خشکیں لہجے پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی، محر انگیز سنائے میں اس کی ہنسی کی جلتیگ کسی سازی کی طرح دور تک پھیلی تھی، تقریباً دوڑتے ہوئے وہ دونوں کپ کی طرف جا رہے تھے۔ کل ایک اور روشن، سنہرا دن ان کی زندگی میں آنے والا تھا جس کی گواہ یہ جگمگ کرتی رات بھی تھی۔

☆.....☆.....☆

محبت یا مرگ



”تم جو بھی ہو am not intrested اہانیہ نے مسیج لکھ کر سینڈ کیا۔

☆

اگلے دن بھر واپسی میں وہ وہیں کھڑا تھا۔ ہانیہ اسے نظر انداز کر کے نظریں جھکا کے جانے لگی، تھوڑی دور چل کر اسے محسوس ہوا کوئی اس کے پیچھے ہے مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکا بائیک پر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھبرا کر وہ تیز قدم اٹھانے لگی۔ ”وہ خدا یا؟ اس نے گھر بھی دیکھ لیا۔“ وہ بڑبڑائی۔

گھر آتے ہی اسے قحط ملا۔ ”تم تو بہت پیاری ہو۔“ ”تمہاری آنکھوں کا تو دیوانہ ہوں میں، تمہارے لیے بال مجھے بہت پسند ہیں۔“ اتنے سارے کمٹس، ایک ساتھ ہانیہ نے کمٹس کو نظر انداز کیا اور کہا۔

”مسٹر ساحل! تم نے آج اچھا نہیں کیا میرا پیچھا کر کے۔“

”یار پلیز! معاف کر دو پلیز، آئندہ پیچھا نہیں کروں گا۔“ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں کیا حرج ہے اگر تم مجھ سے دوستی کرو۔“

☆

ہانیہ اور ساحل کی دوستی کو 3 ماہ ہو گئے۔ آج ہانیہ نے چھٹی کر لی یونیورسٹی سے ساحل کے کہنے پر دونوں پارک میں گھاس پر بیٹھے تھے۔

”ہانیہ! تم نے مجھ پر ہاؤ کر دیا ہے جہاں دیکھوں تم ہی تم نظر آتی ہو۔“ ساحل نے کہا۔ ”ایسا کیا ہے مجھ میں؟“ ہانیہ نے معصومیت سے کہا۔

”تم بہت معصوم ہو، بہت پیاری۔“ ساحل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”ساحل! جب سے تم میری لائف میں آئے ہو میں بہت خوش ہوں، تم مجھے بھی چھوڑو گے تو نہیں۔“

ہانیہ نے اپنا سر ساحل کے کندھے پر رکھا۔

”نہیں ہانی! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“

ساحل نے پیار بھری نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

یونیورسٹی سے نکلے ہی آج پھر اس کی نظر اسی چہرے پر پڑی، وہ کافی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ یہ چہرہ مسلسل اسے ہی گھورتا ہے، اور آج تو اس لڑکے نے عین اس کے سامنے بائیک روک دی، وہ محض اتفاق سمجھ کر نظریں جھکا کر چل پڑی۔

ہانیہ کی کام 11 کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ ایک شریف فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ چار بھائیوں کے بعد اپنے ماں باپ کی وہ ایک ہی بیٹی تھی۔ یونیورسٹی سے آ کر ہانیہ نے ریٹ کرنا چاہا تب ہی اس کے موبائل پر مسیج موصول ہوا۔

”ہائے ہانیہ! اجنبی نمبر تمہارا اس نے Reply کیا۔“

”آپ کون؟“ فوراً ہی جواب آیا۔

”تم مجھے نہیں جانتیں ہانیہ! پر میں تمہیں جانتا ہوں۔“

”کون ہو اور میرا نمبر کس سے لیا؟“ ہانیہ نے سوال کیا۔

”تم نے آج مجھے دیکھا تھا۔“ جواب میں اس لڑکے نے کہا۔

”میں تمہیں جانتی نہیں پھر کیسے دیکھ سکتی ہوں۔“

ہانیہ نے ٹیکسٹ کیا۔

”میں یونیورسٹی کے باہر تھا، اسکا ٹی شرٹ میں تھا یاد آیا؟“

”تم.....“ ہانیہ حیران رہ گئی۔

”تم کون ہو اور میرا نمبر بھی مل گیا تمہیں مجھے گھورتے کیوں ہو؟“ ہانیہ نے ایک ساتھ ہی سوالات کر ڈالے۔

”تمہاری قاتلانہ آنکھیں مجھے جینے نہیں دیتیں، قتل کر دیں گی یہ تو مجھے۔“ اس لڑکے نے ٹیکسٹ کیا۔

”تو پھر دیکھتے کیوں ہو؟“ ہانیہ نے کہا۔

”ان نیٹس آنکھوں کے نشے میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔“ اس لڑکے نے کہا۔ ”میں تمہیں نہیں جانتی پلیز مجھے تنگ مت کرو۔“ ہانیہ نے کہا۔

”جانے میں کتنا وقت لگتا ہے، میں ساحل خان ہوں..... ایم اے کیا ہے، تمہاری طرح کراچی میں رہتا ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔

”میں کیسے مان لوں کہ تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔“
ہانیہ نے اسے دیکھا۔

”ہانیہ! میں کیا کروں کہ تمہیں یقین آجائے، میں کچھ بھی کر سکتا ہوں تمہارے لئے کچھ بھی۔“ ساحل نے اسے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”بولو میں کیا کروں چھت سے کود جاؤں، اپنا ہاتھ کاٹ لوں؟“

”نہیں ساحل! میں تو ویسے کہہ رہی تھی۔ وہ پریشان ہی ہوگئی۔
”ہانیہ! ہانی کا ڈاڑی لوؤ۔“

اس نے ہانیہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

”آئی لو یو سائل اینڈ آئی ٹرسٹ یو۔“
ہانیہ ساحل کی محبت میں پوری طرح کھوپکی تھی، اس کی قربت میں وہ خود کو بہت خوش قسمت تصور کرتی، یوں تو چاہے جانے کا احساس انسان کو مغرور کر دیتا ہے، مگر غرور اس کی ذات میں کہیں بھی نہیں تھا وہ تو سادہ طبیعت اور معصومیت کا پیکر تھی۔

☆.....

وہ موسم سرما کی ایک دلربا، خوب صورت اور سنہری سا پہر تھا فضا میں گلاب کے پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی، بالکونی میں کھڑی وہ اسے ہی یاد کر رہی تھی کہ اس کی کال آگئی۔

”کیسی ہو ہانی؟ آئی مس یو یار۔“
مس کال ریسیو ہوتے ہی ساحل نے کہا ”آئی کس یو؟“

”تم میری Princess ہو ہانی۔“
”اور تم میرے Prince۔“

ہانیہ نے جوابا کہا۔
”تمہارا تو دیوانہ ہوں میں۔“ ساحل نے کہا۔

”ساحل! اگر تم مجھے پسند کرتے ہو تو اپنے گھر والوں کو بھیجوناں ہمارے گھر مجھے اس طرح فون پر بات کرنا چھپ کر ملنا اچھا نہیں لگتا۔“ ہانیہ نے کہا۔

”ہاں، ہاں میں سمجھوں گا ناں، تم بس تھوڑا انتظار کرو، تم میری ہر صوف میری۔“ ساحل نے کہا، کچھ دیر بعد پھر اس نے کہا۔

”ہانی کل ملوناں۔“
”نہیں ساحل! مجھے اچھا نہیں لگتا ہماری فیملی میں یہ سب اچھا نہیں سمجھا جاتا۔“ ہانیہ نے کہا۔

”ہانی پلیز! میری خاطر کیا تمہیں بھروسہ نہیں مجھ پر۔“ ساحل نے کہا۔

”بھروسہ ہے ساحل۔“
”تو پھر ڈن کل ملتے ہیں اسی جگہ۔“ ساحل نے کہا۔

کرفون بند کر دیا اور ہانیہ سوچنے لگی۔
”ساحل! لفظوں کا خلاڑی ہے، اپنی بات منوانا اسے اچھی طرح آتا ہے۔“

☆.....

وہ گھاس پر بیٹھا ہانیہ کا انتظار کر رہا تھا، دور سے نظر آتی ہانیہ کو دیکھ کر اسے تسلی ہوئی، اسکا ٹی بیلو سوٹ پر پنک اسکا ف اڑتے ہوئے آچل کو سنبھالتے دھیرے دھیرے وہ اس کے پاس آئی۔ سرخ و سفید چہرہ چھوٹی سی ٹاک آکھوں میں سلیتے سے کابل لگائے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی، وہ اسے دیکھتا رہا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ ہانیہ نے پوچھتے ہوئے کہا۔
”تمہیں دیکھ رہا ہوں اپنی جان کو۔“ ساحل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”تم بالکل چائینز لگتی ہو۔“ ساحل نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”ایسے تو نہ دیکھو۔“ وہ شرمائی۔
”پھر کیسے دیکھوں؟“ اس نے شرارت سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑا۔

”ساحل! مجھے اس طرح چھپ چھپ کر ملنا اچھا نہیں لگتا۔“ ہانیہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا۔

”ساحل! میں اب نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر، تمہاری عادت ہوگئی ہے مجھے پلیز تم اپنے گھر والوں کو میرے گھر

رشتہ لے کر بھیجو۔“ کہتے ہوئے ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ارے ہانی! ان آنکھوں کو کبھی مت رلانا جس پر ساحل فدا ہے۔“ اس نے ہانیہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”پر ساحل.....“ ہانیہ نے کچھ کہنا چاہا۔
”میری جان میں ہوں ناں تمہارے ساتھ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ساحل نے گویا اسے طمینان دلایا۔

☆.....

کافی دن ہو گئے ساحل نے نہ کوئی کال کی نہ ایس ایم ایس ہانیہ نے سوچتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

نمبر Off جا رہا تھا۔
کئی بار اس نے ٹرائی کیا لیکن ناکام رہی، وہ اس کی یادوں میں کھوئی کھوئی سی رہتی۔

وہ بستر پر لیٹی ساحل کو یاد کر رہی تھی کہ اچانک ہی فون کی رنگ ٹون بجی وہ چونک کر اٹھی سوچا کہ ساحل ہی ہوگا، آج تو بہت شکایت کروں گی۔ مگر اسکرین پر تو کوئی اجنبی نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو!“ کسی لڑکی کی آواز تھی۔
”جی آپ کون؟“ ہانیہ نے پوچھا۔

”میں انا بات کر رہی ہوں۔“
”کون انا؟“

”میں ساحل کی گرل فرینڈ ہوں۔“
”واٹ؟“ ہانیہ نے حیرانگی کا اظہار کیا۔

”ہانیہ میں اور ساحل 3 سال سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، مگر ہمارے بیچ لڑائی ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے اس نے تم سے دوستی کی اس نے تم سے صرف مجھے جلانے کے لئے دوستی کی تھی۔“ انا نے کہا۔

”تم مذاق کر رہی ہو، ساحل تو مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔“ ہانیہ نے کہا۔

”وہ تم سے محبت نہیں کرتا، بہتر ہوگا کہ تم اسے بھول جاؤ، ہمارے بیچ ایک شرط لگی تھی جس کی وجہ سے اس نے تم سے پیار کا کھیل کھیلنا۔“ انا نے سخت لہجے میں کہا۔

اور فون بند کر دیا۔ مگر ہانیہ کو ایک دھچکا لگا بھروسہ اور اعتبار، امید اور یقین کے ٹوٹنے کا چھکا۔

نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
”میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی ساحل! تم نے مجھے دھوکا دیا میرے جذبات سے کھلا۔“ وہ روتی رہی۔

☆.....

کافی دن گزر گئے اس نے ہانیہ کی کوئی خبر نہ لی۔
ہانیہ نے بات کی گہرائی جاننے کے لئے خود کال کی۔

”ہیلو!“ ساحل نے کال ریسیو کی۔
”ساحل.....!“ ہانیہ نے کہنے کے لئے لب کھولا

یہی تھا کہ ساحل نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”میں جانتا ہوں انا نے تم سے بات کی ہے، اس نے جو کچھ کہا کچھ کہا ہے۔ میں اور انا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“ ساحل نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

”تو پھر میرا اچھا کیوں کیا وہ سب کیا تھا؟“ ہانیہ نے کہا۔
”وہ سب ایک مذاق تھا، تم نے رشتہ پیچھے کی بات کی اس لئے مجھے یہ کھیل ختم کرنا پڑا۔“ ساحل نے کہا۔

”مذاق میرے جذبول کا مذاق میری محبت کا مذاق؟“ ہانیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ساحل ہے، جو روز ہی اس کا انتظار کرتا تھا۔

اس نے Cell آف کیا اور چھت پر جا کر بہت روئی۔
”ہانی ان آنکھوں کو کبھی مت رلانا جس پر ساحل فدا ہے۔“ وہ اس کی باتوں کو یاد کر کے روتی رہی۔

☆.....

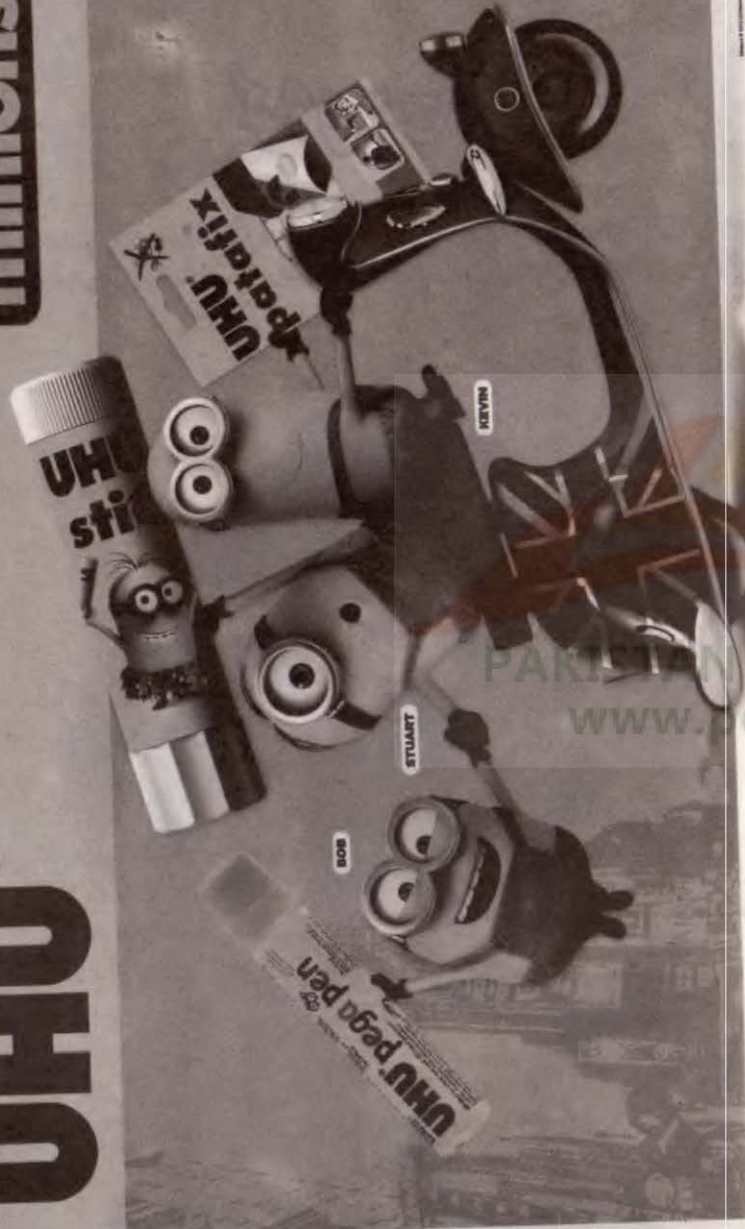
6 ماہ گزر گئے اس صورت حال سے نکلنے کے لئے اس نے قریب ہی اسکول جوائن کر لیا، بچوں کو پڑھا کر خود کو مصروف رکھنے لگی۔ گرمیوں میں اسکول سے پنک کا پروگرام بن گیا۔ میڈم نے کہہ دیا تمام میچرز کو جانا ضروری ہے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ سب سمندر کے پانی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور وہ دور سے دیکھ رہی تھی سب کو۔

”تم یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو ہانیہ! چلو پانی

minions

UHU

UHU - glues anything, anytime.



قارئین متوجہ ہوں

☆ اکثر قارئین کی شکایات کے مطابق کہ یہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے۔
☆ ایجنٹ کی سہولت کے لیے پرچہ نہ ملنے کی صورت میں آپ ادارے سے رابطہ کریں۔

☆ اپنے شہر اور علاقے کا نام۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر پرچہ دستیاب نہیں ہے، ہو سکے تو بک اسٹال کا کنٹیکٹ نمبر لکھ کر ادارے کو بتائیں۔
☆ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ ردآپ کو بروقت مل سکے۔

رابطہ کریں

ردآپ پلی کیشن

021-34535726

خط و کتابت کا پتہ:

129-D - بلاک 2

پی۔ای۔سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

میں۔ میڈم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”نہیں میم! میں نہیں جاؤں گی۔“

”چلو ناں۔“ تھوڑی دیر میڈم نے زبردستی اسے کھینچا۔ سب انجوائے کر رہے تھے اچانک ہی اس کی نظر ساحل پر پڑی جو دور سے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ نے اسے دیکھا، ایک شکایت بھی بہت سے سوالات تھے جن کا جواب وہ چاہتی تھی پر ہونٹ خاموش رہے اس نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے چہرہ پھیر لیا۔
”ہانیہ!.....!“ اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے ساحل تھا اس سے کچھ نہ بولا گیا بس دیکھتی رہی۔

”ہانی! مجھے معاف کر دو۔“ ساحل نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کتنا درد تھا اس کے چہرے پر وہ دیکھتا رہا۔
”ہانیہ! مجھے احساس ہے میں نے غلط کیا ہے میرا یقین کرو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”محبت یا مذاق؟“ ہانیہ نے اس کا مذاق یاد دلایا۔
”ہانی! تیری لائف میں 3 سال سے ہے۔“ ساحل نے کہل۔
”تو جاؤ اس کے پاس۔“ ہانیہ نے غصے سے کہا۔
”اس میں وہ بات نہیں جو تم میں ہے۔“ ساحل نے کہا۔
”میں تمہیں بھی نہیں چھوڑ سکتا ہانیہ! وہ بہت چالاک ہے جب کہ تم ایک معصوم لڑکی ہو۔“ ساحل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”یونو مسٹر ساحل! تم کسی سے محبت نہیں کرتے تم صرف اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ دو دشتیوں کے مسافر بھی کامیاب نہیں ہوتے۔“ ہانیہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔
”میں ایک بار دھوکا کھا چکی ہوں اب نہیں، میٹر معصوم محبت مرچکی ہے ساحل! جس طرح شیشے میں دراڑ آ جائے تو مکمل چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح میری محبت دوبارہ پہلے جیسی نہیں ہو سکتی، تم نے بہت دیر کر دی لوٹنے میں اب میرے دل میں تم کہیں بھی نہیں ہو۔“ اعتباراً کر ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ واپس نہیں آ سکتا ساحل۔ وہ بڑی روانی سے ہنسی ہوئی چلی گئی۔

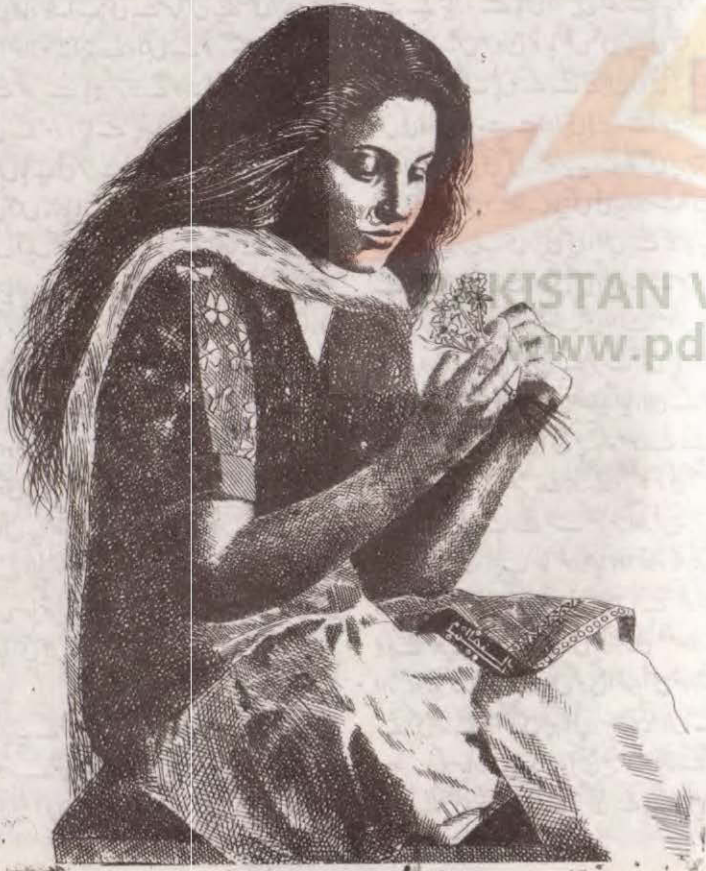
☆

کہاں بہشت ہے

آمنہ اپنے گھر کے دروازے کو تالا لگا کے جلدی اسکول سے جلدی چھٹی ہوتی تھی، وہ آج معمول سے سے بیڑھیاں اتری، جسے کا دن تھا اور جمعہ کو بچوں کو لیٹ ہوگئی تھی اس لئے تیز تیز قدم اٹھاتی طویل گلی عبور

کرنے لگی۔ جب وہ گلی کی نکر پر پہنچی تو سامنے سے آتی دو لڑکیوں کے چلنے نے اس کے قدم سست کر دیئے، وہ دونوں لڑکیاں اس کے گھر کی پچھلی گلی میں رہتی تھیں، ایک نویں کلاس (9th) اور دوسری بارہویں کی طالبہ تھی۔ نویں کلاس والی لڑکی نے ڈھیلی پونی کر کے بال دائیں کندھے پر ڈال رکھے تھے، آنکھیں کاہل اور مسکارے سے جچی، کانوں میں جگجگ کرتے پاپس، لبوں پہ پینک لپ اسٹک لگاٹھے، فل فننگ کی ٹمپن

پہنے، دائیں کندھے سے بائیں طرف جاتے بیگ کے ساتھ، کندھے سے چھوٹے یونیفارم کے سفید دوپٹے سے بے پروا باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی، جبکہ کالج والی لڑکی نے عبا بپہنا ہوا تھا، سیاہ عبا یا اوپر سے ٹمپن کی فننگ کا اور نیچے سے کسی فرائیڈ کی طرح گھیرے دار تھا جو کہ اس کے پاؤں میں آ رہا تھا، اس عبا یا کی آستینوں سے کندھے سے کلائی تک لمبائی میں جگجگاتے موتی اور چمکنے لگے ہوئے تھے جس سے وہ عبا یا کم اور ایک فینسی ڈریس زیادہ لگ رہا تھا۔ عبا یا کے ساتھ کا دوپٹہ



جو کہ بمشکل اتنا تھا کہ صرف سر کو ہی ڈھانپ سکتا تھا، وہ بھی اس کے سر کی بجائے گلے میں لٹکا ہوا تھا جبکہ چہرے کی جھاوٹ دوسری لڑکی سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ وہ دونوں طالبات کی بجائے فیشن شو کی ماڈلز لگ رہی تھیں، آمنہ حیران ہوئی کہ واقعی یہ لڑکیاں کسی تعلیمی ادارے سے آرہی ہیں یا کسی فنکشن میں شرکت کرنے جا رہی ہیں۔ جب وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی اس کے قریب سے گزریں تو تیز خوشبو نے اس کے گرد حصار باندھ لیا۔

وہ بے ساختہ سوچنے لگی کہ اسکول کالج تو وہ بھی جانتی تھی، دولت کی ریل پیل اور حسن بے مثال تو اس کے پاس بھی تھا، بلکہ اب بھی ہے مگر اس نے کبھی ایسے گھٹیا انداز و اطوار تو نہ اپنائے، اس نے تو تعلیم کے حصول کے لئے گھر سے باہر گزرنے والے وقت میں خود کو سنبھال کے اور دنیا سے چھپا کے رکھا، ہمیشہ اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کی حفاظت کی اور ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچایا۔ آمنہ کو تو اپنا عیابا، اس کا بڑا دوپٹہ اور نقاب ایک محفوظ پناہ گاہ محسوس ہوتا تھا جسے پہن کر وہ خود کو دنیا اور دنیا کی بری نظروں اور ہر برائی سے محفوظ محسوس کرتی، تحفظ کے اسی احساس نے اسے اعتماد دیا اور یونیورسٹی تک پہنچایا۔ اس نے اپنے والدین کی لالچ رکھی اور اس کے صلے میں اس کے پاس اچھا ٹیک شوہر، سلجھی ہوئی، تمیز دار اور فرماں بردار اولاد بھی۔ وہ خود بھی ایک اچھی بیٹی، اچھی بیوی اور اچھی ماں تھی۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ یوں راج سنور کے اپنی نمائش کروانے والی، نامحرم مردوں کو متوجہ کرنے والی لڑکیاں آخر کس معاشرے اور کس مذہب کی نمائندگی کرتی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں؟

☆

جویریہ کے شوہر کو آفس کے کام سے کچھ دنوں کے لئے دوسرے شہر جانا تھا، اس لئے وہ دونوں بچوں کے ساتھ اپنی امی کے گھر آئی تھی، بھابھی اسے فورس

کر رہی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ ان کی سیٹلی کی بہن کی منگنی پہ چلے، بھائی چونکہ مصروف تھے اس لئے بھابھی اسے ساتھ لے جانا چاہ رہی تھیں، لہذا جویریہ بچوں کو ان کی نانو کے حوالے کر کے انم بھابھی کے ساتھ منگنی کے ٹائٹ فنکشن میں چل آئی۔

عروج کی منگنی کافی ویل آف تھی، منگنی میرج ہال میں تھی، جب وہ دونوں ہال میں پہنچیں تو ڈھیر سارے مہمانوں کو دیکھ کر دروازے میں ہی رک گئیں۔ کس گید رنگ تھی، فل آواز میں گانے چل رہے تھے، دونوں کو سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرف جائیں، اتنے میں سامنے سے عروج آگئی، سیلوئیس بلیک دریس میں، دوپٹے سے بے نیاز، کھلے بال دائیں کندھے پہ ڈالے، تیز میک اپ میں عروج تو بالکل بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ انم تو ایک پل کے لئے حیران رہ گئی کہ کیا یہ واقعی

اس کی وہی دوست ہے جو اپنی ڈینٹ ڈریسنگ کی وجہ سے اسے اچھی لگتی تھی۔ جویریہ نے خاصی پریشانی سے عروج کو سر تا پیر دیکھا۔ بھابھی کی یہ دوست اس کی امی کے گھر کے قریب ہی رہتی تھی، اس لئے جویریہ کی اس سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی، مگر سامنے موجود عروج تو اس عروج سے بالکل مختلف تھی، اسے اتھوس ہوا۔

عروج نے ان کو اسٹیج کے فرنٹ نیل پر بٹھایا، کچھ ہی دیر میں لڑکا لڑکی کو اسٹیج پر بٹھایا گیا، ان کے بیٹھے ہی ڈھیروں لڑکے لڑکیاں اسٹیج پر کچھ صوفے کے پیچھے تو کچھ دائیں بائیں کھڑے ہو گئے، لڑکا لڑکی مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے سب کنزنز اور فرینڈز ہونیک کر رہے تھے، عجیب سا شو چل رہا تھا، پھر لڑکے کی والدہ نے لڑکے کو انگوٹھی تھما دی جو اس نے مسکرا کے کچھ بولتے ہوئے لڑکی کو پہنائی تو لڑکی کھکھلا کے ہنسی اور ”ہوہو“ کے شور سے ہال گونگ اٹھا، اسی شور میں لڑکی نے بھی لڑکے کو انگوٹھی پہنائی، سب بڑوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی، اسٹیج پر موجود لڑکے لڑکیوں نے نئے نئے منگنی شدہ جوڑے کو پہنچ کے نیچے اتارا اور ان

کے گرد دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے، ڈی جے نے گانا چنچ کیا۔

جونہی ہال میں ”ڈسکو دیوانے“ کا میوزک گونجا تو سب نے میوزک کے ساتھ ہلتے ہوئے دائرے میں چلنا شروع کر دیا۔ باقی سب بڑے ان کو دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے، وہ سب مسکراتے ہوئے دائرے میں ڈانس کر رہے تھے۔

”کسی ایک بھی لڑکی کے پاس دوپٹہ نہیں ہے کتنا عجیب لگتا ہے بغیر دوپٹے کے“۔ جویریہ نے انم بھابھی کے قریب ہو کر سامنے ڈانس کرنی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو انم سخت شرمندہ ہوئی۔

”تم ملے تو جینا آگیا،..... تم ملے تو جادو چھا گیا.....“ گانا بدلا تو دائرہ توڑ کے سب کپڑو بن کے ڈانس کرنے لگے۔

انم نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا فنکشن ہو سکتا ہے، نجمانے جویریہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی کہ کسی دوست ہے اس کی۔

”دروازے کو کنڈی مارو، کوئی نہ بیچ کے جانے لے“۔ گانا پھر بدلا تو ہال میں رنگ برنگی روشنیاں کھولنے لگیں، کپڑو کا ڈانس بھی چنچ ہو گیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ ہم منگنی کے فنکشن میں نہیں بلکہ کسی ڈانس پارٹی یا ڈسکو میں آئے ہیں، کتنے آرام سے یہ لڑکیاں غیر نامحرم لڑکوں کے ساتھ ڈانس کر رہی ہیں اور سامنے بیٹھے ان کے لبرل اور براڈ مائنڈڈ والدین خوشی و فخر سے تالیاں بجا رہے ہیں“۔ جویریہ نے پریشانی سے سامنے ہوتے تماشے کو دیکھتے ہوئے انم بھابھی سے اپنا خیال ظاہر کیا، جو خود بھی پریشان تھیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ منگنی کوئی شرعی رشتہ تو نہیں ہے اور نہ ہی یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مقرر ہیں جویریہ یوں اتنے قریب.....

کیسے والدین ہیں ان کے جو اپنی بیٹیوں کو یوں سب کے سامنے غیر لڑکوں کے ساتھ ڈانس کرتا دیکھ کر

فخر کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے، کہاں ہے ان کی غیرت؟ کیا ان کے ضمیر زندہ ہیں؟

”ہم تیرے بن اب رہ نہیں سکتے، تیرے بنا کیا وجود میرا“۔ ان لڑکے لڑکیوں کا ڈانس ہر بدلتے گانے کے ساتھ بدل رہا تھا، بالکل ایسے جیسے انہوں نے اس سب کی پہلے سے ریہرسل کی ہو۔

”یہ ماڈرن سوسائٹی کے پڑھے لکھے دولت مند لوگ سانس تڑپتی کے ساتھ ذہنی طور پر اس قدر ہستی اور تنزلی کا شکار ہو چکے ہیں کہ اپنے اچھے برے اور غلط صحیح کی تفریق ہی بھلا بیٹھے ہیں“۔ انم نے دل میں سوچا۔

جویریہ کے ذہن میں سوال اٹھ رہے تھے کہ کیسے لوگ ہیں، ان کی غیرت کیسے یہ گوارہ کر رہی ہے کہ ان کی بیٹیاں یوں سارے خاندان کے سامنے دوپٹوں سے بے نیاز بے حیائی کے اس مظاہرے میں مگن ہیں۔

کیا فرق رہ جاتا ہے ان لڑکیوں میں اور باقاعدہ ناخنچے دایوں میں؟

انم کا دل چاہ رہا تھا کہ فوراً یہاں سے چلی جائے مگر یوں اچانک فرنٹ سے اٹھ کے چلے جانا، مناسب نہ تھا، مگر مزید بیٹھنے اور برداشت کرنے کا اس میں حوصلہ بھی نہ تھا، جویریہ کے تاثرات بھی انتہائی سنجیدہ اور سپاٹ تھے۔ انم اٹھ کے عروج کے پاس گئی اور بھانا بنایا کہ امی کا فون آیا ہے، بچے انہیں تنگ کر رہے ہیں، اس لئے ہم اب گھر جائیں گے۔ عروج نے انہیں کھانے کے لئے روکنا چاہا مگر انم نے بمشکل اسے راضی کر ہی لیا اور معذرت کر کے جویریہ کو لئے گھر آگئی۔ دونوں سارے راستے خاموش ہی رہیں۔ انم میں اسے مخاطب کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

جبکہ جویریہ سوچ رہی تھی کہ ماڈرنزم اور براڈ مائنڈڈ ہونے کا کیا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنی روایات اور اخلاقیات کو بھول جائے، کیا دولت انسان سے اس کی

غیرت چھین لیتی ہے؟ یا اس کو بے ضمیر کر دیتی ہے جو اسے اپنے ارد گرد ہوتے اچھے برے کا احساس نہیں ہوتا۔ اپنی اولاد کو دولت اور سائنات دے کر اور ایسی آزادی دے کر جو کہ بے راہ روی میں شمار ہوتی ہے، امیر لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے والدین ہونے کے تمام حقوق ادا کر دیئے ہیں۔

جویرے نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی اولاد کو ابھی سے اچھے برے میں فرق سکھائے گی، اپنے مذہب اور اس کی پاکیزہ تعلیمات سے ان کے اخلاق و کردار سنوارے گی، تاکہ کل کو اس کا ضمیر ان لوگوں جیسا نہ ہو اور وہ فخر سے اپنی اولاد کا سامنا کر سکے۔ اس کی اولاد جو اس کے خاندان کی آئندہ نسل ہے، باکرہ دار اور بااخلاق ہوتا کہ اس کے خاندان کی عزت و شرافت پہنچی آج نہ آئے اور نہ ہی روز محشر اسے بارگاہ الہی میں شرمسار ہونا پڑے۔

☆.....

گرمی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی، سدرہ نے دو چار لون کے سوٹ لینے کا سوچا اور فراغت باتے ہی چھوٹی بہن کے ساتھ بازار آ گئی، چونکہ چھٹی کی دن تھا اس لئے بازار میں رش معمول سے زیادہ تھا، ہر طرح کے لوگ سڑکوں پر دکھائی دے رہے تھے، کچھ خواتین شاپنگ میں مصروف تھیں تو کچھ صرف ونڈز شاپنگ میں جبکہ کچھ دکاندار آتے جاتے لوگوں بالخصوص خواتین کو دیکھ کے لطف اندوز ہو رہے تھے، وہ دونوں سوٹ لے کر کپڑوں کی دکان سے نکل کر کتابیوں والی دکان کی طرف بڑھیں کہ صبا نے اپنی کتابیں لینی تھیں، چلتے چلتے سدرہ کی نظر سامنے سے آتی خواتین پر پڑی تو اس نے تاسف و افسوس سے انہیں دیکھا۔ تک سب سے تیار وہ دونوں عورتیں جن میں سے ایک قدرے کم عمر تھی، ہائی ہیل کی ٹک ٹک کرتی ان کے قریب سے گزریں تو انہوں نے بغور دیکھا، کہ ان دونوں نے یوں میک اپ کیا ہوا تھا جیسے وہ کسی شادی

میں شرکت کے لئے آئی ہوں۔

”آپ لکھتی عجیب لگ رہی تھیں یہ دونوں عورتیں، اتنا میک اپ کر کے بازار آنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“ صبا نے حیرت سے بہن سے پوچھا تو سدرہ لا جواب ہو گئی۔ اب وہ اس بات کا کیا جواب دے سکتی کو، وہ تو خود حیران تھی بازار میں تو ویسے بھی طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں، یوں خود کو نمایاں کرنے کا کیا مقصد ہوا بھلا؟ بازار تو شیطان کا گھر ہے، ایک انتہائی غیر محفوظ اور ضرر رساں جگہ، شر کا ٹھکانہ۔

وہ دونوں تو خود انتہائی ضرورت کے وقت بازار کا رخ کرتی تھیں اور ایک ہی چکر میں ساری ضروری شاپنگ کر لیتی تھیں، تاکہ جلد از جلد دوبارہ نہ آنا پڑے۔ اسے بازار آتے ہوئے سخت کوفت ہوئی تھی، خوشخواہ ہر کوئی گھورتا محسوس ہوتا اور یہ عورتیں کیسے راج سنور کے مردوں کو دعوت نظر دے رہی ہیں۔

بے پردہ اور بے حجاب عورتیں، اگر کوئی برقعہ پہنتی بھی ہے تو صرف فیشن کے لئے جو صرف کپڑوں کو چھپائے اور چہرہ اسی طرح عیاں رہے۔

دوڑے کو تو سر پہ لینے کا بڑا فیشن چلا ہے، مگر کیا فائدہ اس فیشن کا کہ جس سے صرف سر ڈھانپنے ہوں اور سینہ دوڑے سے خالی رہے، آج کل تو حجاب فیشن کا حصہ بن چکا ہے، ایسے ایسے برقعے دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ڈریس اور برقعے میں فرق کرنا مشکل ہے رنگ برنگے، فنگ والے، مختلف ڈیزائننگ کے نت نئے عباے بازار میں موجود ہیں۔ جن سے پردے کا اصل مقصد تو کہیں پس پردہ ہی رہ گیا ہے اگر باقی رہا ہے تو صرف فیشن.....

ایسی فیشن زدہ عبا کی شوقین خواتین نے اصل پردے والیوں کو بھی بدنام کر دیا ہے، لوگ سب کو ایک سا ہی سمجھنے لگے ہیں۔

”نجانے کیا ہو گیا ہے ہماری مسلمان خواتین کو، کیوں یہ اپنی روایات اور اخلاقیات کو بھلا بیٹھی ہیں۔“

قریب سے بلند آواز میں باتیں کرتی اور تھپتھپ لگتی لڑکیوں کے گزرنے پر سدرہ نے دل میں تاسف سے سوچا اور گھر جانے کے لئے رکشے کی طرف بڑھیں جہاں پچھلی سیٹ پر ٹائٹ جینز، چھوٹی شرٹ اور گلے میں اسٹول لٹکانے بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

☆.....

عائشہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہوئی تو تھکن اتارنے کی غرض سے T.V آن کر کے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کے بیٹھ گئی، 360 چینل پر ماڈلز برائینڈل ڈریسز میں باری باری اسٹیج پر آ رہی تھیں، ان کے ڈریسز سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس ملک کی خواتین ہیں، گہرے گلے، سیلیویس، اکثر ڈریسز کے پچھلے گلے بھی کافی گہرے اور کھلے تھے کہ پوری کمر عیاں ہو رہی تھی، ان ڈریسز نے تو ان ماڈلز سے ان کے مسلمان ہونے کی شناخت ہی چھین لی تھی، جبکہ ایسے ڈریسز کی اکثر ڈیزائنرز خود سر تاپا ڈھنکی ہوئی ہیں۔

کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ لڑکیاں کسی اسلامی ملک کی، کسی مسلمان گھرانے کی بیٹیاں ہیں، برائینڈل ڈریسز کے بعد ماڈلز جن کپڑوں میں دوبارہ ریپ پر آئیں، وہ تو بے حیائی کی حد تھے۔ عائشہ نے گھبرا کے فوراً چینل بدلا۔

”کوئی دلہن ایسے کپڑے پہنتی ہوں گی؟ ہمارے ملک میں کہاں ایسے لباس کا استعمال ہوتا ہے، اور اگر کہیں خواتین ایسے لباس استعمال کرتی ہیں تو کیا ان کے گھر والے انہیں کچھ نہیں کہتے؟ کیا انہیں اس عریاں لباس اور اس بے حیا فیشن پر اعتراض نہیں ہوتا؟“ عائشہ نے پریشانی سے خود کلامی کی۔

دوسرے چینل پر نئی بیوٹی کریم کا کمرشل چل رہا تھا، جس میں ایک مشہور و معروف T.V کیسٹریس بغیر آستینوں کے کھلے گلے والے لہراک میں اپنی سہیلیوں

کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ وہ کمرشل ختم ہوا تو Coke کا کمرشل شروع ہو گیا، جس میں مختلف جگہوں پر لڑکے لڑکیوں کو Coke پی کے اکٹھے ڈانس کرتے دکھایا جا رہا تھا، سب لڑکیوں نے ٹائٹ پینٹس اور فنگ والی چھوٹی چھوٹی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ عائشہ تاسف سے سر پکڑے انہیں دیکھتی رہی، ایک کے بعد ایک کمرشل چلتے رہے۔

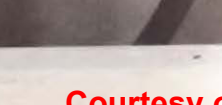
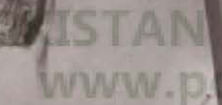
ہر کمرشل میں ایک دو عورتیں ضرور تھیں، چاہے پراڈکٹ زنانہ ہو یا مردانہ، یوں لگتا ہے جیسے اشتہارات میں عورت کی موجودگی پراڈکٹ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

”سمجھ نہیں آتی ایسا کیوں ہے، کیوں عورت کے وجود کو اتنا بے مول اور ارزاں سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر جگہ اس کو اشتہار بنادیا جاتا ہے، چاہے وہ کسی دکان کی دیوار ہو، بازار میں لگا سائن بورڈ ہو یا کسی پراڈکٹ کا ریپر، عورت کی موجودگی لازمی ہے، صابن، صرف کے ریپر پر عورتوں کی تصاویر ہوتی ہیں۔“ عائشہ کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اب اسی چینل پر ایوارڈ شو شروع تھا اور ایک مشہور سنگر مغربی لباس زیب تن کئے گا نا گا رہی تھی، بلکہ باقاعدہ ڈانس بھی کر رہی تھی، جس پر ہر طرف سے تالیوں کی آوازیں ہال میں گونج رہی تھیں، اس کا گا نا ختم ہوا تو دوسرا مشہور سنگر اسٹیج پر آیا، اس کے پیچھے آٹھ نولڑکیاں بھی اسٹیج پر آئیں اور گانے پر ڈانس کرنے لگیں، ان لڑکیوں نے فل فنگ والی ٹیٹیں زیب تن کی تھیں اور دوڑے نادر تھے۔

سنگر کے آگے اسٹیج کے فرنٹ پر ڈانس کرتی وہ لڑکیاں اور تماشاخیوں میں بیٹھے مرد، جوان کے ڈانس سے محظوظ ہوتے ہوئے تالیاں بجا رہے تھے۔ یہ سارا منظر بظاہر تو ماڈرن سوسائٹی کا تھا جو کہ معاشرے کے عزت دار شہری اور شرافت کے علم بردار تھے، مگر کچھ ایسا ہی منظر ان بدنام زمانہ گلیوں کے چوباروں کا ہوتا ہے

10 PROBLEMS SOLUTION



میڈی کیم ڈینٹل کریم چلے۔۔۔ دانتوں کی لائف ٹائم انشورنس

رداؤ انجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول
کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں

تم میرے ہو کے رہو

صالحہ محمود

ت 600/- روپے

کچی کلیاں آنگن کی

صالحہ محمود

ت 600/- روپے

کبھی عشق ہو تو پتہ چلے

شازیہ مصطفیٰ عمران

ت 550/- روپے

کچھ عشق میں رنگ جنوں بھی تھا

نانکھ طارق

ت 500/- روپے

القریش پبلیکیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

ویلم بک پورٹ اردو بازار کراچی

فون: 021-32633151

ایک طرف لڑکیوں کا ڈانس اور دوسری طرف مردوں
تماشا کی۔ معاشرے کے یہ عزت دار لوگ ایک طرف تو
ان لڑکیوں اور ان کے رہنے والوں کو قابل عزت نہیں
گردانتے، جبکہ دوسری طرف اپنی لڑکیوں کے ڈانس
یکھنے اور کرنے پر فخر کرتے ہیں اور اسے ماڈرنزم کا نام
دیتے ہیں۔

عائشہ کا یہ سوچ سوچ کر سردرد کرنے لگا کہ کیوں
ہمارا معاشرہ، ہمارے ہم وطن وہم مذہب اپنے اللہ اور
اس کے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات
کو بھلا چکے ہیں؟ ہمارے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے اس امت کی خاطر اپنی قربانیاں دیں، اپنی
تکلیفیں سہیں، رو رو کے دعائیں کیں اور یہ احسان
فراموش امت انہیں اور ان کے احکامات کو ہی بھلا
بیٹھی ہے۔

اسلام نے عورت کو پردے میں رہنے والی کہا اور
آج کی عورت پردہ تو دور سرے سے اپنے مذہبی
احکامات و تعلیمات کو فراموش کر کے مغرب کے رنگ
میں ڈھل چکی ہے۔ اسلام نے عورت کو اپنی خوبصورتی
اور زینت کو چھپا کر رکھنے کا حکم دیا مگر اس دور کی عورت
نے اپنے لباس میں سے دوپٹے کو بوجھ سمجھ کر نکال کر
اپنی نمائش کو ضروری مان لیا۔

اس اسلامی مملکت میں عورت کے اس قدر سستا،
بے وقعت اور بے پردہ ہونے پر، آدم کی بیٹی کی یوں
عریانی اور بے حیائی پر ہر زندہ دل اور پانچیر مومن
مسلمان کا دل کڑھتا ہے اور بے اختیار اس کے دل و
دماغ سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ کہاں ہے بنت خوا؟
وہ جو شرم و حیا کا پیکر ہو، اس قدر مقدس و پاکیزہ
ہو کہ اسے دیکھ کر اس کی عزت کرنے کا دل چاہے اور
اس پر اٹھنے والی نگاہ اس کے احترام میں خود بخود جھک
جائے۔
”کہاں ہے وہ بنت خوا؟“

محبت کا مہر

”بی بی جی! کمرہ خالی کر دیں مجھے صفائی کرنی ہے۔“ ماسی کی آواز پردوں نے مڑ کر دیکھا۔

”تم آج پھر آگئیں، رضیہ کہاں ہے؟ یہ روروں چھٹی کیوں کرتی ہے؟“ اریبہ نے کام دالی سے پوچھا۔

”ہاجی! اب وہ نہیں آئے گی میں ہی آؤں گی، رضیہ بھاگ گئی ہے اسے کھر والے کو چھوڑ کر۔“ رضیہ کی بہن نے ان لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”کیا؟ کیوں بھاگ گئی؟“ اب کے خمن نے تشویش سے سوال کیا۔

”وہ جی اس کا مرد اس کی پرواہ ہی نہیں کرتا تھا، بے چاری خود ہی کہا کر جیسے تیسے اپنا اور اپنے مرد کا پیٹ پاتی تھی لیکن پھر بھی اس کا مرد اس پر پیار بھری نظر نہیں ڈالتا تھا۔“ وہ بھی رضیہ کا پورا قصہ سنائے بغیر نہ رہ سکی۔

”عجیب ہے اگر اس کی پرواہ نہیں کی تو وہ گھر ہی چھوڑ کر بھاگ گئی؟“ خمن نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر اریبہ کو دیکھا۔

”کیا عجیب ہے۔ صحیح تو ہے اتنا سب کرنے کے باوجود اس کا شوہر اس کی قدر پیارا اور پرواہ نہ کرے تو وہ کیا کرتی، ہر شخص اظہار چاہتا ہے، اگر اظہار نہیں بھی ملتا تو وہ احساس مانگتا ہے اپنے لئے۔“ اریبہ نے خمن کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”میں نہیں مانتی کہ اگر وہ اظہار نہیں کرتا اور دنیا دکھاوے کو اس کی پرواہ نہیں کرتا تو کوئی اپنا گھر ہی چھوڑ



دے۔“ ثمن بھی اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔

ادھر وہ کام چور ماسی ان کی بحث دیکھتے ہوئے ایک بار پھر کام میں دھڑکی مار کر چلی گئی۔

”دیکھو ثمن! ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے سراہا جائے، تعریف کی جائے، ضروری نہیں الفاظ سے بلکہ اپنے انداز سے بھی اس پر ظاہر کر سکتا ہے اور ہر سوال رضیہ کا وہ غلط عورت نہیں تھی، 4 سال سے اس گھر میں کام کر رہی ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ ذرا سا صفائی سے کام کرنے کی تعریف پر اتنا خوش ہو جاتی تھی، تو پھر وہ اپنے بارے میں ایسی ہی sensitive ہوگی اور ویسے بھی کون سا اس کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں جو وہ کچھ سوچتی۔“

”بیڑیاں؟“ ثمن نے اریہ کا لفظ سوالیہ انداز میں دہرایا۔

”ارے یار بچے بھی تو کسی بیڑیوں سے کم نہیں ہوتے، اولاد ہوتے ہی ماں کے پاؤں زنجیر سے بندھ جاتے ہیں۔“ اریہ نے وضاحت کی۔

”خیر آپ کی یہ فلسفائی میں ابھی بھی نہیں مانتی۔“ ثمن نے یہ کہتے ہوئے اپنی بکس بٹھیں اور گھر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

ثمن اور اریہ دو بیسٹ فرینڈ تھیں اور ساتھ میں دور کی رشتہ دار بھی، کراچی یونیورسٹی میں ایک ساتھ اکٹا کس ماسٹرز کی اسٹوڈنٹ تھیں اور ان کا یہ ساتھ میٹرک سے تھا اس لیے یہ دونوں دو جان یک قالب تھیں۔ بہت ساری جگہ پر اختلاف اور بحث ان کی الگ الگ سوچ اور نظریے کی وجہ سے تھا لیکن ان کی بحث ایک دوسرے کو قائل کرنے کے لیے ہوتی تھی جو کہ اکثر ادھوری رہ جاتی تھی، کبھی اریہ کو اینڈ پر اختلاف ہو جاتا تو کبھی ثمن زچ ہو کر انکار کر دیتی لیکن دونوں میں اریہ کی سوچ بہت وسیع النظیر اور حقیقت سے بھرپور دلائل پر مبنی ہوتی تھی۔ جبکہ ثمن اپنی لاپرواہ طبیعت کی بنا پر ہنسی بھلا کر بات آگے

بڑھانے سے رک جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

دن تیزی سے گزر رہے تھے آخر کار فاضل انگریز کی ڈیٹ بھی قریب آگئی اور ان دونوں کی توجہ صرف امتحان پر مرکوز ہو گئی۔

جیسے تیسے پیپرز سے فارغ ہوئیں تو ثمن کے سرال والوں نے شادی کے لیے شور مچا دیا، چاروٹا چار ان کو ہائی بھرنی ہی پڑی اور یوں ثمن کی شادی کی تاریخ طے پا گئی۔

زیر، ثمن کی پچھوکھا بیٹا تھا، وہ شروع سے ہی ثمن کو پسند کرتا تھا، آہستہ آہستہ یہ پسند محبت میں تبدیل ہو گئی، یہ بات ثمن بھی اچھی طرح جانتی تھی لیکن کبھی ثمن نے زیر کو کوئی رسائی نہیں دیا تھا۔

زیر اسے ثمن کی شرم و حیا تصور کرتا تھا، لیکن یہ ثمن کی شرم و حیا نہیں اس کی طبیعت کی بے اعتنائی تھی۔ وہ کبھی کسی چیز سے جلد نہ تو متاثر ہوتی تھی اور نہ ہی خاطر میں لاتی تھی۔

شادی کا دن بھی آپہنچا اور ثمن، زیر کی سنگت میں نیکی کی دلیلیں چھوڑ گئی۔

زیر نے بہت جاؤ سے ثمن کا استقبال کیا اور اس سے زندگی بھر محبت میں کمی نہ آنے کے وعدے کئے، زیر کی محبت کے بھرپور اظہار اور اعتبار نے ثمن کو ایک ایسی روٹی بخش کر ثمن خود اپنی قسمت پر رشک کے بتا نہ سکے۔

☆.....☆.....☆

دن دھیرے دھیرے گزرتے جا رہے تھے اریہ بھی شادی ہو کر ملک سے باہر جا چکی تھی اور ادھر ثمن ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی۔

ثمن نے زیر کو کبھی محبت کے جواب میں محبت بھری باتیں نہیں کہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زیر سے محبت نہیں کرتی تھی، کئی بار زیر کے اصرار پر بھی اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھ سے اظہار کی امید نہیں رکھئے گا، مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا، لیکن اپنے

معاملے میں اسے ہر وقت یہی توقع رہتی تھی کہ زیر اسے ہر بات پر ہر انداز پر سراہے جو کہ زیر اپنی عادت کے مطابق وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا۔

لیکن ثمن اپنے مزاج سے نہ ہٹ سکی۔ ثمن اور زیر کی زندگی میں عروہ جیسی منہ پری نے قدم رکھا دونوں خوشی سے جھوم اٹھے، دونوں کی سوچ کا محور عروہ کی ذات بن گئی۔

آہستہ آہستہ ثمن عروہ میں اتنی مگن ہو گئی کہ اس نے زیر پر توجہ دینی بھی چھوڑ دی، عروہ کی پرورش کے چکر میں زیر کے کاموں میں کوتاہی ہونا شروع ہو گئی، زیر کی بات کی امید رکھتا تو ثمن چڑ جاتی کہ اب ہم ثمن اتنا نہیں ہیں۔

زیر خاموش سا ہو جاتا، عروہ کے بعد زندگی میں اریہ بھی شامل ہو گئی، ثمن کی مصروفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

”ثمن پلیز! مجھے بھی تمہاری توجہ چاہئے، تم ہر وقت بچوں میں لگی رہتی ہو۔“ زیر نے دھیمے انداز میں ثمن سے شکایت کی۔

”اور میں کس سے توجہ مانگوں؟“ ثمن نے پلٹ کر زیر سے سوال کیا۔

”میں دوں گا تمہیں توجہ، میں کہتا تو ہوں کہ تم ہر وقت کھر کے کام اور بچوں کو اپنے اوپر حاوی نہ کرو اور لوگ بھی تو ہیں، وہ بھی تو بچے بال رہے ہیں اور اپنے لئے ٹائم بھی نکالتے ہیں، تم بھی بنو سنو، میرے آنے سے پہلے سارے کام نمٹا لو، پھر ہم کبھی باہر کھانے کے لیے چلیں گے، تو بھی آؤ تنگ کے لیے، اس طرح میرا تمہارا دن بھی فریش رہے گا۔“ زیر نے بہت پیار سے سمجھانا چاہا۔

”پلیز زیر! ہماری شادی کو 5 سال ہو گئے ہیں، میں کوئی نئی ٹولی دہن نہیں ہوں جو ہر وقت شام میں تیار ہو کر میاں کا انتظار کروں، اب آپ حقیقت کی دنیا میں واپس آ جائیں، یہ آؤ تنگ یہ ہو تنگ صرف وقت

رواڈ انجسٹ 149 مارچ 2016ء

اور پیسہ کا ضیاع ہے اور ویسے بھی مجھے پسند نہیں۔“ ثمن نے رکھائی سے جواب دیا۔

”پھر تم خود ہی بتاؤ کہ ہم اپنی لائف میں کس طرح کچی خوشیاں لاسکتے ہیں؟“ زیر نے پھر ثمن سے سوال کیا۔

”کیا ہو گیا زیر! ہمارے یہ بچے ہی ہماری خوشیاں ہیں، ان سے زیادہ بڑی خوشی اب اس لائف میں اور کیا ہوگی؟“ ثمن اپنی طبیعت کے مطابق آخر میں جھنجھلائی۔

زیر، ثمن کو دیکھ کر بس دل میں افسوس کر کے رہ گیا۔ زیر زندگی کو بھرپور انداز میں انجوائے کرنے والا ایک زندہ دل شخص تھا، ہر چیز اس کی پسند مرخی کے مطابق اسے لی جاتی تھی لیکن زیر، ثمن کا مزاج آج تک پہنچ نہیں کر سکا تھا، لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو ثمن کے مزاج سے کپور و مانر نہیں کر پا رہا تھا۔

زیر نے ثمن کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی اور خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف کر لیا۔

زندگی ایک مٹتی انداز سے آگے بڑھنے لگی، اس سے ثمن کو تو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا، لیکن زیر اس لائف سے استاءت کا شکار ہو گیا، ایسی زندگی سے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو ثمن! کیسی ہواتے عرصے بعد کیسے یاد کر لیا؟“ اریہ نے ثمن کی کال ریسیو کرتے ہی شکوہ کیا۔

”بس بہت یاد آ رہی تھیں میں نے سوچا تمہیں فون کر لوں۔“ ثمن نے ہوجمل آواز میں جواب دیا۔

”چلو یاد کے بہانے تم نے فون تو کیا کم از کم، اور سناؤ زیر بھائی کیسے ہیں، آج بھی وہی انداز ہے ان کی چاہت کا یا پھر وہ لبالب نہ کر بدل گئے ہیں؟“ اریہ نے کہا۔

”نہیں زیر اب وہ زیر نہیں رہے اب وہ بدل گئے ہیں، مجھے بدلنے کی کوشش میں اب وہ میرے ہی مزاج

میں دھل گئے ہیں۔“ ثمن نے ٹھوٹے انداز میں کہا۔
 ”کیا... تم میں تو بڑھیا کی روح تھی، اچھے خاصے جوان بندے کو بوڑھا بنا دیا، ضرور اس میں تمہاری بے اعتنائی اور لاپرواہی کا ہاتھ ہوگا۔“ اریبہ نے سارا الزام ثمن کو دے دیا۔
 ”چلو خیر، ہم مزاج بندے کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟ عروہ دارا ریشہ کیسی ہیں؟“
 ”سب ٹھیک ہیں تم پاکستان کب آرہی ہو؟“ ثمن نے اس انداز سے پوچھا کہ اریبہ ٹھک گئی، اسے محسوس ہوا کہ ثمن اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔
 ”کیا بات ہے ثمن! کوئی پریشانی ہے کوئی بات ہے، کیوں اتنی اداس لگ رہی ہو آج مجھے؟“ اریبہ کے لہجے میں ٹکرا گئی۔
 ”ارے نہیں کچھ نہیں، بس تم آج یاد بہت آ رہی ہو، تم جلد پاکستان آ جاؤ میں چاہتی ہوں کہ تم پھر سے ڈھیر ساری باتیں کریں، چلو میں پھر بعد میں بات کروں گی اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ“ ثمن نے تو فون بند کر دیا، لیکن اریبہ کو اپنی طرف سے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔
 ”زیر آج کل آفس میں کام میں اتنا بڑی ہو گئے ہیں کہ گھر ٹائم سے آتا بھول گئے ہیں۔“ ثمن نے گھڑی میں رات نو بجے کا ٹائم دیکھ کر سوچا۔
 ٹھیک 10 بجے زیر کی گاڑی کا ہارن بجنا، ثمن کی آنکھ لگ گئی تھی، ہارن کی آواز پر آنکھ کھول کر نظر سیدھی گھڑی پر جا گئی، ہڑ بڑا کراچی اور دروازہ کھولا۔
 ”زیر! اتنی دیر کر دی، کیا آج میٹنگ تھی کوئی؟“ ثمن نے زیر کو دیکھتے ہی کہا۔
 ”ہاں آج ایک اہم میٹنگ تھی، عروہ دارا ریشہ سو گئیں؟“ زیر نے سرسری سا جواب دیا۔
 ”جی، میں کھانا نکالتی ہوں۔“ ثمن پلٹ کر کچن کی طرف مڑ گئی۔
 ”نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“ زیر نے یہ کہہ کر ٹائی کی ٹاٹ لوڑی اور آگے بڑھ گیا۔

ثمن کے بڑھتے قدم رک گئے اور بھوک جیسے کہیں اڑ گئی۔ خاموشی سے جا کر اپنے بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔
 ”زیر! آج آپ نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے کھانا بھی کھایا یا نہیں۔“ یہ سوچتے ہی ایک آنسو ثمن کے گال پر ڈھلک گیا۔
 آج کل ثمن زیر کے انداز اور مزاج کو لے کر بہت حساس ہو رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے اریبہ کو فون کیا، وہ اریبہ سے باتیں کر کے اپنا دل بہلانا چاہ رہی تھی، لیکن کچھ کہہ نہ سکی۔
 ☆.....☆.....☆
 ”زیر! سر دیاں آنے والی ہیں بچوں کے لیے کچھ گرم کپڑے لینے ہیں، اگر آج آپ لیٹ چلے جائیں تو؟“ ثمن نے بات ادھوری چھوڑ کر زیر کو دیکھا۔
 ”نہیں ثمن! آج میری بہت اہم ڈیٹنگ ہے، پلیز تم خود جا کر شاپنگ کرو، کچھ پیسے رکھ لو اپنے اور بچوں کے لیے کپڑے لے لیتا۔“ بھاری رقم ثمن کے ہاتھ پر رکھ کر زیر اپنی تیاری میں لگ گیا۔
 ثمن بغیر کسی جرح کے زیر سے پیسے لے کر مڑ گئی جبکہ زیر کو تو جی ٹھیک کہ ثمن ضرور اس سے بحث کرے گی، زیر اسے جاتا دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔
 مال سے نکل کر ثمن، اریبہ کو گود میں لئے جوں ہی آگے بڑھی گلاس ڈور کے ساتھ سامنے کافی شاپ پر جیسے نظر میں تو ہٹنا ہی بھول گئیں۔ ایک لمحے کو ثمن کو یقین ہی نہ آیا کہ زیر کسی لڑکی کے ساتھ کافی انجوائے کر رہا ہے، لڑکی کافی ڈینٹ سی تھی جیولری کپڑوں سے لے کر ہر انداز میں۔
 ثمن کے قدم من بھر کے ہو گئے، وہ کس طرح گھر واپس آئی اسے پتہ ہی نہیں چلا۔
 ساری تھی سمجھ گئی اب ثمن کی سمجھ میں سب آ رہا تھا، زیر کا کھڑا کھڑا انداز، زیر کا گھر دیر سے آنا، زیر کا کھانا کھا کر آنا، اہم میٹنگ کا کہہ کر شاپنگ پر نہ جانا۔

اس بری طرح سے اعتبار ٹوٹنے سے ثمن بکھری گئی، اس نے اپنا آپ سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔
 ”زیر تو مجھے اتنا چاہتا تھا پھر کوئی اور کیسے اس کے دل میں آکر بس سکتا ہے؟“ آنسو اتار سے بہہ رہے تھے اور ثمن کا دھیان اس منظر سے ہٹ نہیں رہا تھا۔
 ”خیر ذات پر اتنا اعتبار بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔“ ماشی میں بھی کہا ہوا اریبہ کا جملہ آج ثمن کے کان میں گونج رہا تھا۔
 ”میں یہاں اتنی محنت سے زیر کا گھر بنائے بیٹھی ہوں اور ادھر زیر اپنی کمائی اپنا ٹائم اور اپنے جذبات دوسروں سے شیئر کر رہا ہے؟“ ثمن کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ زیر اسے دھوکا بھی دے سکتا ہے۔
 ”آج ہوئی آپ کی میٹنگ؟“ ثمن نے جیسے ہوئے انداز میں زیر سے پوچھا۔ زیر چونک سا گیا۔
 ”آں ہاں ہوئی، بہت اچھی رہی، تم سناؤ شاپنگ کر لی بچوں کی؟“ زیر نے ثمن کے سوچے ہوئے پھرے کو بغور دیکھ کر پوچھا، اپنی طرف بغور دیکھتے ہوئے زیر کو ثمن نے رخ موڑ لیا، وہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی کہ زیر کو کچھ پتہ چلے۔
 ”جی ہوئی۔“ سرسری سا جواب دے کر ثمن نے سونے کی تیاری شروع کر دی، لیکن دل زیر کی طرف ہے، بہت دکھا ہوا تھا، اب ثمن کو زیر کی بے دلی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی لیکن وہ بات نہیں کر پا رہی تھی اس بارے میں۔
 فون کی بیل پر ثمن نے ہلو کہا۔
 دوسری طرف سے آتی اریبہ کی آواز پر ثمن اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی، ثمن کو ویسے ہی کی بھردہ کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔
 ”خیریت ثمن! تم رو رہی ہو؟“ اریبہ نے پریشانی سے پوچھا۔
 ”ہاں اریبہ! تم بہت یاد آ رہی تھیں۔“ ثمن نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو ثمن! تم اپنی یہ عادت ختم کر لو جو بات دل میں ہوتی ہے، وہ کہہ دیا کرو، میں تمہیں اور تمہاری عادتوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، کوئی نئی دوست تو نہیں تمہاری بچپن کا ساتھ ہے ہمارا۔“ اریبہ نے رمان سے سمجھایا۔
 ”اریبہ! زیر بہت چیخ ہو گئے ہیں، گھر میں بھی بہت کم ٹائم گزارتے ہیں، بچوں پر بھی اب ویسی توجہ نہیں دے رہے۔“ ثمن نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔
 ”زیر کو تو تم نے ہی چیخ کیا ہے اور رہا سوال بچوں پر توجہ کا تو ہو سکتا ہے آج کل ان کے آفس میں کام کا لوڈ ہو جس کی وجہ سے وہ گھر اور بچوں کو ٹائم نہیں دے پا رہے ہوں۔“ اریبہ نے سمجھایا۔
 ”نہیں اریبہ! اب زیر کو میری اور اس گھر کی ضرورت نہیں رہی، شاید اس لئے وہ اپنا ٹائم بہت اچھے طریقوں سے spend کر رہے ہیں۔“ ثمن نے دھکے چھپے لفظوں میں زیر کی سچائی بتائی۔
 ”کیا مطلب، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ اریبہ چونگی۔
 ”اریبہ! زیر کی اور لڑکی میں انٹرسٹ ہیں اور وہ مجھ سے جھوٹ بول کر اس کے ساتھ کافی شاپ میں کافی انجوائے کرتے رہے ہیں، یہ سب میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے علاوہ وہ گھر آ کر بھی موبائل پر لگے رہتے ہیں، گھر آنے کا ٹائم بھی بہت دیر سے کر دیا ہے، بچوں پر وہ توجہ نہیں ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ وہ گھر اور بچوں اور میری بس ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔“ ثمن سے رہا نہیں گیا اور پوری بات اریبہ کے گوش گزار کر دی۔
 ”تم نے بھی سوچا ہے کہ یہ سب کیوں ہوا ثمن! زیر بھائی ایسے نہیں تھے، لیکن تمہارے مزاج نے شاید ان کی سوچ کا رخ موڑ دیا اور یہ جو ”میں“ ہے ناں انسان کو خود پسند اور مفرد کر دیتی ہے، دیکھو

تمہاری ذرا سی بے اعتنائی نے انہیں چیخ کر دیا، تمہیں یاد ہے محسن! رضیہ اپنے گھر سے کیوں بھاگی تھی؟ اس لئے کہ وہ خالی درود یوار کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اور نہ ہی ساری زندگی ان درود یوار کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اس وقت جو صبح لگا اس نے کیا، وہ کیوں پالتی اپنے شوہر کو جو اس کی نقد کر رہا تھا اور نہ ہی محبت، اسے ایک جیتا جاگتا وجود چاہئے تھا جو اسے محبت دیتا، چاہت دیتا اور اس پر توجہ دیتا اور یہی سب کچھ تم نے کیا زہیر بھائی کے ساتھ۔ محسن کو یہ ساری باتیں کسی تھوڑے سے کم نہیں لگ رہی تھیں، لیکن آج اسے اسی کی ساری باتیں ایک سو دس فیصد سچی لگ رہی تھیں، صبح تو کبہ رہی تھی اریہ۔

”میں نے کیا دیا ان چھ سالوں میں زہیر کو، ایک محبت بھرا جملہ تک تو دے نہیں سکی، صرف اس لئے کہ یہ سب میرے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔“ یہ سوچتے ہی عداوت کے کتنے آنسو محسن کے گال پر ڈھلک گئے پتہ ہی نہیں چلا۔

”دیکھو محسن! میں نے پہلے بھی سمجھایا تھا کہ محبت اظہار توجہ اور احساس چاہتی ہے، تم پہلے یہ بات نہیں مانتی تھیں، لیکن اب تو تجربہ کر چکی ہو، ایک ایسا تجربہ جس سے تمہاری زندگی نکلوں کی طرح نکھر سکتی ہے، محبت کچھ دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں، کبھی کبھی ہمیں اپنے مزاج اور موڈ سے ہٹ کر دوسرے کے لیے کچھ کرنا پڑتا ہے، اس لئے نہیں کہ یہ سب زبردستی کا سودا ہے بلکہ اس لئے کہ ہمیں دوسرے کی خوش عزیز ہے۔ آج اریہ کی باتوں سے محسن کو ذرا برابر بھی اختلاف نہیں تھا۔

”لیکن ابھی بھی دیر نہیں ہوئی محسن! تم اپنا گھر بچا سکتی ہو، اس کے لیے تمہیں اپنا آپ بدلنا ہوگا، اپنے لئے نہیں اپنی بچیوں اور اپنے گھر کے لیے، جس طرح سے زہیر بھائی لائف گزارتا تمہارے ساتھ پسند کرتے ہیں اسی طرح سے رہو، جس انداز سے زہیر تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں اسی انداز سے بنو۔ تم زہیر کی

پہلی محبت ہو اور پہلی محبت کم تو کیا ختم بھی نہیں ہوتی، جب وہ اپنی محبت کو اپنے ہی روپ میں دیکھیں گے تو یقیناً وہ پلٹ آئیں گے۔“

”جھیک یوار یہ! آج تم نے دو دینی کا حق ادا کر دیا، مجھے بہت بڑی مشکل سے نکالا ہے، زہیر کی طرف سے جو بدگمانیاں میرے اندر پیدا ہو گئی تھیں آج تمہاری وجہ سے مجھے آئینہ دیکھنے کو ملا، اس میں زہیر کا واقعی کوئی قصور نہیں یہ سب میری لاپرواہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ محسن نے بہت شرمندگی سے کہا۔

”جھیک ہے میں نے تو دو دینی کا حق ادا کر دیا، لیکن یہ حق اب تم پر قرض ہے اور یہ میرا قرض تم جیسی ادا کر سکو گی جب تم میری ان سب باتوں پر عمل کرو گی اور اب مجھے جب فون کرو گی جب تم یہ سب معاملات بہت اچھے طریقے سے نبھاؤ گی۔“ اریہ نے محسن کو کانفیڈنس دیا اس معاملے سے نمٹنے کے لیے۔

”آج محسن کے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی اسے دیر نہیں ہوئی۔

”تم جھیک محسن اریہ، رضیہ بھاگنے میں کیوں دیر کرتی، اس کے پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں تھی، لیکن میرے پاؤں میں دو بیڑیاں ہیں جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں، شاید اپنے آپ سے بھی زیادہ اور یہ میری سب سے بڑی طاقت بھی ہیں، اور سب سے بڑی کمزوری بھی۔ میں ان کی خاطر سب کچھ بدل سکتی ہوں، اپنا مزاج تو کیا اپنی خود پسندی کی عادتیں بھی۔“

محسن آج ایک عزم کے ساتھ اک نیا گھر بنانے کھڑی ہوئی تھی جس کی بنیاد اور اسٹرکچر زہیر کی پسند کے مطابق تھا۔

”زہیر! آج میں نے آپ کے لیے اچار گوشت بنایا ہے۔“ گھر میں آتے ہی محسن نے زہیر کے پسندیدہ کھانے کا نام لیا۔

”کیا... اچار گوشت، یار! فنافٹ کھانا نکالو، کتنا عرصہ ہو گیا کھر کا اچار گوشت کھائے ہوئے، لیکن تم

کیا کھاؤ گی، تمہیں تو سخت ناپسند ہے اچار گوشت؟“ زہیر کے ان الفاظ سے محسن پر کھڑوں پانی پڑ گیا۔ واقعی اسے تو خود بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے کتنے سال پہلے یہ ڈش بنائی تھی۔

”میں آج میں سوچ رہی تھی کہ اس کے ٹیٹ میں ایسا کیا ہے جو آپ کو ناپسند ہے، میں بھی آپ کے ساتھ کھا کر دیکھوں گی۔“ محسن نے کہا تو زہیر حیران رہ گیا اور جلدی سے چیخ کر کے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔

آج زہیر کی پسند کا کھانا کھا کر محسن کو تو ایک راحت ملی ہی تھی جبکہ زہیر کے چہرے پر ایک انوکھی خوشی دیکھنے والی تھی۔

آج محسن کو بہت سکون ملا تھا زہیر کے مطابق رہنے کا پہلا پیڑ جو اشارت ہو گیا تھا۔

”زہیر اس ویک اینڈ پر ہم ڈنر باہر کریں گے۔“ محسن کی اس بات پر زہیر کو دوسرا شک لگا تھا۔

”لیکن تمہاری فضول خرچی والی بات؟“ زہیر نے سر کھاتے ہوئے محسن کو یاد دلایا۔

”ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہی، چلیں رہنے دیں۔“ محسن نے چڑایا۔

”ارے نہیں نہیں، میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ زہیر نے محسن کی ناراضی کے ڈر سے فوراً کہا۔

بہت موڈ میں آج دونوں نے ڈنر کیا، زہیر کو محسن کا پہنچ بہت پسند آ رہا تھا۔

”وہیے پائی داوے آپ میں اتنی بڑی تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ زہیر نے محسن کی طرف بڑے شوق سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”زہیر! اب ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں، اور اب میں چاہتی ہوں کہ انہیں دنیا کا کچھ طریقہ اور سلیقہ آنا چاہئے، باہر کی دنیا کیا ہے کیسی ہے اور کیا کیا ہوتا ہے، اب انہیں اس لائف کی ضرورت ہے اور پھر اس سے بڑھ کر آپ کو یہ سب ایکٹیوٹی پسند ہیں۔“

محسن نے بڑی صفائی سے وضاحت دی جس کا زہیر

قائل ہو گیا۔

واپسی پر زہیر نے محسن اور بچوں کو شاپنگ بھی کرائی۔

”واقعی میں کتنی بے وقوف تھی اتنی اچھی لائف چھوڑ کر اپنے خول میں قید ہو کر ایک ایسی لائف گزار رہی تھی جس میں نہ کوئی چارم تھا، نہ ہی زندگی کا کوئی مزہ۔“

رفتہ رفتہ محسن نے گھر کے بہت سے معاملات زہیر کے مطابق ڈھال لئے اور زہیر کی توجہ بھی گھر کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوئی، لیکن ایک پھانس تھی محسن کے دل میں جو اکثر فارغ ہوتے وقت اسے ٹپس کر دیتی تھی اور یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ اگر میں یہ سب زہیر کی پسند کے مطابق نہ کرتی، تو زہیر اپنی زندگی میں میری جگہ کی اور کو دے دیتا۔

اپنی بے وقوفی پر محسن کے آنسو خود بخود اُمڈ آتے تھے اور اس کا ذکر وہ باہر اریہ سے کرتی رہتی تھی اور اریہ اس کی ڈھارس بندھاتی رہتی تھی۔

”یار محسن! مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔“ زہیر نے محسن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھایا، ایک لمحے کو محسن کا دل کسی انجانے خدشے کے تحت بہت تیزی سے دھڑکا، وہ زہیر کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”یار! مجھے پتہ ہے کہ تم بھیڑ اور لوگوں کے جھمیلوں سے بہت گھبراتی ہو اور کوفت محسوس کرتی ہو،

لیکن میں کئی دنوں سے اک بات تم سے کہنا چاہ رہا تھا پر کہہ نہیں پا رہا تھا۔“ زہیر نے تمہید باندھی۔ لیکن محسن اس کی تمہید پر ابھن کا شکار نظر آنے لگی۔

”کیا بات ہے زہیر! پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہیں؟“ محسن نے ایک ابھن سے کہا۔

”محسن! میں تمہیں بتانا تھا ناں کہ میرا ایک بیسٹ فرینڈ ہے وارث وہ ملک سے باہر تھا اور اب آج کل ان کی پوری فیملی پاکستان آئی ہوئی ہے، اس نے میرا بہت ساتھ دیا ہے ہر معاملے میں، اب میں چاہتا

ہوں کہ ہم ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔ اگر تم کو توکل میں انہیں کھانے پر انوائٹ کر لوں؟“ زہیر نے سوالیہ نظروں سے ثمن کو دیکھا۔

”آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے فوراً بلالیں، ویسے بہت عرصہ ہوا ہمارے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا۔“ ثمن نے خوشدلی سے کہا جس سے زہیر بھی خوش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

گھر کی صفائی اور ڈیکوریشن سے فارغ ہو کر ثمن کچن میں مصروف ہو گئی، تمام زہیر کی پسند کی چیزیں بنا کر ثمن نے گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی، شام کے ساڑھے چھ ہو رہے تھے اور زہیر نے 7 بجے کا ٹائم دیا تھا سب کے آنے کا۔

فوراً ثمن اپنا حلیہ درست کرنے کے خیال سے ہاتھ روم کی طرف بھاگی، سب کام سے اور اپنی اور بچوں کی تیاری سے فارغ ہو کر ثمن، زہیر کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً 8 بجے سب مہمان اثر ہوئے، ساتھ میں زہیر بھی تھا۔

آخر میں آئی لڑکی کو دیکھ کر ثمن کو شاک لگا، اسے زہیر سے یہ توقع نہیں تھی کہ اس لڑکی کے بہانے وہ اس کے پورے گھر کی دعوت کر دے گا۔

سب بہت خوش اخلاقی سے ملے اور مجبوراً ثمن کو ناچاچے ہوئے بھی مسکرا کر ملنا پڑا۔

لیکن ثمن کا دل بہت خراب ہو گیا تھا، کیونکہ زہیر کا انداز سب سے بہت فریٹنگی تھا اور خاص طور پر اس لڑکی کے ساتھ۔

جیسے تیسے ثمن نے یہ دعوت منائی اور سب کے جانے کے بعد روم میں تھک کر لیٹ گئی، دو آنسو ثمن کے گال پر ڈھلک گئے جو کہ زہیر نے دیکھ لئے۔

”کیا بات ہے ثمن! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ دو گھنٹے سے دیکھ رہا ہوں تم کچھ جھجھائی اور پریشان ہو؟“ زہیر نے تشویش سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

بس پھر کیا تھا ثمن کو ایک ہمدرد اور کاندھے کی ضرورت تھی سو زہیر سے لگ کر ثمن رو پڑی۔

”زہیر! میں بہت تھک گئی ہوں اور دل بھی بہت گھبرا رہا ہے۔“

”اوہو یارا آج تم بہت بڑی رہیں ناں، میری وجہ سے سوری یار۔“ زہیر کو ثمن کے اس انداز پر بہت پیار آیا، کیونکہ ثمن نے بھی زہیر پر اپنی تھکن ظاہر نہیں کی تھی۔

”چلو باہر لان میں چل کر باتیں کرتے ہیں، بہت دن ہو گئے ہیں ایک دوسرے کی باتیں سنے ہوئے۔“ زہیر زبردستی ثمن کو باہر لان میں لے آیا، ثمن کے دل میں بھی بہت غبار تھا اس لئے وہ بھی چپ چاپ ساتھ چلی آئی۔

”یارا یہ جو حادثہ ہے آج کل بہت پریشان ہے، عینا کی وجہ سے بلکہ پوری فیملی، میں نے ان لوگوں کا دل بھلانے کے لیے ہی یہ دعوت رکھی تھی، آج کل بہت کراکس میں ہیں یہ لوگ عینا کی وجہ سے“ زہیر نے اچانک حادثہ کی بات نکالی۔

ثمن نے زہیر کو گھر میں دیکھا تو اپنی پریشانی بھول گئی۔

”خیریت؟ عینا وہی ناں جو آپ سے بہت فریٹنگی بات کر رہی تھی۔“ ثمن نے تصدیق چاہی۔

زہیر نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”کیا ہوا اسے جو سب اس کی وجہ سے پریشان ہیں، دیکھنے میں تو بہت خوش باش تھی۔“ ثمن نے کریدا۔

”یارا وہ اپنے اور ظاہری خول چڑھائے ہوئے ہے، اصل میں عینا کی فریٹنگی اس کے ایک فریڈ کے ساتھ ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے، ابھی لاسٹ ایئر اس لڑکے کی ایک سیڈنٹ میں ڈیجھ ہوئی اور عینا ڈیٹنی طور پر بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی، بہت علاج کروایا بہت ذہن بنایا لیکن وہ آج تک علی

کی ڈیجھ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، ان سب کے پاکستان آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ یہاں آکر شاید کچھ بھول جائے۔ حارث کی وجہ سے وہ مجھ سے بہت کدوڑ رہی ہے بچپن سے اور میں نے بھی بہت کوشش کی کہ اسے حقیقی زندگی کی طرف لے کر آؤں لیکن سب ناکام رہے، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کا ذہن کسی ایک چیز کی طرف لگا دیں، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کدھر اس کا مائنڈ کریں۔“ زہیر نے تشویش سے ساری بات بتائی۔

اور ادھر ثمن کے دل پر بڑا مہینوں کا غبار زہیر کی اس بات سے دل میں ختم ہو گیا اور وہ اپنی عقل پر ماتم کرنے لگی۔

”جیسا ہم دیکھتے ہیں اور جیسا ہم سوچتے ہیں، بعض دفعہ دیا نہیں ہوتا۔“ دور کہیں سے اریبہ کی آواز ثمن کے کانوں میں گونجی۔

اور ثمن اپنی سوچ پر شرمندہ ہو کر مٹی کی گھڑی کے میں نے اپنے شوہر کی محبت پر شک کیا اور اپنی زندگی کو اپنی سچی سوچ سے کوئین سے بھی زیادہ کڑوا کر لیا۔

”کیا ہوا کس سوچ میں کم ہو یارا! ایک تو تم بھی ناں ہر کسی کی ٹینشن کو اپنی ذات کا حصہ سمجھتے تھے، اس لئے تمہیں میں ان سب مسائل سے دور کرنا چاہ رہا تھا لیکن ابھی بیٹھا تو سوچا تم سے ڈسکس کر لوں شاید تم کوئی اچھا مشورہ دے دو۔“

زہیر نے ثمن کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا۔

زہیر کی سوچ دیکھتے ہوئے ثمن پر گھڑوں بانی ہو گیا۔

”پریشانی کی تو بات ہے اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ اتنی بڑی ٹریڈنگ ہو گئی، تو ہر بندہ سوچنے پر مجبور ہوگا، میں نے بھی اس کے لیے کچھ سوچا ہے۔ کیوں ناں اسے ایجوکیشن میں بڑی کر دیا جائے وہاں اس کے فریڈز نہیں گے، کو لیک اور یونیورسٹی کے ماحول میں وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف آجائے گی۔“ ثمن نے نیک نیتی اور خلوص دل سے اچھا مشورہ دیا، جسے

سننے ہی زہیر کے چہرے پر ایک خوشی چھلکنے لگی۔

”نہینا کو بڑا حالی کا بہت خط تھا اور یہ ایک بہترین آئیڈیا ہے اس کا مائنڈ ایک طرف کرنے کا، یہ تو کسی نے سوچا ہی نہیں، سب اس کی شادی کا سوچتے رہے کہ کسی طرح اس کی شادی ہو جائے، ایک دو سال ایجوکیشن سے وابستہ رہے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ابھی حارث کو یہ مشورہ دیتا ہوں فون کر کے۔“ تھینک یو ثمن تمہاری وجہ سے کوئی فیملی اتنی بڑی ٹینشن سے بچ جائے گی۔“ یہ کہہ کر زہیر نے ثمن کے ماتھے پر اپنے پیار کی مہر ثبت کر دی اور اندر حارث کو کال ملانے چلا گیا۔

”تھینک یو تو مجھے آپ کا کرنا چاہئے زہیر! میری محبت کا بھرم رکھنے کا، آج آپ نے مجھے بہت بڑی ٹینشن سے نکالا ہے، میں بے وقوف تھی ساری زندگی نہ آپ سے کچھ کہتی نہ پوچھتی، بدگمانی دل میں لئے اپنی زندگی خراب کر لیتی، اتنا پیار کرنے والا شوہر اور ہنسا ہنسا گھر میری اس بدگمانی کی بجائے چڑھ جاتا تھا۔“ کچھ باتیں چھانے میں بھلائی ہے“ اور ”بعض دفعہ سامنے والے کو آپ کی ٹینگی کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہہ دینے سے دل کا بوجھ اور بدگمانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔“ آج اریبہ کے جملے ثمن کے تجربوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر لگ رہے تھے، ثمن کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

”کتنا اختلاف تھا میری اور اریبہ کی سوچ میں اور آج میں ثمن زہیر اقرار کرتی ہوں کہ اریبہ تم سوچ اور سمجھداری میں مجھ سے بڑھ کر ہو، تم صحیح کہتی تھیں کہ محبت اظہار اور احساس ناگہنی ہے جو کہ میں آج تک زہیر کو نہ دے سکی، لیکن تم نے بروقت اپنی دوستی کا حق ادا کیا اور مجھے غلط سمت جانے سے روک دیا۔“ تشکر کے آنسو ثمن کی آنکھوں میں جھلکانے لگے اور وہ بھی اریبہ کو ٹھیکس کی کال کرنے اندر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

ایقان علی

مکمل ناول

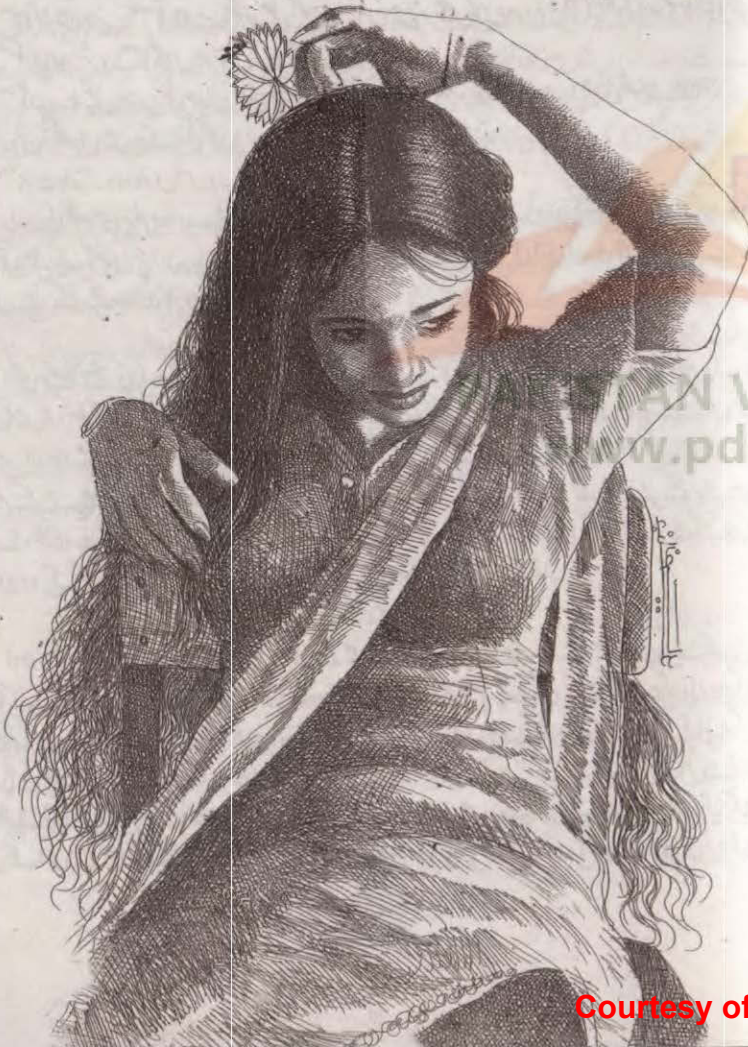


رات کی مخصوص ہوا بادلوں کو ادھر سے ادھر اڑاتی پھر رہی تھی، تاریک سیاہ، انتہائی سیاہ آسمان پر کوہ نور جیسے تارے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، ہر تارہ اپنی چمک دمک میں چاند کو مات دیتا تھا، ساحل سمندر کی طرف



سے آنے والی اس فمدار ہوا میں ریت کی باس بھی شامل تھی۔ یہی تھکی ماندی ہوا چب روشنیوں سے جھلگاتے ریٹورنٹ کے پاس سے گزری تو اس میں کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو بھی شامل ہو چکی تھی، سیاہ رات کی تاریکیوں کو مات دیتے اس جگہ کرتے ریٹورنٹ میں معمول کی گہما گہمی تھی، لوگ آ جا رہے تھے، دعو تیں اڑانی جارہی تھیں، مستعد سے دیگر قسم ہاقم کے کھانے لئے آ جا رہے تھے، اس اوپن ریٹورنٹ کے ایک کونے میں لگی میز کے گرد کرسیوں پر وہ دو لوگ موجود تھے۔ ایک چوبیس سالہ خوش شکل سا لڑکا تھا جس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی، وہ بلوٹائنٹ پر سفید اوپن شرٹ پہنے ہوئے تھا، وہ مسلسل باتوں میں مصروف تھا، اس کا مخاطب اس کا دوست تھا جو کہ عمر میں اس سے تین چار سال بڑا تھا، گندی سی رنگت اور جاذب سے نقوش کے ساتھ ذہین آنکھوں کے مالک اس لڑکے نے گلاس لیوں سے لگا رکھا تھا۔

”تو تو واقعی جا رہا ہے؟ پاگلوں کو ٹھیک کرنے، میرا مطلب ہے خدمت کرنے؟“ اس نے آخری فقرے پر زور دے کر کہا۔ وہ مسکرا دیا۔



”ہاں“ کانٹے میں فٹس فرائیڈ کے آخری کلوے کو لیتے ہوئے اس نے کہا۔
 ”یار وہ پاگل ہوتے ہیں لیکن ہوتے تو انسان ہیں ناں، تیرے اور میرے جیسے انسان، دو آنکھیں، دو کان،
 ایک دل اور ایک دماغ، کسی انتہائی مرحلے سے گزرے بے چارے انسان، ان کا پاگل پن انتہائی شک تو ہوتا
 ہے۔“ وہ رساں سے کہتا چلا گیا۔
 ”ایڈ آئی لومانی پرویشن، پاگل خانوں میں موجود ہر انسان ایک نئی کہانی ہوتا ہے، ہر کہانی کو ورق در ورق
 کھولنا، پڑھنا، سمجھنا، پرکھنا، ابھننا، پچھنا اور پھر اس ابھن کو سمجھا دینا، یہی میرا کام ہے۔“
 ”جی جی، ابھی تو آپ کی لاہور ٹرانسفر ہوئی تو آپ نے ایک لمحہ بھی سوچے بغیر ہاں کر دی ڈاکٹر شاہ زیب
 صاحب!“ وہ مسکرایا۔
 ”بالکل۔“ اس نے دوسری ڈش میں سے ایک لقمہ لیا۔
 ”اس میں مرچیں بہت ہیں۔“
 ”ڈاکٹر شاہ زیب مصطفیٰ اسے چکن چلی کہتے ہیں اس میں مرچیں نہیں ہوں گی تو کیا گلوکز ہوگا؟“ ڈاکٹر شاہ
 زیب مسکرایا اور مشروب کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔
 ”آپ سنا ہیں جناب علی حیان اوی گریٹ رائٹر، کب سر پرانزدے رہے ہیں اپنی نئی تصنیف کا؟“
 روشن آنکھوں میں چمک آئی تھی۔
 ”بہت جلد۔“ وہ دونوں ہنس دیتے تھے۔
 رات کی مخصوص پرغم ہوا ہولے ہولے چلتی، خوشبوئیں اسے اندر اسیر کرتی دور آسمانوں کا رخ کر رہی تھی،
 جیسا کہ تاریک آسمان پر اب چاندنی جیسی روشنی پھیلاتا چاند نکل آیا تھا، اپنی اپنی ذات میں مکن تارے نجانے
 کہاں چلے گئے تھے، رات کا دوسرا پہر دم توڑنے کو تھا۔

☆.....☆.....☆

ابھی پچھلے ہفتے کی بات تھی جب اسے ٹرانسفر لیا گیا تھا، اسے لاہور کے ایک بڑے میڈیوم (المعرفہ پاگل
 خانہ) میں ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ اس ٹرانسفر سے کوئی مسئلہ نہیں تھا، اسے کام سے غرض تھی، وہ جا رہے یہاں کراچی
 میں ہو یا لاہور میں۔ چوبیس سالہ ڈاکٹر شاہ زیب مصطفیٰ گوا بھی صرف تین سالہ تجربہ رکھتا تھا لیکن اس کی ذہانت
 اور علم کے چرچے بہت تھے، ملک کے چند مشہور ماہر نفسیات میں اب اسے گنا جاتا تھا۔ نجانے کتنے حالات کے
 ستائے، مشکلات کے گھبرائے مریض اس کے ہاتھوں شفا یاب ہو کر نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔
 سامان وہ پیک کر چکا تھا، کل چار بجے کی فلائٹ سے اسے لاہور جانا تھا، وہ تیار تھا۔

☆.....☆.....☆

لاہور میں ابتدائی کچھ دن تو اسے سیٹ ہونے میں لگے تھے۔ ایک اچھے علاقے میں اسے ایک فلیٹ مل گیا
 تھا، ایک دن لگا کر اس نے سارا فلیٹ دھویا تھا، سارے فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کی تھی۔ ایک کمرے کو بیڈروم کی شکل
 دے کر اس نے باقی سارا اضافی سامان دوسرے کمرے میں بھر دیا تھا۔ لاؤنج میں ٹی وی اور صوفے سیٹ کر کے
 لاؤنج کی صورت دی تھی، لیکن میں سارا سامان رکھ لیا تھا۔ دو کمروں کا فلیٹ ”گھر“ میں بدل گیا تو اس نے جاب
 کی طرف توجہ دی، لاہور کے اُس معروف ہسپتال کے شعبہ نفسیات میں وہ میڈیکل حیثیت سے تعینات کیا گیا تھا۔
 ابھی تک اس نے جواننگ نہیں دی تھی، اسے ایک ہفتے کا وقت دیا گیا تھا، اس کے پاس ایک ہفتے کی فراغت تھی

رداؤ انجسٹ [158] مارچ 2016ء

☆.....☆.....☆

آج وہ پہلے دن ہسپتال آیا تھا۔
 اس کے اعزاز میں تقریب منعقد کی گئی تھی۔
 ”آپ کی لاہور آمد ہمارے لئے باعث مسرت ہے، امید کرتے ہیں آپ کا ساتھ ہمارے لئے باعث فخر ہو
 گا۔“ ڈاکٹر دانیال نے جو کہ اس کے اسٹنٹ تھے اعزازیے میں کہا تھا۔
 یہ اس کی لاہور کے اس معروف ہسپتال میں ابتداء تھی۔
 اور یہی ابتداء ہے ہماری اس داستان کی بھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اسٹاف کے کچھ لوگوں کے ساتھ وزٹ پر نکلا تھا، وہ ایک لمبا کوریڈور تھا جس کے دونوں اطراف میں
 کمرے تھے، اندر کمروں میں موجود نفوس کی حرکات و سکنات سے باخبر رہنے کے لیے ہر کمرے میں ایک بڑی
 جالی دار کھڑکی تھی جس سے وہ اندر دیکھ سکتے تھے۔ وہ ہر کھڑکی کے پاس رکتا اور اس کے ساتھ موجود ڈاکٹر دانیال
 اسے مریض (پاگل) کی تھوڑی سی بائیوگرافی بتاتے تھے، اس وسیع کوریڈور کے آخری کونے میں بے کمرہ
 نمبر 21 کے سامنے وہ رکا تھا۔

”یہ میمونہ بلال ہیں، یعنی حالت بہت خراب ہے، لاہور کے پاس ہی دیہات سے ہیں۔“ ڈاکٹر دانیال نے
 بتایا۔ اس نے اندر نظر ڈالی، اندر ملگجاسا اندھیرا تھا، سامنے دیوار سے فیک لگائے وہ لڑکی بیٹھی تھی، اس کے اچھے
 بال اس کے شانوں پر پھڑپھڑتے تھے، اس نے فیک لگا کر سر دیوار سے لگا رکھا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، پیریاں
 جتے ہوئے تھے، وہ آہستہ پر بھی نہیں چوکی تھی، ویسے ہی بیٹھی رہی تھی آنکھیں موندے، حال سے بے حال، ہونٹ و
 جواں سے بیگانہ، نیم وادراک سے پرے، دنیا سے بہت دور، کسی اور ہی دنیا میں۔ اس کی بند آنکھوں میں بھی
 وحشت تھی، حلقہ زدہ ان بند آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے رحم بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی، اداسیوں کے سامنے پڑ پھیلائے لگے تھے، ایک بے بس
 سی نظر اسے بے بس لڑکی پر ڈال کر وہ کھڑکی کے پاس سے جٹ گیا تھا، شاعر کی غزل سی وہ لڑکی فقیروں کے سے
 مالوں میں تھی۔

☆.....☆.....☆

”میمونہ بلال

عمر: اٹھائیس سال

وارث: بلال فاروق“

وہ اس کی رپورٹ دیکھ رہا تھا وہ پچھلے تین سالوں سے اس حال میں تھی، پچھلے سال اسے یہاں داخل
 کر دیا گیا تھا۔

”میموری لاسٹ (Memory Losst) کا کیس نہیں ہے ڈاکٹر۔“ فریڈنگلی وہ ٹھیک ہے، مصطفیٰ کچھ بھی
 لکھ نہیں ہے۔“ ڈاکٹر دانیال کی بات پر اس نے ہنکارا بھرا اور پیچھے کو ہوا۔

رداؤ انجسٹ [159] مارچ 2016ء

”وہ کسی سے پیار کرتی ہے شاید اسی لئے...“ ڈاکٹر وانیال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
 ”چوکیدار ہمارا تھا راتوں کو کسی کا نام لے کر روتی ہے، اس کے گھر والوں نے کچھ نہیں بتایا، غریب لیکن شریف اور عزت دار لوگ ہیں، اپنے منہ سے کیا بتاتے اور کیسے بتا دیتے ڈاکٹر۔ ہوگا کوئی پیار و محبت کا چکر یقیناً۔“

وہ سوچوں میں گم تھا۔
 ”ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ میرے کچھ سیشن رکھیں ان کے ساتھ، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“ اس نے فائلیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

شام کی تاریکی زردیاں سیاہی مائل تاریکیوں میں ڈھل رہی تھیں۔ وہ ہاتھ میں کافی کاگ لے بالکونی میں کھڑا تھا، نیچے سڑک پر روشنیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا، اس کا ذہن انہی انسانوں کے درمیان اٹکا تھا جن کا آج وہ وژٹ کر کے آیا تھا۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب اور نرالے ڈھنگ کے ہوتے ہیں اور انسان مہرے ہوتے ہیں ان کھیلوں میں جنہیں قسمت اور وقت اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔
 یونہی سوچتے سوچتے وہ دور، بہت دور نکل آیا تھا، اس کے ہاتھ میں جکڑا کافی کاگ بخ بستہ ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ آج بھی ویسے ہی بیٹھی تھی۔

دیوار سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے۔

چوکیدار نے بتایا وہ کل سے ایسے ہی بیٹھی ہے۔

”ایسے ہی کرتی ہے یہ، روتی ہے تو بس روتی رہتی ہے، چپ ہوگی تو مہینوں چپ رہے گی۔“

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا اور اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا، اسے غور سے دیکھا، وہ نزدیک سے بھی ویسی ہی تھی، مجبوظ الحواس، بد حال سی... وہ کھکارا، ہولے سے سلام کیا، وہ چوکی نہ آنکھیں کھولیں۔ وہ اسے اپنے بارے میں بتانے لگا، چھوٹی چھوٹی باتیں، اپنا نام، اپنی جاب کی باتیں۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ آپ سے تم تک کا سفر اجنبیت کی ایک دیوار گرا دیتا ہے لیکن اس نے کوئی دیوار نہیں گرائی تھی، ویسے ہی بے حس ہی خاموش بیٹھی رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اس سے ڈیڑھ گھنٹے باتیں کی تھیں اور درمیان میں 6 سے 7 سوال کئے لیکن وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر آنکھیں موندے بیٹھی رہی تھی۔

وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد باہر نکل آیا تھا، یہ پہلا سیشن تھا۔

☆.....☆.....☆

اور اگلے چھ دن تک وہ اس کے کمرے میں سیشن کے لیے جاتا رہا تھا، روز اس سے نئی باتیں کرتا، اسے چھوٹی چھوٹی باتیں بتاتا اور اسے بھی بات کرنے پر اکساتا، لیکن وہ بتا جواب دیے، بتائے تاثرات بدلے بیٹھی رہتی۔ وہ پتھر سی یا شاید پتھر سے بھی آگے کی کوئی چیز... لیکن وہ تھا نہیں تھا، یہ سارا کھیل ہی اعصاب کا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے آفس میں بیٹھا کچھ فائلز اسٹڈی کر رہا تھا جب اچانک ہونے والی چیخ و پکار کی آوازوں نے اس کی

توجہ اپنی طرف مبذول کروا لی تھی، وہ تیزی سے باہر آیا، کوریڈور کے آخری کونے میں بنے کمرہ نمبر ایکس کے سامنے جمع تھا، ڈاکٹر، نرسیں اور چوکیدار... وہ بھاگتا ہوا ادھر آیا۔

میونہ بلال بے قابو ہو رہی تھی، وہ مسلسل چلا رہی تھی اور اپنا سر آگنی جھنگے پر مار مار کر زخمی کر چکی تھی، اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کی جنونی حالت سے ڈر کر کوئی بھی اس کے نزدیک نہیں جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف آیا اور اندر داخل ہوا جب نرس چلائی تھی۔

”ڈاکٹر! شی از ڈیجرس۔“

وہ نے بغیر اندر آیا۔ وہ کھڑکی کی سلاخوں سے سر کر رہی تھی۔

”میونہ... میونہ پلیز ادھر سے ہٹو، ادھر آؤ۔“ وہ ہولے ہولے پکارتے ہوئے کھڑا تھا، وہ تو پاگل تھی، پاگل کہاں سنتے ہیں؟ پاگل سننے سمجھنے لگیں تو پاگل کیوں کہلوا گئیں؟ اسے کھڑکی سے ہٹا کر بیڈ تک لے جانے کی دھمک پیل میں ڈاکٹر شاہ زیب کے ہاتھ بری طرح زخمی ہو چکے تھے، کچھ شائیں گردن اور چہرے پر بھی تھیں لیکن وہ پروا کئے بغیر اسے بیڈ تک لایا اور نرس سے لے کر اسے انجکشن دیا تھا، چند گھنٹوں میں وہ پرسکون ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے باس کھڑکی نرس سے پٹی کا سامان لیا اور اس کے زخموں کی بینڈج کرنے لگا۔ اگرچہ وہ خود بلالہاں تھا لیکن اسے معلوم تھا، اس لمحے وہ مسیحا تھا اور مسیحا کا تو کام ہی زخموں پر مرہم رکھنا ہوتا ہے چاہے وہ خود بلالہاں کیوں نہ ہو۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں ہلکی سی تاریکی تھی، وہ دیوار سے ٹیک لگے گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی تھی، اس سے چند قدم کے فاصلے پر زمین پر دوڑا نو ڈاکٹر شاہ زیب بیٹھا تھا۔
 ”مجھیں پتہ ہے میں نے یہ پروفیشن کیوں چھوڑ کیا؟“ خاموشی میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

”اپنی ماں کی وجہ سے، صرف اور صرف اپنی ماں کے لیے۔ دنیا کے لیے وہ بھی پاگل تھی، میری ماں نے گھر والوں کی مخالفت سے میرے باپ سے شادی کی تھی، محبت کی شادی۔ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد انہوں نے میری ماں کو چھوڑ دیا اور دوسری شادی کر لی۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور پاگل ہو گئی۔ میں تب 6 ماہ کا تھا۔ اپنی اسی پاگل اور لاعلاج ماں کو دیکھ دیکھ بڑا ہوا، کبھی اسے پاگل پن کا دورہ پڑتا تو مجھے نوج کھسوٹ دیتی اور کبھی اتنا چومتی کہ میں رو نہ لگتا۔ کبھی گود میں تھکیاں دے کر سلا دیتی اور کبھی گود سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیتی۔ ایسی ہی بے توازن محبت نے مجھے عہد کرنے پر مجبور کر دیا کہ میں ڈاکٹر بنوں، ماہر نفسیات۔“ اس کی آواز میں صدیوں کی تھکان بھی اور آنسوؤں کی آمیزش بھی۔ وہ ویسے ہی شائے جھکائے سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔

”ڈاکٹر بن گیا... پر ماں مر گئی۔“

خاموشی میں اداسیاں گھٹنے لگی تھیں۔

”بس تب سے میں نے عہد کر لیا کہ کسی کے اپنے کو دیے نہیں مرنے دوں گا، کم از کم اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں، وہ بچے جیسے میری ماں مر گئی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو اس نیم تاریک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ بہت سارے لمحے ایسے ہی سرکتے گئے، ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے دیکھا، اپنے زخم ادھیڑے وہ اسی آس پر بیٹھا تھا کہ شاید وہ کوئی لفظ کہہ دے، کوئی ایک لفظ، مرہم جیسی ٹھنڈک دینے والا لفظ، بردہ مسیحا نہیں تھی۔
 ”کچھ تو کہو... کوئی بھی، ایک لفظ، اچھا، برا... گلہ... شکوہ... کچھ تو۔“

خاموشی جیت گئی تھی آج بھی، ہمیشہ کی طرح، وہ ڈیڑھ گھنٹے وہاں گزار کر باہر نکل آیا۔ کمرے سے گزر جانے سے پہلے وہ ذرا دیر کو رکھا اور کھڑکی سے اندر دیکھا، ایک آخری نظر... پھر کی مورتی میں جنبش اتر آئی تھی، وہ چہرہ جو پہلے گھٹنوں کی قید میں اسیر تھا اب دیوار سے لگا تھا، وہ بے جان سی حلقہ زدہ زرد آنکھیں زندگی پا گئی تھیں اور اسے دیکھ رہی تھیں، سپاٹ سے چہرے پر پھیلے تاثرات وہ سمجھ نہ سکا، وہ تو بس ان آنکھوں کی کھوج میں دور بہت دور ڈوبتا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نرس نے آج اسے نہلایا تھا، بال اچھی طرح بندھے ہوئے تھے، کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے، اچھے تراشیدہ ناخن اور سلستے سے لیا ہوا دوشہ، وہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور دور کہیں غم مٹی، اس کی کمری پر وہ بیٹھا تھا۔ ”کیا دیکھتی رہتی ہو خلاؤں میں؟“ اسے دور کی غیر مرئی نکتے کو نکلتا دیکھ کر اس نے سوال کیا تھا۔ بہت دیر بعد اسے لگا شاید وہ کچھ بڑبڑاتی تھی، وہ نزدیک ہوا۔ ”کیا؟“ وہ ویسے ہی بیٹھی رہی، صرف لب ہلے۔

”دور؟“ وہ ساکت رہ گیا۔

”کیوں دور؟ کیوں دیکھتی ہو؟“ وہ خاموش رہی۔ وہ بھی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”آگ... شعلے...“ کپکپاتے لبوں سے چند لفظ ادا ہوئے تھے۔

”مجھے آگ نظر آ رہی ہے... وہ... دور... اور یہ... میرے ہاتھوں پر... دیکھو... مجھے جلا رہی ہے... دیکھو...“ اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر شاہ زیب کے سامنے کیا تھا۔ تھر تھر کا نپٹا اور لرزتا وجود... بے شمار چھوٹے بڑے زخموں سے بھرا ہوا تھا۔

”یہ جل رہا ہے ناں، بہت دور ہے، میں اس آگ کو بچا نہیں پارہی، یہ میرے اندر دور کہیں اندر تک جلا رہی ہے، یہ دیکھو...“

اس اڑھائی گھنٹوں کے طویل سیشن میں وہ خاموشی سے اس کی سنتا رہا تھا، اپنی کہے بغیر، وہ ڈرتی لرزتی اسے آن دیکھی آگ دکھائی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا، کانوں میں وینڈفری لگائے وہ اپنے دوست سے باتوں میں مصروف تھا۔ ”ہاں سب ٹھیک ہے۔ ہاں ہاں، تو چکر لگا کبھی ادھر“ تقریباً بیس منٹ کی بات کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔

خاموشی چھائی تو اس کے ذہن میں میمونہ بلال اتر آئی۔ اس کا دل بہت چاہا تھا کہ علی حسان سے اس کی باتیں شیئر کرے لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے کوئی بات شیئر نہیں کی تھی، وہ اس کی پوشیدگی اور اس سے متعلقہ ہر بات، ہر راز ایک امانت تھا اور ڈاکٹر شاہ زیب مروتو سکتا تھا لیکن خیانت نہیں کر سکتا تھا۔

لائٹ بند کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا، ذہن کے پردوں پر دوزخ کی آگ میں جھلتی اور چلائی وہ افسردہ صورت اتر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ہائے میمونہ! کیا حال ہیں؟“ وہ اندر داخل ہو کر بشارت سے بولا اور کمری پر بیٹھ گیا، بستر کی چادر درست

رداؤ انجسٹ 162 مارچ 2016ء

کرتی میمونہ بلال چوکی اور پھر خاموشی سے بیڈ پر جا بیٹھی۔ ”ہے ہے سوچ رہا تھا کہ تمہیں کوئی تک نیم دیا جائے، کیا خیال ہے؟“ وہ بس اسے دیکھتی رہی۔

”مونا کیسار ہے گا؟“

میمونہ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے نمودار ہونے لگے، اس کے دیکھتے دیکھتے وہ آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ وہ گھبرا یا۔

ہیرے جیسے شفاف موتی اس کے پچکے رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے۔

”میرے بابو...“ وہ کچھ توقف کے بعد بولی تھی۔

”وہ نیچے مونا کہتے تھے“ کمرے میں سنانے کے قافلے اترنے لگے تھے، نیم تاریکی کے لباس میں لمبوس خاموشی ہو لے ہو لے پر پھیلا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

تسمیر کے آخری دن تھی، جس زدہ دن آخری سانس لے رہے تھے، وہ احان کی فصل تیار کھڑی تھی، جھکی مامی کی ہوا، وہ احان کی خوشبو سے بو جھل تھی۔ اونچے اونچے درختوں میں شور مچاتی، درختوں کو پتوں سے محروم کرتی، وہ احان کی خوشبو سے لبریز ہو اس مکان کے صحن میں داخل ہو گئی تھی، وہ بڑا سا کچا محسن تھا جس کے چاروں طرف مٹی اینٹوں کی دیواریں تھیں، دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ چند کیاریاں تھیں جن میں موسمی سبزیاں، ٹماٹر، پیاز، لہسن وغیرہ لگائے گئے تھے۔ ایک کونے میں آم کا بیڑ تھا جس کے سائے میں لمبوں کے چند بوٹے کھڑے تھے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کیاری میں پھولوں کے بوٹے تھے، اسی دیوار میں لکڑی کا داغلی دروازہ تھا، دروازے کے بالکل بائیں جانب دیوار کے ساتھ ایک سائیکل کھڑی تھی، صحن سے آگے کھلا برآمدہ تھا جس میں سامنے تین کمرے تھے، برآمدے کی دائیں طرف کیاری کے پاس میز چیاں تھیں اور بائیں طرف غسل خانہ تھا۔ کھلے صحن میں بائیں دیوار کے ساتھ سرکنڈوں کی چھت والا اوپن باور ہی خانہ تھی جس کی دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو گئی تھیں، یہ سلطنت تھی اس شہنشاہ کی جو برآمدے کی چارپائی پر موجود تھی اتار رہا تھا، بھی اس نے اپنی بیٹی کو نکارا۔

”مونا بیٹی! پانی لے آؤ۔“

چند منٹ بعد میز چیموں کے ساتھ والے کمرے سے ایک لڑکی نکلی، وہ سانولی سی بیس سال لڑکی تھی، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، بال بندھے ہوئے اور شانوں پر دوپٹہ، اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس تھا۔

”یہ لیں ابو پانی۔ آتی تو نماز پڑھ رہی ہیں۔“

دوسرے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا، اندر لمبی سی روشنی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ دو چار پائیاں، چتر کرسیاں، دائیں طرف والی دیوار میں ایک شیلٹ تھی جس پر چند چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ بائیں دیوار کے ساتھ ہائے نماز بیچھی ہوئی تھی جس پر ایک لڑکی بیٹھی تھی شہد کے انداز میں اس بائیں خانے والی لڑکی سے یکسر غفلت۔ روشن آنکھیں، حلقوں سے پاک، کھلی ہوئی رنگت، سفید دوپٹہ جو اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا، وہ سلام پھیرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہی تھی بخرو ملی انگلیاں، متناسب ناخن۔

باہر صحن میں باور ہی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور تازہ مٹی روٹیوں کی خوشبو ہر شے پر حاوی ہو رہی تھی۔

رداؤ انجسٹ 163 مارچ 2016ء

برآمدے میں دسترخوان بچھا ہوا تھا، سامنے کی طرف ابو بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو کے بائیں طرف امی تھیں اور دائیں طرف وہ سانولی سی رنگت والی لڑکی تھی اور عین سامنے مونا بیٹھی تھی۔ اپنی بہن کے برعکس اس نے کس کر دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔

”ابو! مجھے کچھ کتابیں لینی ہیں۔“ ابو نے لقمہ لیا۔

”ٹھیک ہے لے لیتا۔ کل کالج جاتے ہوئے ماں سے پیسے لے جانا۔“

”اور مجھے جوڑا بھی لینا ہے۔“ امی نے اسے گھورا۔

”چپ کر جا، ابھی پچھلے مینے سوٹ لیا ہے تو نے۔ بس کر جا۔“ وہ منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔

”ناں نائن۔“ ابو نے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

”میری تانی تو میرے گھر کی رونق ہے، اسے نہ جھڑکیاں دے، میں اور پیسے دے دوں گا، تو بھلے دو جوڑے لے آئیں۔“ سانولی سی تانی مسکرا دی۔

”تھیک یو! یو!“

وہ عشا کی نماز کے بعد دغلیے سے فارغ ہو کر اٹھی تو تانی اپنی چار پائی پر کتابیں پھیلانے بیٹھی تھی، وہ بی ایس سی کر رہی تھی، ابو کا سب سے بڑا بھائی، ان کی چھوٹی بیٹی سائنس پڑھ رہی تھی۔

”تانیہ! کتابیں سمیٹ لو اور جلدی سو جاؤ، پھر صبح اٹھتی نہیں ہو۔“ وہ کہہ کر لیٹ گئی اور ”بس دس منٹ اور“ کہنے والی تانی حزیں ڈیزھ کھٹے پڑھتی رہی تھی۔

”نی اٹھ جا۔“ امی کوئی سووس دفعہ پکار چکی تھیں لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ بقول ان کے مردے جگانا آسان کام ہے لیکن تانیہ عرف تانی کو اٹھانا نہیں۔ امی کی ایک سواک ویس پکار پر اس نے سر تک لحاف تان لیا تھا۔ برابر والی چار پائی خالی تھی۔ نیچے فرش پر وہ جائے نماز پر پینٹ کی بیج کرنے میں مصروف تھی۔

”تانیہ! اٹھ جاؤ، امی جو تالے کر آنے والی ہیں۔“ اس نے بیج مکمل کی، جائے نماز پلیٹ کر رکھی اور اپنا بستر درست کرنے لگی۔

”ٹھیک ہے میں امی کو بھیجے لگی ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ امی باورچی خانہ میں چولہا جلانے میں لگی تھیں، وہ برات میں آنا گوندھنے لگی۔ آٹا گندھ گیا۔ سالن گرم ہو گیا۔ چائے بن گئی۔ وہ پراٹھے بنانے لگی۔ ناشتہ دینی بیاتی تھی، وہ آخری پراٹھا بنا چکی تو آنکھیں ملتی تانی نمودار ہوئی، وہ ل کر برآمدے میں دسترخوان بچھانے لگی۔

”نماز پھر نہیں پڑھی آج۔“ امی نے تانی کو گھر کا۔

”بہن سے بیکھ کچھ، تیرہ تک تھکا نہیں کرتی اور ایک تو ہے، نیستی پتہ نہیں کون سے سوٹے مار کر سوتی ہے۔“

ناشتے کے دوران بھی امی کے بیان جاری رہے تھے۔

ناشتے کے بعد ابو دکان پر چلے گئے تھے، ان کی گاڑی میں کریانے کی دکان تھی، اچھی خاصی سیل ہوتی تھی،

ای دکان کی کمائی سے یہ گھر کھڑا ہوا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہتی تھی، پرائیویٹ بی ایے کر چکی تھی، اس سے چھوٹی تانیہ گھر بھر کی لاڈلی اور رونق نزدیکی شہر کے کالج میں پڑھتی تھی۔ بی ایس سی کر رہی تھی، اس کے سارے لاڈ اٹھائے جاتے اور چھوٹی اولاد تو جتنی مرضی بڑی ہو جائے ہمیشہ چھوٹی رہتی ہے، البتہ امی اس کی کچھ عادات سے بہت مخالف تھیں، جن میں سے ایک یہی دیر تک سونا تھا۔ اس کے باوجود وہ پیار بھی بہت کرتی تھیں اس سے اور وہ... میونسٹ عرف مونا... اس کی بات الگ تھی، ابو کی منتوں مرادوں سے شادی کے سات سال بعد ہونے والی پہلوی کی اولاد بڑی بیٹی، وہ انہیں سب سے پیاری تھی، اور وہ پیاری ہوتی کیوں ناں؟ نماز و روزے کی پابند، پڑھی لکھی، سکھنے بڑھانے دار، وہ دونوں ماں باپ کا غور تھی۔

وہ گھر جنت تھا۔ خوشیوں اور محبتوں سے سجا، زندگی سے بھرپور، ایک مکمل گھرانہ، ایک مثالی خاندان۔

وہ بولتے بولتے خاموش ہوئی تو پھر سے اس نیم تاریک کمرے میں سناٹا چھا گیا، وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”میں بھی ان سے بہت محبت کرتی تھی، اپنے آپ سے بھی زیادہ ابو سے، امی سے، تانی سے۔“ آخری لفظ پر اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تمہارے ابو کا نام بلال فاروقی تھا؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ کیس احمد تھے۔“

”تو بلال کون ہے؟ تمہاری فائل پروڈکٹ کا نام بلال درج ہے۔“

خاموشیوں کے تھکے سیاہ چہرے سے پتھر پلے فرش پر اترنے لگے۔

امی اور تانیہ شہر گئی ہوئیں تھیں، ابوجی ہی دکان پر جا چکے تھے، وہ گھر پر اکیلی تھی، پہلے تو سارے پودوں کو پانی دیا تھا پھر اندر کمروں کی حالت درست کی تھی، بستر ٹھیک کئے۔ کافی دیر گزری جب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی، وہ لحاف تہہ کرتے کرتے چوگی۔

”لگتا ہے امی اور تانی آگئیں۔“

وہ باہر آئی، محسن پارکر کے دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔ آنے والے کی پشت اس کی طرف تھی، دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ پلا، چوبیس پچیس سالہ وہ انسان اس کے سامنے کھڑا تھا، ہلکی ہلکی داڑھی، گندی سی رنگت، ذرا اندر کو دھنسی آنکھیں کریم کٹر کے کارولائے شلوار میں ملیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھکی اور پھر جلدی سے سر پر دوپٹہ کیا اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

آنے والا دروازے میں کھڑا تھا۔

”خالہ سے ملنے آیا تھا۔“

”امی، ابو گھر پر نہیں ہیں۔“ وہ ہولے سے بولی، وہ متذبذب سادروازے میں کھڑا رہ گیا۔

”لیں امی! میں کیسے اندر بلوا لیتی، نہ ابو گھر نہ آپ۔“ امی کو اس نے ابھی بتایا تھا کہ بلال آیا تھا اور اس نے

اسے دروازے سے لوٹا دیا، وہ فکر مند ہوئیں۔

”آئی! انہوں نے کیا کہہ دینا تھا، وہ کون سا غیر ہیں، خالہ زاد ہیں اور اب تو ویسے بھی وہ منگیتر ہیں آپ کے۔“ تانی ہوئے مسکرائی، مونا ویسے ہی کھڑی رہی۔

”منگیتر محرم نہیں ہوتا تانی بی بی! میں تو نہیں بلا سکتی کسی بھی غیر محرم کو اکیلے گھر میں بھلے وہ کزن ہو یا منگیتر۔“

ای نے سانس بھری۔

”چل اچھا کیا دمی رانی! میں معذرت کر لوں گی حمیدہ سے۔“

لیکن معذرت کی ضرورت نہیں پڑی تھی، بلال نے کہا تھا غلطی اس کی ہے، اسے اطلاع دے کر آنا چاہئے تھا، اسے کوئی گلہ نہیں۔

☆.....☆.....☆

برآمدے میں ایک طرف سلائی مشین لئے مونا بیٹھی تھی، تانی کا نیا سوٹ سلائی ہو رہا تھا، تھوڑے فاصلے پر تانی کتابیں پھیلانے چٹائی پر بیٹھی تھی، باہر محن میں بھی چار پانی پر ابویٹھے دکان کا حساب کر رہے تھے، امی کیاری سے سر جھپٹوڑ رہی تھیں۔

”کل بھی فون آیا تھا حمیدہ کا۔ اب تاریخ مانگنے پر زیادہ اصرار کر رہی ہے وہ۔“ وہ ابو سے بات کر رہی تھیں۔ ابو نے ایک نظر انہیں دیکھا اور دوسری نظر برآمدے میں ڈالی۔

”کل فون پر آنے کو کہہ رہی تھی، میں نے ٹال دیا، اب بتائیں کیا کرتا ہے؟“ ابو سوچ میں ڈوبے۔

”کرنا کیا ہے، اصرار کر رہے ہیں تو بلو الو، مناسب سی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔“

تانی اچھل پڑی۔

”ابو! میرے پیچروں کے بعد کی تاریخ رکھئے گا، میں نے کل کرا نجوائے کرنا ہے، دو مہینے گزار لیں۔“ ابو مسکرائے۔

☆.....☆.....☆

باہر محن میں ہی تین چار پانیاں بھیجی تھیں جن پر نئی کور سفید کڑھائی والی چادریں بھیجی ہوئی تھیں، ایک طرف کرسیاں رکھی تھیں، درمیان میں میز بھی جس پر مٹھائی اور پھول کی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔

بھی اندر سے تانی نمودار ہوئی، بڑے میں چائے کے لوازمات سمیٹے، سب کو چائے پیش کر کے وہ بھی وہیں ٹپک گئی۔

”بس تو پھر مارچ کی چھ تاریخ فائل ہو گئی۔“

امی نے بسکٹوں کی پلیٹ حمیدہ خالہ کی طرف بڑھائی۔

”میں نے بس اور دیر نہیں کرنی اور آپ سے اپنی برکت لے جانی ہے۔“ حمیدہ خالہ مسکرائیں، برابر والی کرسی پر بیٹھا بلال بھی مسکرایا، تانی نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”خالہ! آپ کا نام میمونہ ہے، برکت نہیں۔“ سب ہنسنے لگے، امی نے حمیدہ خالہ کے منہ میں برتی ڈالی تھی۔

”مبارک ہو۔“

آم کے اونٹنے چڑ میں شور مچاتے پرندے بکھلا کر مسکرائے تھے۔ شام کی نارنجی سرخیوں میں گلابی خوشیاں شامل ہو رہی تھیں، مسکراہٹوں کی نازک تتلیاں ہر طرف اڑ رہی تھیں۔

”میں اپنی بہو سے مل لوں۔“

خالہ نے اندر آتے ہی اسے گلے سے لگایا اور بلائیں لیں، مٹھائی کھلائی اور ہاتھ میں ہزار کے نوٹ تھا دیئے۔

☆.....☆.....☆

سیشن ختم ہوتے ہی وہ باہر آیا تھا۔ اسپتال کے کام نمٹا کر وہ شام میں گھر آیا اور کچن میں آ گیا۔ میکرونی کے لیے بنزیاں فراہم کرتے ہوئے بھی وہ میمونہ بلال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جب سب ٹھیک تھا، ہر شے اپنی جگہ تھی تو غلط کہاں تھا؟ غلط کیا ہو گیا تھا؟ وہ جلد جان لینا چاہتا تھا لیکن یہ جلد بازی اس کے پروفیشن کا حصہ نہیں تھی۔ میمونہ بلال نامی کتاب اسے آہستہ آہستہ ورق ورق کھولنا تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن اسے ڈاکٹر دانیال نے بتایا تھا کہ رات اسے دورہ پڑا ہے اور وہ جب سے نیم بے ہوشی میں ہے، وہ جلدی سے اس کے کمرے میں آیا، اسے ڈرپ لگی تھی، بیڈ پر لیٹی وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔

”میمونہ! ٹھیک ہو؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے، چپ لیٹی دیواروں کو دیکھتی رہی پھر اچانک چلانے لگی، بے تحاشانہ بانی انداز میں، وہ افسردگی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”ہم نے ان کے وارث کو بلوایا ہے گاؤں سے، وہ آپ کے آفس میں ہے۔“ اسے بتایا گیا تھا۔ وہ آخری نظر اس پر ڈال کر آفس میں آ گیا۔

اٹھائیس اسی سالہ وہ دیہاتی انسان اس کے آفس میں کرسی پر سر جھکاٹے بیٹھا تھا۔ سفید شلوار قمیض میں ملیوس جوڑا سیٹلی ہو رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا تو ڈاکٹر شاہ زیب نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

”ڈاکٹر صاحب! وہ کیوں ایسی ہوئی ہے؟ وہ کیوں ٹھیک نہیں ہو رہی؟“ اس کی آواز سے پریشانی چھلکتی تھی، اس کے چہرے پر نظرات کا جال بنا ہوا تھا، وہ میٹرک پاس دیہاتی سا انسان سوال کنٹا تھا اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”تم اسے کب سے جانتے ہو؟“ ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اسے بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ اس سے دو سال چھوٹی اس کی خالہ زاد... میمونہ عرف مونا... وہ اسے تب سے پیاری تھی جب وہ چند ماہ کی تھی، وہ جب بھی ماں کے ساتھ خالہ کے گھر آتا اس کے گرد منڈلاتا رہتا، مٹھی سی گڑیا اسے بہت عزیز تھی۔ وقت گزرتا گیا اور وہ مٹھی سی گڑیا اتنی بڑی ہو گئی کہ اس سے پردہ کرنے لگ گئی۔ اس کی محبت بھی شدید ہوئی گئی، وہ دسویں میں دوسری بار فیل ہو گیا تو ابا کے ساتھ زمینوں پر کام کرنے لگا۔ تقریباً دو سال بعد ابا چل بے، اماں کو ڈر رہو گیا کہ وہ بھی بیٹے کی خوشی دیکھے بغیر نہ مر جائیں، سو اس کی منگنی مونا سے ہوئی۔

وہ تب بھی اس سے پردہ کرتی رہی، اماں نے بتایا کہتی ہے منگیتر محرم نہیں ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں مرعوب ہو جاتا۔ اس کی ہونے والی بیوی اس سے زیادہ پرہیزگار تھی۔ اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہوئی، وہ اس بات پر غلن محسوس نہیں کرتا تھا، وہ دل و جان سے اس بات کو تسلیم کرتا تھا وہ برتر تھی۔ وہ خالہ کے گھر جاتا تو وہ سامنے نہ آتی، بھی وہ اکیلی ہوتی تو اسے باہر سے باہر لوٹا دیتی۔ اسے اچھا لگتا تھا اس کا دروازے سے لوٹا دینا۔ جتنی پاکیزہ وہ تھی، اتنی ہی پاکیزہ بلال فاروقی کی محبت تھی۔ مونا کے علاوہ بھی اسے خالہ کے گھر میں سب سے محبت تھی، پیار کرنے والی

خالہ، بہت سارا خیال رکھنے والے خالو، نٹ کھٹ سی تانی...
تو یہ تھا بلال فاروقی اور ایسی تھی اس کی محبت، پالینے کی چاہ سے بہت اوپر کی محبت... حقیقی محبت... آسانی
محبت...

☆.....☆.....☆

کمرے میں ہلکی سی خنکی تھی، فضا پر سکون تھی، ڈاکٹر شاہ زیب کے سامنے کرسی پر بیٹھا وہ دیہاتی انسان
صاف سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔
”جب اتنی محبت کرتے ہو اس سے تو بے چاری کو پاگل خانے میں کیوں ڈال دیا؟“ اس نے سر اٹھایا۔
”قسم رب کی! میں اور اماں راضی نہیں تھے، صرف چھوٹی کی وجہ سے مجھے یہ کرنا پڑا۔“ وہ چونک پڑا۔
”چھوٹی؟ کون؟“

”میری اور میمونہ کی دمی! اس کی وجہ سے میمونہ کو پاگل خانے میں داخل کروایا، میری دمی مشکل سے دو سال
کی تھی، اس کو تو اپنی ہوش نہیں تھی، بچی کا خیال کیسے کرتی، ایک دو بار دورے میں بچی پر حملہ کیا تو اسے یہاں لے
آئے۔“ وہ تفصیل سے بتاتا گیا۔
”اب بچی کو کون سنبھالتا ہے؟“
”میری اماں۔“

ڈاکٹر شاہ زیب نے ہنکارا بھرا۔

”اور میمونہ کی چھوٹی بہن کا کیا ہوا؟“

”وہ تو جی مرگئی تھی، میرے اور مونا کے دیاہ سے دو مہینے پہلے۔“

وہ شاکہ نہ گیا، اس دن بلال فاروقی کے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کے دماغ میں بہت سے سوال تھے
جن کے جواب صرف میمونہ جیسے کے پاس تھے۔ بھی وہ آفس سے نکلا اور میمونہ بلال کے کمرے میں آیا۔ وہ بیٹہ
پریشانی تھی۔

”بلال آیا تھا، یہ تمہارے لئے دے گیا ہے۔“ بلال کی دی ہوئی چادر اس نے میمونہ کی طرف بڑھا دی۔

☆.....☆.....☆

موسم بدل رہا تھا، فضا میں خنکی کا احساس بڑھ رہا تھا، دسمبر ہو لے، ہو لے قدم جمارا تھا، باہر صحن کی چارپائی پر
امی اور تانی کچھ کپڑے لئے بیٹھی تھیں جو ابھی بلال دے کر گیا تھا۔
”یہ تمہارے لئے ہے، بلال بھائی پشاور گئے تھے خاص تمہارے لئے لے کر آئے ہیں۔“ تانی نے ہلکی
بھوری چادر اس کی طرف بڑھائی، اس نے چادر کی تہہ کھولی اور سر پر لے لی۔ بھوری کڑھائی والی چادر کے حلقے
میں اس کا بیچ چہرہ دکھ اٹھا تھا، تانی نے خوب سراہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ تہجد کے وقت اٹھی تھی، احتیاط سے چادر اپنے گرد لپیٹ کر وہ باہر نکلی تھی۔ اندر کمرے میں اندھیرے کی وجہ
سے اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ تانی کی چارپائی خالی ہے، وہ غسل خانے کی طرف جا رہی تھی جب کسی آواز پر
چوکی، آواز بیڑھیوں کی طرف سے آ رہی تھی، خوف کی ایک لہر ٹھنڈ بن کر اس کی ریڑھ کی ہڈی سے گزری تھی، وہ
دبے قدموں بیڑھیوں کی طرف آئی۔

”لوجی! میں تمہارے لئے اتنی صبح جاؤں کے موسم میں باہر بیٹھی ہوں اور تم کہہ رہے ہو پرواہ نہیں۔“ تانی
کی آواز اس کے پیروں تلے سے زمین کی سطح پر گئی تھی، وہ فون پر مصروف تھی، وہ کسی بات پر مسکرائی تو اس کی ہنسی کی
آواز جلیجنگ کی مانند سناٹے میں پھیل گئی۔

”یار اکل میری دوست ساتھ تھی تو میں مل نہیں سکی، آج لچ کا وعدہ کر تو ملنے کا سوچتی ہوں۔“ تانی کی آواز
اس کے حواس معطل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے، 12 بجے مجھے کالج سے پک کر لینا، امی کو کہہ دوں گی پر پکٹیکل سے لیٹ ہو جاؤں گی۔ لو
پو۔۔۔“ وہ اپنی سرشاری کے عالم میں کالج کا کٹ کر بیڑھیاں اتری لیکن صحن میں میمونہ کو دیکھ کر ٹھٹھکی گئی، رنگت فق
ہوئی، ساری سرشاری اور خوار و خند بن گیا، میمونہ چیل کی طرح اس پر چھٹی تھی۔

”آپنی اخدا کے لیے، خدا کے لیے کسی کو مت بتانا، ابو مجھے مار دیں گے آپنی پلیر۔“

میمونہ نے اس کا موبائل لیا اور فرش پر دے مارا۔

”آپنی اخدا کے لیے۔“ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میمونہ اسے کھینچ کر اندر کمرے میں لے گئی۔

☆.....☆.....☆

زردی دھوپ کی مری مری کرنیں صحن میں اتر رہی تھیں، آم کے درخت پر پرندے مسلسل شور مچا رہے تھے۔
رہیں صاحب کے گھر میں مرگ کا سا سماں تھا، چارپائی پر سر جھکائے بیٹھے تھے، پاس نیچے چوکی پر امی بیٹھی
تھیں۔

”کب سے چل رہا ہے یہ سب؟“ ابو دھاڑے، کمرے کے دروازے میں سر جھکائے مجرم بنی کھڑی تانیہ
عرف تانی لرز گئی، آج زندگی میں پہلی دفعہ ان کی دھاڑ سی تھی۔

”سینکڑا سترے۔“ وہ اب فوراً تھپڑیں مار رہی تھی۔ ابو کا سر شرم سے مزید جھک گیا، امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”دو سال سے یہ گل کھلا رہی ہے؟“

”ابو! وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”دو سال پہلے جب اس نے تجھ سے کہا کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو تجھی کیوں نہیں بتایا؟ تجھی اس
نے ماں باپ کو رشتے کے لیے کیوں نہ بھیج دیا؟“ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

”شادی کرنی تھی، کہہ دیتی میں کرویتا۔ یہ سب کیوں کیا؟“

”وہ کہتا تھا بات کرنے کو۔“

”اور تو چھوٹی دودھ پیتی بچی ہے؟ اس نے کہا اور مان لیا۔“ وہ ٹپ ٹپ رونے لگی۔

”پیار کرنی ہوں اس سے۔“

برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا۔ کھڑی میمونہ سرخ پڑ گئی، سانس بھی نہ لے سکی، جب ہوش میں آئی تو
اس کی طرف بڑھی اور تھپڑ رسید کیا۔

”بے حیا... بے شرم... باپ کے سامنے کیا بکواس کر رہی ہے۔“ یہ فقرے کافی نہیں تھے پر اس سے زیادہ وہ
بول نہیں پاتی تھی۔ ابو نے افسوس بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”کانج بند، پڑھائیاں بند، جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا، مونا کی ماں اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ بس۔“ فیصلے ہو گئے
تھے۔

نے چکنا چور کر دیا ہے، اس جھوٹ کو نکاح کے لیے آسکتے ہو تو ٹھیک ورنہ اسے بھول جاؤ۔“
”انگل پلینز ایسے مت کریں، میں اس سے پیار...“

”بس...“ وہ دھاڑے۔

”نکل جاؤ میرے گھر سے اور آئندہ مجھے یہاں نظر مت آنا۔“ وہ اٹھا نہیں تھا۔

”انگل پلینز ایسے ظلم مت کریں، میں اس کے بغیر مر جاؤں گا۔“

”دیکھو! تم میرے مہمان ہو، مجھے کسی انتہائی عمل پر مت اکساؤ۔“ وہ اب بھی نہیں اٹھا تھا۔

”چلو اٹھو۔“ انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا لیکن وہ جیسے چارپائی سے چپک گیا تھا۔

”پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں دو ماہ انتظار کریں گے۔“

انہوں نے سخن میں نظر دوڑائی اور ایک طرف پڑی لکڑی اٹھا کر اس پر تان لی۔

”مارلیں۔“ وہ مسکرایا۔ تازہ جوانی کا نشہ... پیار کا بخار... حد سے زیادہ خود اعتمادی اور حد سے زیادہ غصہ، شرم ہی شرم تھا۔ خیر کہاں تھی؟ انہوں نے پے درپے اس پر لکڑی برسادی، اس کی سفید شرٹ پر سرخ لکیریں نمودار ہو گئیں۔

”ابو! پلینز مت ماریں۔“ تانی اندر کمرے سے چلائی، فہد کی نظر اس پر پڑی تو مسکرا کر اٹھا اور چلا آیا۔

”دو ماہ انتظار کرنا جان! میں ضرور آؤں گا، کسی اور کی ہوئی یا یہ سب نہ مانے تو بھگا کر لے جاؤں گا، اٹھا کر لے جاؤں گا یا درکھنا۔“ آخری فقرہ ابو کو کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ ابو کا لکڑی والا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ پھر وہ کسی کٹے درخت کی مانند زمین پر گرے تھے، ان کے رونے کی آواز دل چیر دیتی تھی۔

”ابو... ابو...“ وہ سر میں خاک ڈال رہے تھے۔

”تو نے برباد کر دیا مجھے، تانی تو نے رول دیا مجھے، مٹی کر دیا۔“

☆.....☆.....☆

رات کا کھانا صرف ابو نے کھایا تھا۔

”مونہ کی ماں۔“ کھانے کے دوران انہوں نے امی سے کہا۔

”منع کر دے رشتے کرانے والی کو، رک جادو مینے، کر دے اس کی جو مرضی ہے۔“ آخری فقرہ لے کر انہوں نے ہاتھ صاف کیے۔ یاس کھڑی مونہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور چوکھٹ میں کھڑی تانی کو گلے لگایا۔ ”خوش رہو۔“

خاموشی رات بیکسی سی اتر آئی تھی۔ رات کا آخری کوئی پہر تھا جب سناٹے کی دبیز چادر کو چیخ کی آواز نے تار تار کر دیا۔

”مونہ... مونہ... تانی... جلدی آؤ... تمہارے ابو...“

☆.....☆.....☆

آدم کا بیٹا خاموش کھڑا تھا، صرف چڑیاں تھیں جوشاخوں میں شور مچاتی تھیں، گلاب کے بوٹے پر چند کلیاں اوس میں بھگی تھیں۔ بڑے سخن میں دریاں بھگی ہوئی تھیں جن پر سفید چادریں بھگی تھیں، دریا کے دونوں طرف غورتیں ایک قطار میں بیٹھی تھیں اور ان کے درمیان گھلیوں کے ڈھیر تھے، کچھ کے ہاتھ میں سپارے تھے، خاموش کم صمی امی حیدرہ خالہ کے کندھے سے لگی تھیں، برآمدے سے پرے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ میں خستہ حال سی تانیہ بیٹھی تھی، سوچی آنکھیں، ہنسرے بال، دور غلاؤں میں ملتی ہوئی۔ عورتوں کے درمیان سفید چادر

☆.....☆.....☆

غریبوں کے پاس سب سے قیمتی متاع عزت ہی تو ہوتی ہے، جیسی وہ اپنی جان سے بھی زیادہ بڑھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں، جان چاہتی ہے تو جائے عزت نہ جائے اور اب جب ان کی چھوٹی لاڈلوں اپنی بیٹی اسی عزت کو اونے پونے داموں بیچنے پر تھی تو وہ چپ کیسے رہتے؟

تانی کی پڑھائی ختم کروادی گئی، رشتے والی کورشتہ ڈھونڈنے پر لگا دیا، پراچھا رشتہ کون سا کوئی پھل ہے کہ درخت سے توڑا اور کھالیا، متوسط طبقوں میں تو رشتے بھی سالوں میں ملتے ہیں۔

تانی چلاتی۔ ”جب شادی کر رہے ہیں تو اسی سے کر دیں۔“ اماں اور مونہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرواتیں، ایسی ہی ایک آواز ابو کے کان میں پڑی تھی۔

”ٹھیک ہے بلو الواسے۔“

☆.....☆.....☆

دھوپ کی نرم گرم سی کرنیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، بڑے سخن میں دو چار پائیاں بھگی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر ابو بیٹھے تھے اور دوسرے پر وہ لڑکا بیٹھا تھا۔ تانی نے اس کا نام فہد بتایا تھا۔ تانی، میمونہ اور امی اندر کمرے میں تھیں۔

”دیکھو پر خوردار! میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا اور نہ ہی اب اس کا وقت رہا ہے، صاف ستھری بات ہے کہ اپنے ماں باپ کو بھیجتا کہ وہ جائز طریقے سے رشتہ مانگیں اور شادی کر کے معزز طریقے سے لے جاؤ اسے۔“ وہ ہنکھار۔

”اچھ کی انکل! میرے پیرنٹس اس شادی پر راضی نہیں ہیں، میری منگنی میرے تایا کے گھر ملے ہے، وہ اسے توڑنے پر تیار نہیں، میں دو سال سے انہیں منانے کی کوشش میں ہوں۔“

ابو نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”جب تمہارے ماں باپ راضی نہیں اور منگنی کروا چکے ہو تو تانی کو شادی کا لارا کیوں دیا؟“

”ریلیکس انکل! وہ راضی ہو جائیں گے۔“

”بس۔“ ابو نے ہاتھ اٹھایا اور بات کاٹی۔

”تم شادی کرنا چاہتے ہو تانی سے؟“

”جی!“

”تو ٹھیک ہے اس جھوٹ کو بارات لے آؤ، خاندان مناتے رہنا بعد میں۔“ وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

”لیکن انکل! ایسے کیسے؟ میرا مطلب ہے میرے پاس نہ رہنے کی جگہ ہے نہ جاب ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟“

”تمہارا مسئلہ ہے۔“

”دیکھیں انکل! مجھے دو ماہ کا وقت دیں، میں منالوں گا اپنے پیرنٹس کو۔“ ابو نے پھر بات کاٹی تھی۔

”دو سال میں نہیں مانے تمہارے ماں باپ، دو ماہ میں کیسے منالو گے؟“

”انگل پلینز! میں منالوں گا۔“

”دیکھو لڑکے!“ وہ رساں سے بولے۔

”تم دو ماہ کی بات کر رہے ہو، میں دو لمحے بھی نہیں رک سکتا، حد سے زیادہ اعتبار مجھے اپنی بیٹی پر جسے اس

اوڑھے، ہاتھ میں سپارہ لئے مونٹا بیٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

ابو کو گزرے آج چوتھان تھا تفریباً سارے مہمان چاکلے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے حمیدہ خالہ اور بلال بھی چلے گئے تھے، انہیں رخصت کر کے وہ آئی تو امی محسن کی چار پائی پر قبضہ کر کے کبوتروں کو دیکھ رہی تھیں۔

”امی!“ وہ پاس آ بیٹھی۔

”میں نے رشتے کرانے والی بو کو بلوایا ہے۔“ وہ چونک پڑیں۔

”وہ آتی ہوں گی، بات کریں ان سے، بھئی کے اندر اندر رشتہ ڈھونڈیں اور اس کی شادی کر دیں بس۔“ امی حیرت سے اٹھیں۔

”لیکن مونٹا تیرے ابو نے...“

”بس امی بس۔ مجھے اب اور کسی کو نہیں کھونا، ابو کے فیصلے ابو کے ساتھ دفن کر دیئے میں نے۔“

”لیکن مونٹا! وہ دو مہینے بعد...“

”امی! جب دو سال میں نہیں مانے اس کے ماں باپ تو دو ماہ میں کیسے مانیں گے؟ وہ بھاگ گئی تو کیا کریں گی؟“ وہ چپ ہو گئیں۔

تھوڑی دیر میں رشتے کرانے والی اماں آ گئی تھیں۔

”کوئی بھی لے آؤ اماں! اندھا، لنگڑا، رٹوا... بس بھئی کے اندر اندر...“

اور دو دن کے اندر اندر رشتہ حاضر۔

”45 سال کا ہے پر مردی عمر کون دیکھتا ہے آپا۔ رٹوا ہے 14 سال کا ایک بیٹا ہے اور دو سال بڑی بہن ہے، مناسب گھر ہے اچھا کماتا ہے، دو بچے ہیں۔“

”بس کافی ہے۔“

سب آنا فانا طے ہو گیا۔ کسی کو خبر نہ کی، تانی کو بھی نہیں، نہ ہی حمیدہ خالہ اور بلال کو۔ نکاح والے دن چار آدمی آ گئے تو تانی کو جوڑا اتھا دیا۔

”جلدی تیار ہو جا مولوی صاحب آگئے ہیں۔“ وہ حق دق۔

”میں نہیں کروں گی، زہر کھالوں گی پر نکاح نہیں کروں گی۔“ توقع کے عین مطابق وہ بولی تو مونٹا نے زہر کی گولیاں اسے تھما دیں۔

”لے کھا اور مر جا... جامر جا... یا پھر تیار ہو جا، لیکن حرام موت مرنے سے پہلے سوچ لے اور ابو کو کیا منہ دکھائے گی۔“

”آئی! پلیر دو ماہ رک جاؤ۔“

”دو سینڈ ز بھی نہیں۔“

مولوی صاحب آگئے، وہ بھی تیار ہو گئی۔ خاموشی سے قبول ہے قبول ہے بھی ہو گیا۔

”اس نے کہا تھا کسی اور کی ہو گئی تو اشاکر لے جائے گا تو لے جائے، دو ماہ کی تو بات ہے۔“ اس کی بات

اماں حق دق رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

آسمان تار یک تھا، ان گنت تارے بھی اپنی جگہ گھاٹ سے آسمان کی تار کی کو دور نہیں کر پارہے تھے۔ اس صحن میں چند افراد صحتی کے انتظار میں تھے، اندر کمرے میں وہ دونوں موجود تھیں۔

”آئی! تم نے میری زندگی برباد کی ہے، صرف تم نے...“ وہ دلہن بنی کھڑی تھی۔

”اور تم نے میرے باپ کی جان لی ہے، صرف تم نے...“ وہ شہنشاہ شہر لکھے میں بولی۔

”وغلطی ہو گئی مجھ سے، مانتی ہوں، محبت کرنے لگ گئی اور آپ سب کو بتانے کی ہمت نہیں تھی، مانتی ہوں لیکن...“ میمونہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بہت کئی بنی ہم نے یہ سب بکواس اور بہت ہو گئی، رخصتی کا وقت ہو رہا ہے، یہاں سے جا اور جو مرضی کر، ہمارے لئے مر گئی تو بس بات ختم۔“

وہ افسردگی سے اسے دیکھتی رہ گئی، ٹھنکی باندھ کر، انہماک سے اور پھر ہولے سے بولی تھی۔

”خدا کرے آپ! تمہیں کسی سے محبت ہو جائے۔“

اس کی بات پر میمونہ زور سے ہنسی اور ہنسی چلی گئی۔

”بس... یہ بد دعا؟ اتنی معمولی سی؟“ وہ پھر سے ہنسی اور ہنستے ہنستے بولی۔

”اتنی حقیر سی بد دعا؟ یاد رکھیں! میمونہ رئیس کا نفس اتنا کمزور نہیں کہ گلے میں پٹہ ڈال کر کتے کی طرح گلی گلی لئے پھرے، تیرے جیسی آتی ہوں گی ان جالوں میں، میرا اندر، میرا نفس اتنا کمزور نہیں کہ مجھے مٹی کر دے، رب سو نے ہے میرا نفس تیرے نفس جیسا نہیں بنایا۔“

دور اوپر، بہت دور سات آسمانوں سے پرے کسی شے نے تو عرش ہلایا تھا، وہ بد دعا پہنچی تھی یا غرور... کچھ تو تھا جو دور اوپر، بہت اوپر گیا تھا۔

اور نیچے، بہت نیچے تاریک آسمان میں تاروں کی چھایا تلے تانیہ عرف تانی دواغ کردی گئی تھی۔

غلط راستے پر چلنے والے سزا تو بیا لیتے ہیں کسی نہ کسی، کسی نہ کسی طرح... اور سیدھے راستے پر چلنے والے بھی کسی نہ کسی اپنی ہی کسی بات کے شے میں کس دیئے جاتے ہیں کسی نہ کسی، کسی نہ کسی طرح... ☆.....☆.....☆

سیشن کا وقت ختم ہو رہا تھا۔

”تو تمہاری خالہ نے جب تانیہ کے بارے میں پوچھا تھا تو...“

وہ ذرا دیر چپ رہی۔

”اس کے نکاح کے تین دن بعد اس کے کالج کے پاس بم دھماکہ ہوا، ہم نے مشہور کر دیا کہ وہ اس دھماکے میں مرنے والوں میں تھی، لاش نیلی اور نہ ملتی تھی۔“

”تو تم نے یا تمہاری مدر نے بھی رابطہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی؟“ میمونہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

☆.....☆.....☆

وہ میمونہ بلال کی میڈیکل رپورٹ تھی۔

”یہ MRI کی رپورٹ ہے ڈاکٹر“ ڈاکٹر ڈانیال نے اسے بتایا۔

”یہ یہاں ایک چھوٹا سا دھبہ ہے، یہ انڈیلیشن دے رہا ہے کہ یہاں کچھ ہے۔“ منھی سی بڈ (Bud) کچھ ابھر رہا ہے، نیور کی طرح، وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے، ڈپریشن یا پھر فزیکل انجری، دورے کی حالت میں اس کا سر ٹکرانا، یہ

اس کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔“ وہ چپ ہوئے تو ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا۔
”تو پھر علاج کیا ہے؟ سر جری؟“

ڈاکٹر دانیال نے رپورٹ پھر سے سامنے کی۔

”ڈاکٹر یہ پچھڑی گلیڈ کے بالکل پاس ہے، اتنا پاس کہ پچھڑی کا عکس معلوم ہوتا ہے اور ہے بھی تنہا سا، مجھے ڈر ہے پچھڑی کو سر جری سے نقصان نہ ہو جائے۔“ وہ ڈرار کے۔

”اور پچھڑی کا Damage ہونا ساری باڈی کے ہارمونل سسٹم کو تباہ کر سکتا ہے۔“

”ڈاکٹر آپ کو نہیں لگتا ابھی سر جری کرنا رسک ہے؟“ ان کے خاموش ہونے پر وہ بولا۔

”سو فیصد رسک ہے لیکن نہ سر جری کی صورت میں یہ رسک ہزار گنا زیادہ ہے۔“ ڈاکٹر شاہ زیب خاموش رہ گیا۔

”ہمیں انتظار کرنا ہی ہو گا ڈاکٹر!“

وہ ہنکارا بھر کر اٹھا اور میونہ بلال کے کمرے میں آیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

فضا میں نمی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اونچے آنچ کے بیڑ میں شور چاچی چڑیاں بھی شہنڈ کی شدت سے کہیں دیکھ گئیں تھیں۔ دھند کی ایک مہین سی لہر نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔

اندر برآمدے میں دو چار پائیاں چھپی ہوئی تھیں۔ دونوں چار پائیوں کے درمیان میر تھی جس پر چائے کے کپ اور مٹھائی کا ڈبر رکھا تھا۔

”آپ کے خاوند اور بیٹی کا بہت افسوس ہوا۔“ وہ بھاری سی عورت جو بقول فہد کے اس کی والدہ تھیں، کہہ رہی تھیں۔

یہ تانی کے نکاح کے دو مہینے بعد کی بات ہے، وہ فہد کا رشتہ لے کر آئی تھیں، فہد کی آنکھیں روشن تھیں، وہ ماں باپ کو صرف تین ہفتوں میں منا چکا تھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔

چائے کے کپ ٹھنڈے پڑے رہ گئے، وہ ساکت خاموش بے یقین سا بیٹھا رہ گیا، چندرہ منٹ بعد وہ دونوں تعزیت کر کے چلے گئے تھے، امی وہیں سر جھکائے بیٹھی رہ گئیں۔

”ہمیں انتظار کر لینا چاہئے تھا۔“ وہ ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے باہر آئی تو امی کی آواز سنائی دی۔

☆.....☆.....☆

”پھر... تمہاری اور بلال کی شادی ہو گئی؟“ ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا۔

”ہاں... بہت دھوم دھام سے، خالہ نے اپنے سارے ارمان پورے کئے، میری امی رخصتی کے بعد اکیلی رہ گئیں، بلال اور خالہ نے ساتھ چلنے کو کہا پر وہ نہیں مائیں۔“

”بلال کیسا شوہر ثابت ہوا؟“ وہ ڈرار کی۔

”بہت اچھا، بہت سے کچھ زیادہ اچھا، بہت زیادہ محبت کرنے والا۔“

☆.....☆.....☆

”وہ بہت کم گو ہے، مجھے معلوم تھا، وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ میں اپنی محبت کا اظہار کرتا، بہت ساری باتیں کرتا، وہ بس سنتی رہتی، اظہار نہیں کرتی تھی، یا شاید مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔“ بلال اس کے

رداؤ انجسٹ 174 مارچ 2016ء

سامنے بیٹھا بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے MRI رپورٹ دکھانے کے لیے بلوایا تھا۔

”میں اسی میں خوش تھا کہ وہ میری تھی، بس میری اور یہ میرے لئے بہت تھا، نمازوں کی بابت، پرہیزگار، وفا شعار، نیک بیوی، شادی کے آٹھویں مہینے جب پتہ چلا وہ ماں بننے والی ہے تو مجھے لگا بس ہر کی ہر کی ہونے والی ہے۔“ وہ بولتا چلا گیا۔

”محبت کرنی تھیں تم بلال سے؟“

اگلے دن سیشن کے درمیان اس نے میونہ بلال سے پوچھا۔

”محبت کے کہتے ہیں؟ مجھے معلوم نہیں تھا، میرا دل اس کی طرح ہر وقت اسے دیکھنے کو ہسکتا نہیں تھا، نہ میں ہر وقت اس کی قربت چاہتی تھی، وہ دن میں کام پر جاتا، چلا جاتا... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، اس سے دوری مجھے تڑپانی نہ ہی جلاتی تھی، اس کا ساتھ میرے لئے باعث اطمینان تھا، باعث سرشاری نہیں تھا۔“ وہ ڈرار کی۔

”لیکن... لیکن پھر مجھے محبت ہوئی گئی، شادی کے چھ مہینے بعد مجھے محبت ہوئی گئی، کسی اور سے...“

وہ سن بیٹھا سترہا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس کے سرال کا گھر تھا، میکے کے گھر سے بہت مختلف، چھوٹا سا مچن جسے اینٹیں لگا کر پختہ کر دیا گیا تھا، مچن کے عین وسط میں نیم کا پرانا درخت تھا، دروازے کے عین سامنے برآمدہ جس میں دو کمرے تھے، برآمدے کے دائیں طرف میڑھیاں اور بائیں طرف باورچی خانہ۔

وہ عصر کی نماز پڑھ کر باہر آئی تو چھوٹے سے مچن میں جس بھرا ہوا تھا، وہ جس سے گھبرا کر چہل قدمی کے لیے میڑھیاں چڑھتی اوپر آگئی۔ چھوٹی سی چھت جس میں ایک طرف کبوتروں کا ڈبر تھا، ایک ٹوٹی چارپائی اور چند

بیکارا شیا۔ یونہی ہر شے کو بے دھیانی سے دیکھتی وہ ٹپکتی رہی۔ شام کی ہلکی سی ہوا اندر تک سکون بھر رہی تھی۔ تاریکی پھلتا سورج دور مغرب کی دلدل میں اترنے کو بے قرار تھا۔ یونہی بے دھیانی میں جھٹکتی اس کی نظر پرے گھر کی

چھت پر جا پڑی، ایک گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی چھت پر کوئی کھڑا تھا، اُس کی طرف پشت کیے، اس نے سر پر اٹھکتے دوپٹے کو اچھی طرح سر پر لیا جب وہ مڑا اور اس کی طرف رخ کیا۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوانے اس کے دوپٹے کو

شانوں پر ڈھلکا دیا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں رہا کہ ہوا کیا ہے۔ اس کی نظریں تو دور تیسرے گھر کی چھت پر کھڑے اُس انسان کی روشن آنکھوں میں گر گئیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، اپنی بڑی بڑی سیاہ، انتہائی روشن اور

اہانت، بھری نظروں سے۔ وہ جیسے کسی بحر میں تھی، کوئی جادو پھونک کر اسے اس پر گویا گیا تھا۔ وہ دو آنکھیں... بس صرف وہ دو آنکھیں جن میں روشنیوں کے دیپ بجز بجز جل رہے تھے، ہلکی ہلکی چلتی ہوانے اس کے بال فضا میں

بکیر دیئے، اسے اپنا آپ سنبھالنے کا ہوش تک نہ رہا، وہ دو آنکھیں اس کی بے اختیاری پر مسکرا دیں، اس نے منہ میں دبے سگریٹ کا دھواں فضا میں آزاد کیا اور شان بے نیازی سے مڑ گیا، اور اس لمحے میونہ بلال ہوش میں

آئی، بال جکڑے، دوپٹہ سر پر ڈالا، صحیح کتاب کیا اور دوبارہ ایک نظر اس چھت پر ڈالی۔ وہ جو نچانے کون تھا، لہانے کب چلا گیا تھا۔ بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ وہ لہرتے قدموں سمیت میڑھیاں اتر آئی، دور سورج غروب ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رداؤ انجسٹ 175 مارچ 2016ء

تیسری دفعہ اس کا ذہن بھٹکا تھا۔ اگلے اگلے اس نے الفاظ ادا کیے تھے۔ خیالوں میں کوئی عکس سا اچھ گیا اور ذہن کے پردوں پر وہ ایک پل حادی ہونے لگا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے استغفار پڑھی تھی۔ نماز میں دھیان کے بھٹکنے پر۔

بعض دفعہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ استغفار کریں کس بات پر۔ ہم وقتی شیطان پر استغفار پڑھ پڑھ کر پھوٹتے رہتے ہیں لیکن وہ مردود عاقب نہیں ہوتا کیونکہ ماضی میں کہیں اس نے جزیں پکڑی ہوتی ہیں۔ اس لمحے وہ بھی استغفار کے پتھر اٹلیس پر برسار رہی تھی اور وہ پھر ان دوروش آنکھوں کے سمندر میں چھپک چھپک کر رہے تھے۔

اور اس سے اگلی شام وہ بلاوجہ بیڑھیاں چڑھتی اور آئی تھی کسی نظر نہ آنے والی رسی سے بندھی۔ وہ اس جس زدہ شام میں چھت پر بیتراری ٹہلتی رہی تھی۔ نظریں بھٹک بھٹک کر پرے تیسرے گھر کی چھت تک جاتی تھیں لیکن تلاش تلاش رہ گئی تھی۔

سونے جیسا پگھلتا سورج مغرب کی دلہلی کھائی میں اتر گیا۔ برعدوں کے غول اپنے آشیانوں کو لوٹنے لگے۔ وہ ویسے ہی اضطراب میں گھری، انگلیاں چٹختی چھت کا طواف سا کرتی رہی۔ مغرب کی اذانیں ہوئیں، خاموشی چھا گئی، تاریکی روشنیاں تاریکی میں بدل گئیں، وہ ویسے ہی ٹہلتی رہی۔

☆ ☆ ☆
عشاء کی نماز کے بعد وہ ہاتھ اٹھائے خاموش بیٹھی رہی، کیا مانگے؟ سمجھ ہی نہیں آیا، گھنٹوں ایسے ہی وقت گزارا جب بلال نے پکارا۔

”میمونہ! سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی۔“
وہ چونک کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزرتی۔

☆ ☆ ☆
وہ دورانہ حیروں میں کسی غیر مرئی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ائی ہوئی خشک آنکھوں میں بہتے تاثرات وہ سمجھ نہ سکا۔

”کون تھا وہ؟ جس سے تمہیں محبت ہو گئی؟“ ڈاکٹر شاہ زیب کے سوال پر وہ چونکی اور ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔

”پتہ نہیں... مجھے نہیں معلوم... پتہ نہیں کون تھا، کہاں سے آیا تھا، بس وہ تھا، وہی تو تھا۔“ وہ خواب کے عالم میں بول رہی تھی۔

”وہ میرے ہر لمحے میں اتر آیا تھا، ہولے ہولے اپنے پر پھیلاتا وہ میرے اندر کہیں سرایت کر گیا تھا، میری رگوں میں میرے خون کے ساتھ بہنے لگا تھا... وہ میری شہرگ تک آ گیا تھا۔“

☆ ☆ ☆
آج ساتواں دن تھا۔

وہ بے قراری کے عالم میں چھت پر ٹہل رہی تھی، دور تیسرے گھر کی چھت آج بھی ویران تھی، وہ آج بھی وہاں نہیں تھا، دھوپ کی تپش میں اضافہ ہو رہا تھا، وہ ستمبر کے آخری دن تھے، دھوپ اندر تک روح بھی جھلسا دیتی تھی اور وہ اس جھلسا دینے والی دھوپ میں روز چھت پر آ جاتی اور گھنٹوں اس کے انتظار میں رہتی۔

وہ آئے گا۔ اس کا دل کہتا تھا، پتہ نہیں کیوں کہتا تھا۔

ایک گھنٹہ گزرا، دوسرا... تیسرا... ساتواں... نیچے خالہ آوازیں دیتے دیتے تھک گئیں تو خود اوپر آئیں، وہ جھلسائی دھوپ میں چھت پر بے ہوش پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆
ڈاکٹر نے اسے مکمل میڈریسٹ کا کہا تھا، پریکٹس کے آخری مہینے تھے، لاہور وادی کی صورت میں بچے کو نقصان ہو سکتا تھا۔

”کیوں گئی تھی میری دمی اوپر؟“ خالہ دوپٹے سے ہوا جمل رہی تھیں۔ چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا لیکن جس حد سے زیادہ تھا۔ پاس ہی فکر مند سابلال کھڑا تھا۔

”اندرو... اندر ساڑ پڑتی ہے، سانس... نہیں آتی۔“ وہ بمشکل بولی۔ خالہ نے اسے ساتھ لگالیا۔ طبیعت ڈرا سنبھلی تو یہ پھر اوپر جا پہنچی، سب ارد گرد کی چھتیں ویران سنان پڑی تھیں، ٹپکتے ٹپکتے ہانپ سی گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی، وہ آج بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆
اس کی حالت بگڑنے لگی تھی، بلال اور خالہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل پیرا تھے، وہ دن میں دس بار گھر چکر لگاتا، خالہ نے اس کی امی کو بھی بلوایا تھا، بستر سے لگی مونا کو وہ اٹھنے بھی نہ دیتی تھیں اور ان سب سے بے نیاز وہ نجما نے کیا کیا سوچتی رہتی۔ ایک لمحے کی نازک ڈور سے جزی پھرے ملن کی دعائیں کرتی، گری اور جس سے بچنے کو بلال نے نیا کولر لگوایا۔ چھل کی ٹوکریاں، ہر کھانے کی شے موجود، پانی مانتی تو دودھ حاضر... دودھ مانگتی تو شاید امیر مل جاتا، اس سب کے باوجود وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی۔ اندر کی بے چینی بڑھتی چلی جاتی۔ اندر جو آگ لگی تھی وہ ٹھنڈے کمرے میں پڑے رہنے سے بھی نہ بجھتی تھی، برف سے نہالتی تب بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆
”تم تو اتنی نیک پرہیزگار تھیں، تم کیوں نظروں سے پاگل ہو گئیں؟“ ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا۔

”میں نے روکا، میں نے خود کو بار بار روکا، کئی بار روکا لیکن مجھ سے میں رکی ہی نہیں، میرے سے میرا اپنا آپ رکا ہی نہیں، آنکھیں بند کر لیں، اندر دل کی بھی بند کر دیں پر وہ تو رگوں میں خون کے ساتھ بہنے لگ گیا تھا۔ خود پر استغفار پڑھ پڑھ کر پھونکا پر وہ شیطان تھوڑی تھا جو اسیر ہو جاتا۔“ وہ بولتی گئی۔

”اور اس دن، اس دن میں نے پھر وہ آنکھیں دیکھیں، ستر دن بعد، دوبارہ...“

☆ ☆ ☆
وہ درد سے بے حال تھی۔ نئی زندگی دنیا میں آنے کو بے تاب تھی۔ اس کی درد بھری چٹخیں ان تینوں گھروالوں کی جان نکال دیتی تھیں۔

”بھرجانی میرے بس کی بات نہیں۔“ ہانپتی کانپتی دائی ماں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے ”ہسپتال لے جاؤ۔“

بلال نے کسی دوست کو فون کیا۔ کار آتے آتے چندہ منٹ گزرے تھے لیکن لگتے چندہ صدیوں کے جیسے تھے۔ اسے بمشکل دروازے تک لایا گیا، بلال اسے سہارا دے کر اندر بٹھارہا تھا جب اس کی جھلکی نظریں تیسرے گھر کے دروازے تک گئیں تھیں۔ میمونہ بلال کو لگا وقت جیسے ختم گیا ہے، کسی نے منتر پھونک کر ہر شے

کو چاہ کر دیا تھا، اتھل پھل ہوتی سانس ایک لے سے چلنے لگی تھیں، اندر درو وجود میں چلتی آگ کی بجھی بجھ لگی تھی۔ وہ شخص دروازے میں کھڑا تھا، اپنی بڑی بڑی ذہن روشن آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ اندر کہیں سرایت کرنے لگا تھا۔ وہ شخص اگر مطب کھول لیتا تو دنوں میں مالا مال ہو جاتا۔ ایک نظر ڈال لیتا اور صدیوں کے مریض شفا پالیتے۔ اپنی نظروں سے بس ایک نظر کا ہیہ دے کر... اس کی چیخیں مسمیٰ تھیں، درد تھا کہاں؟ وہ بھول گئی تھی۔ اب درد رہا ہی نہیں تھا، اب جب وہ سامنے تھا تو اور کچھ بھی نہیں رہا تھا، وہ خود بھی نہیں، بس وہ رہ گیا تھا صرف وہ...

گاڑی چل پڑی، وہ بند شیشوں سے سر باہر نکالنے لگی۔ شیشہ کھولا، وہ آدھی باہر نکل آئی۔ امی، خالہ نے بشکل سنبھالا۔ وہ کیسے سنبھلتی، سنبھلتے ہوئے بھی کبھی سنبھلتے دیکھے کسی نے؟

درد رچ ہوئے، درد کے احساس دور ہوئے، کیا ہوا، کب ہوا، اسے معلوم ہوا ہی نہیں۔
”بٹی ہوئی ہے ماشاء اللہ بڑی پیاری ہے“۔ خالہ اس پر جھک کر بچانے کیا کیا کہہ رہی تھیں، وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹر شاہ زیب کے موبائل کی بیل بجی تھی۔ اس نے دیکھا علی حسان کا ایس ایم ایس تھا۔ وہ اس سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ وہ میمونہ کو آرام کا کہہ کر باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ علی حسان کے ساتھ نزدیکی کیسے میں موجود تھا۔

”یار! کوئی محبت میں کس حد تک جاسکتا ہے؟“ باتوں باتوں میں ڈاکٹر شاہ زیب نے سوال کیا، اس نے جوں کا گلاس میز پر رکھ دیا۔

”ویل! ڈیوینڈ کرتا ہے کہ آپ کو کس قسم کی محبت ہے، پالنے کی چاہت ہے یا صرف دیدار سے غرض ہے، پالنے کی محبت آپ سے محبوب کا قل بھی کروا سکتی ہے اور دیدار کی غرض والی محبت میں آپ اپنا قل بھی کر سکتے ہیں“۔ وہ ذرا رکا۔

”خیر ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو محبت کا دائرہ نہیں لگ گیا؟“
”نہیں یار! وہ خاموشی سے کھانے لگا تھا۔

”نیکسٹ منٹھ میں اپنے ناول کی اوپننگ کر رہا ہوں، گرینڈ یارٹی، دھماکے دار، تجھے ابھی سے دعوت دے رہا ہوں اور ایک اجیشل کاپی تجھے پہلے ہی میل بھی کر دوں گا“۔ وہ مسکرایا۔
”توازش جناب کی“۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے سنگا خ کھڑکی سے اندر دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھ بیٹھی تھی، سر پر دوپٹہ تھا، پاس ہی بیڈ کی پائنتی کے پاس بلال بیٹھا تھا جو مسکرا مسکرا کر کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہا تھا۔ کچھ کے جواب وہ دے رہی تھی اور کچھ کے نہیں۔ اسے پاگل خانے میں آنے دو سال ہونے والے تھے اور وہ بمشکل چھ سے سات بار اس سے ملا تھا۔ اب بھی وہ ڈاکٹر شاہ زیب کے اصرار پر اندر گیا تھا۔ بمشکل چندر منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو اس کی آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں، کمرے سے باہر آتے ہی وہ دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا، بلک بلک کر بچوں کی طرح، کوئی آپ کا اپنا ہو، صرف آپ کا اپنا... پھر بھی وہ آپ کا نہ ہو تو یہ احساس مرے کو بھی مار دیتا

ہے۔ ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے کندھوں سے تھام کر حوصلہ دیا تھا۔

”میں مر جاتا ہوں جب بھی اسے اس حال میں دیکھتا ہوں، میرے اندر کچھ سواہ (راکھ) ہو جاتا ہے“۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میرے سے میرا سب کچھ لے لیں، میرا گھر، میری زمینیں، میری زندگی... سب لے لیں، پر اُسے ٹھیک کر دیں۔ بھلے وہ مجھ سے پیار نہ کرے، بھلے وہ جو مرضی کرے پر ٹھیک ہو جائے، میری جندڑی لے لیں، اسے دے دیں“۔

امراض کا علاج روپے پیسے سے ممکن ہوتا تو ہر انسان اپنے پیارے کی زندگی کے لیے سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیتا۔ بھلاس کے لیے اسے اپنا آپ بیچنا پڑتا۔

☆.....☆.....☆

”وہ بہت عجیب سی ہو گئی تھی، نہ ہنستا، نہ بولتا، نہ بات کرنا نہ بات سننا۔ بس چپ چاپ لیٹ رہتا، نہ کا کی کی پرواہ، نہ میری نہ کسی اور کی“۔ وہ ڈاکٹر شاہ زیب کو بتا رہا تھا۔

”کوئی کہتا آسب ہے، دم کروا لیجئے، ڈاکٹر کہتے ہیں ڈپریشن ہے، ہم اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتے“۔

☆.....☆.....☆

وہ پلنگ پر تنگیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی تھی، وہ اندر داخل ہوا اور اس کے سامنے جا بیٹھا۔
”تمہیں جو مسئلہ ہے مجھے بتا دو، میں حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں“۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔
”کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں“۔

”میری کوئی بات بری لگی؟“

”نہیں؟“

”اماں کی؟“ نفی میں گردن ہل گئی۔

”تو پھر اتنی چپ کیوں رہنے لگی ہو، کم کم“۔ بلال نے ہولے سے اس کے رخ بستہ ہاتھ تھام لئے۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ آنکھیں ”وہ“ آنکھیں نہیں جس جوشفا بانی تھیں، جن میں ڈوب مرنے کو دل کرتا تھا، جن کو ساری زندگی بس دیکھنے کو دل کرتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں...

”میں ٹھیک ہوں“۔ وہ بمشکل بولی۔

☆.....☆.....☆

طبیعت ذرا سنبھلی تو پھر سے چھت پر جا چڑھی، تیسرے گھر کی چھت خالی نہیں تھی۔ وہ بہت سے صفحات پھیلانے بیٹھا تھا، انھیں میں سرگیت دیا ہوا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو وہ بس اسے ہی دیکھے جا رہی تھی، یک ٹک، بغیر ہلکیں جھپکائے... ذرا جو آنکھیں بند کرتی تو وہ کھوجا تا... آسن جمائے، ٹھٹکی باندھے، ہاتھ باندھے، عشق کی نمازیں ایسے ہی تو ادا ہوتی ہیں۔ وہ داسی بنی ہاتھ باندھے کھڑی رہی اور وہ دل میں بسنے والا رنج ہوئے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھتا رہا، اسے تنکنا، منتر پڑھتا، اسے زیر کرتا رہا، وہ مسرور ہوئی مٹی، محصور ہوئی مٹی۔ موسم کی حدتیں دم توڑ گئیں، شاہیں ڈھل گئیں، اندھیروں کے قافلے آن پہنچے۔

☆.....☆.....☆

اور پھر وہ معمول بن گیا، آنکھوں میں دور بہت دور تک نکل آتا اور ڈوب جاتا... اندر اندر تک ٹوٹ جانا، چند دنوں کی بچی بھلتی اور وہ یادوں میں گم ہونے لگتی رہتی۔
”دودھ مانگ رہی ہے“ خالہ اس کے کندھے ہلاتیں۔ اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ حال سے بے حال مست تھی۔

اور اس شام جب وہ اپنی منڈیر سے لنگی تیسرے گھر کی چھت پر نظریں جمائے کھڑی تھی، بلال اور آگیا۔ وہ اسے آوازیں دیتا رہا اور وہ بے خبر کھڑی رہی۔ وہ دو گھنٹے وہاں کھڑا اسے دیکھتا رہا کہ اب تھکے گی، اب سمجھے گی پر وہ نہ تھکی... وہ کھڑے کھڑے تھک گیا، وہ آخری سیڑھی تک آیا اور تیسرے گھر پر نظر ڈالی، وہاں بھی کوئی تھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے اس کی آنکھوں میں پانی بھرتے دیکھا، ایک آنسو پلکوں کی سرحد پار کر کے اس کے گال پر لکیر کی صورت بہہ نکلا۔

”میں نے سب دیکھ لیا اس شام، میرا دل مجھے کچھ سمجھانا چاہ رہا تھا پر میں سمجھنا نہیں چاہتا تھا، کیسے ممکن تھا۔ وہ... اتنی نیک، اتنی پاک... کیسے نہیں...“ وہ لٹی میں گردن ہلاتا بول رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات تیزی سے بھگ رہی تھی۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ دور تار کی کالبادہ اوڑھے دروازے پر عجیب ہولناک دکھائی دے رہے تھے، وہ ہولے ہولے چلتا اس کے پاس آ بیٹھا۔

☆.....☆.....☆

”میمونہ...“ ہولے سے پکار کر اس نے اُس کا سر دھاتھ تمام لیا۔
”میں جو پوچھوں گا، سچ جواب دو گی؟“
وہ اسے دیکھنے لگی۔ بخور...

☆.....☆.....☆

”اس سے پیار کرتی ہو؟“ میمونہ نے نظریں جھکا لیں۔ حلقوں سے ڈھکی آنکھیں موند لیں۔
”ہاں۔“

☆.....☆.....☆

بلال کی آنکھوں میں کرب اتر آیا، اندر دور کوئی ہولناک آواز میں چلایا تھا اتنی زور سے کہ سیاہ درخت پر بیٹھی چمکاؤں کے غول دور فضا میں اڑ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

”کیوں؟“ آنسوؤں سے رندگی آواز میں کتنا عجیب سوال کیا تھا۔
”پتہ نہیں کیوں؟“ جواب عجیب ترین تھا۔

☆.....☆.....☆

”تم نے اس سے کچھ نہیں کہا جب اُس نے کہا کہ اسے کسی اور سے محبت ہے؟“
”کیا کہتا، گا، گھونٹ دیتا، کیسے گھونٹ دیتا۔“ وہ خاموش رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

”اور وہ آدی؟“
”میں اگلے دن بے غیرت بن کر گیا تھا اور اسے دھمکی بھی دی کہ آئندہ میری بیوی سے دور رہے، پر وہ زکا نہیں۔“

☆.....☆.....☆

اگلی شام وہ دونوں وہیں تھے، ایک منڈیر کے ادھر اور دوسرا ادھر... نگاہوں سے بات کرتے، سوال جواب کرتے... نظروں سے...

خالہ جب نیچے بچی کو چب کرواتے کرواتے تھک گئیں تو بمشکل اوپر آئیں اور اُن دونوں کو دیکھ کر آنکھیں اور منہ دونوں کھل گئے۔ اسے حقیقت کریںچے لے کر آئیں۔

”غیرت کر، شرم کر مونا! کسی کی بیوی ہو کر نہیں ملنے کر رہی ہے۔“ انہوں نے اسے جھجھوڑا۔
”پتھروں سے سنسار کر دیں گے گاؤں کے لوگ، ماضی کی نمازوں کی شرم کر لے، اب نماز چھوڑ دی ہے تو کیا اللہ بھی چھوڑ دیا؟ اس کا ڈر کیا بھی چھوڑ دیا؟“ وہ اسے جھجھوڑ کر کہتی رہیں، وہ سر جھکائے سستی رہی۔ پھر اٹھی، دُشو کرنے چل دی، آکر مصلیٰ بچھایا اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، اگلے ہی لمحے نماز توڑ دی اور اگلے قدموں اندر بھاگی۔

اسی رات اماں اسے سارا کچھ بتاتی گئیں، وہ ساری باتیں، وہ سارے خدشے جو وہ جانتا تھا، وہ چپ چاپ سنتا رہا، بے شرم بن کر، ہاں میں جانتا تھا میری بیوی کسی اور سے چکر چلا رہی ہے، غیرت سے مر نہ جاتا۔

☆.....☆.....☆

ویسے ہی شام ڈھل رہی تھی۔ ویسے ہی وہ دو دیوانے دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن نیلے سے ہم سخن تھے۔

بھی کوئی اسے پیچھے ہٹاتا آگے آیا اور منڈیر کے دوسری طرف اتر گیا، وہ بلال تھا۔
اس آدی کو گر بیان سے پکڑ کر پے در پے مکوں کی برسات کر دی تھی، ایک کے بعد ایک، تکبیر پھوٹ گئی، پھوٹتے رہے خون کے نیواریں، وہ پاگل ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ادھر میمونہ چلا رہی تھی۔
”اسے نہ مارو... مجھے مارو... اسے نہ مارو“

☆.....☆.....☆

لیکن وہ اسے آج ماری دینا چاہتا تھا، لمحوں میں مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔
پنچائت لگ گئی تھی، گاؤں کے بڑے بوڑھے جمع تھے، بلال اور اس کی ماں سالوں سے وہاں وہ رہے تھے، ان کی شرافت پر کسی کو شک نہیں تھا، وہ آدی جس نے اپنا نام فیضان بتایا تھا چھ ماہ پہلے اپنی ماں کے ساتھ ان کے گاؤں آیا تھا اور گرائے پر رہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

پنچائت نے بلال اور اس کی ماں کا ساتھ دیا تھا۔ فیضان کو وارننگ ملی تھی بلال اور اس کے گھر سے دور رہنے کی اور نہ تنہا کاؤمہ دار وہ خود ہوتا۔

☆.....☆.....☆

میمونہ کو بلال کچھ دنوں کے لیے ماں کے گھر چھوڑ آیا۔ وہ اسے سارا دن نصیحتیں کرتیں، مرے باپ کی شرم دلاتیں۔ وہ ایک ہفتہ ماں کی طرف رہی اور وہ ایک ہفتہ آؤش تھا دونوں کے لیے۔ وہ کبھی کم صم ہنسی رہتی، کبھی زار زار رونے لگتی۔ امی ہول ہول جاتیں اور پڑھ پڑھ کر پھوٹتیں۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے بعد واپس آئی تو سیدھی اوپر... خالہ نیچے پہنچتی رہیں پر وہ ان کو دمکا دے کر اوپر آ گئی۔ وہ اوپر ہی تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اماں بلال کو بلالائیں، وہ اسے نیچے لایا اور بیروں میں زنجیر ڈال دی۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

”زنجیر... ویسی جیسی ڈھور ڈھکروں کے ڈالتے ہیں“۔ وہ ہلک ہلک کر رو دیا۔

”وہ ہاتھوں سے، پیروں سے، دانتوں تک سے زنجیر کاٹنے کی کوشش کرتی رہتی، زور زور سے چلاتی، رونے لگ جاتی... سارا پنڈ بھٹا تھا میری بیوی پاگل ہو گئی ہے۔“

☆.....☆.....☆

اس دن وہ نجانے کیسے زنجیر کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ خالہ ماں اندر غسل خانے میں تھیں، ہانپتے کانٹے اٹھی اور باہر نکل آئی۔ تیسرے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی ماں اندر صحن میں سبزی کاٹ رہی تھیں، وہ اس کی طرف بڑھی۔

”مجھے رکھو، مجھے اپنے گھر رکھ لو ہمیشہ کے لیے“۔ وہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی اور فٹیں کرنے لگی، زور سے رونے لگی۔

”ہٹ، ہٹ“۔ اس کی ماں ہٹاتی رہی اور یہ پیروں سے لپٹتی رہی۔ اس کی ماں نے ڈنڈا اٹھایا اور اس پر برسا دیا۔

”دفع ہو جا... چل... جا...“ وہ مارتی جاری تھیں اور بھگارتی تھیں، یہ مار کھارتی تھی اور پیروں سے لپٹے جا رہی تھی۔

اف ہائے... چہ چہ... ایسی محبت... ایسا جنون... تو یہ تو یہ... ناممکن لگتا ہے ناں؟ ایسے قہوڑی ہوتا ہے، پر ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ جنون ایسے ہی کروا تا ہے، دروازے دیواریں بھلا لگ جاتے ہیں جنونی گلے کاٹ لیتے ہیں، گلے کاٹ دیتے ہیں۔

اس کی ماں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا، یہ دروازے سے لپٹ لپٹ کر روتی چلاتی رہی، آوازوں پر خالہ اماں آئیں۔ زخموں سے چور چور، حال سے بد حال، بکھرے بال... خونم خون چہرہ... پھٹے کپڑے... مٹی مٹی... بوڑھی جان بمشکل اسے لئے گھر تک لائیں پر عزت کی جودھجیاں وہاں بکھری تھیں وہ نہ اٹھا سکیں۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے پانی کا گلاس بھرا اور اس کی طرف بڑھایا، وہ گلاس تھا اسے سر جھکائے بیٹھ گیا، جیسی باہر شور ہوا، ہانپتی کانپتی ترس اندر آئی۔

”رُوم نمبر 21 کی پیسٹ کو دور در پڑا ہے۔“

وہ دونوں تیزی سے باہر کی طرف بھاگے تھے۔ اس وسیع کوریڈور کے آخری کونے میں سنگلاخ کھڑکی کے اس پار وہ بیٹھ پڑھی۔ ویسے ہی زبوں حالی کا شکار، بکھرے بالوں اور حلقہ زدہ آنکھوں والی میمونہ بلال۔ ترسیں اسے سنبھالتے سنبھالتے تھک گئی تھیں۔ بلال ڈاکٹر شاہ زیب کے ساتھ کمرے تک آیا تھا لیکن دروازے پر پہنچ کر وہ رک گیا اور بلال کو اندر کیا۔ اُس لمحے اسے سیمپا سے زیادہ محبت کی ضرورت تھی، سکون اور ادویات اور انجکشن کی بجائے محبت کے دو بول، تحفظ بھری چھایا کی ضرورت تھی۔

چونکھٹ میں کھڑا بلال فاروق ذرا اچھکیا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

”مجھے آگ سے بچالو، میں مرجاؤں گی، اس آگ کو بجھا دو۔“

وہ اس کے پاس آیا اور اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے گالوں پر بچے آنسوؤں کو نرمی سے صاف کیا اور اس کے ہاتھ تھام کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کا بے قرار دھڑکنے والا دل اس کے سینے میں دھڑکنے لگا تھا، ہولے

ہولے اس کے سر میں انگلیاں چلاتا، اس کے بال سہلا تا وہ اسے خاموش کر دیا چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھر آیا تو دروازے میں وہ لفافہ بڑا تھا، کوریئر سے ارسال کردہ کارڈ علی حسان کے نئے ناول کی تقریب رونمائی کا تھا۔ بھی اس کے موبائل کی پیپ بجی۔

”ناول کی ایک کاپی تجھے میل کر دی ہے میری جان!“

شکریہ لکھ کر اس نے جوابی پیغام ارسال کیا تھا۔

اگلے دن جب وہ سیشن کے لیے کمرہ نمبر 21 میں آیا تو وہ کل کی نسبت بہتر حلیے میں تھی۔ بلال کے لائے کپڑے وہیں پڑے تھے۔

”کیا حال ہیں مسز بلال؟“ وہ ہلا جھک اس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔

”کل تمہارے شو پر آئے تھے، بل کر کیسا لگا؟“

وہ بنا جواب دیئے فرش پر انگلیوں سے لکیریں بناتی رہی۔ ہولے ہولے خاموشی سے، طویل خاموشی کے بعد وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”میں اس کے قابل نہیں ہوں۔“

☆.....☆.....☆

وہ سردیوں کے دن تھے، سر شام ہی برقی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ دھندلے پن پر پھیلا لیت تھی، وہ اسے اندر ہی رکھتے تھے۔ بچی اب ہر وقت اپنی دادی کے پاس رہتی تھی، میمونہ کی امی بھی اب زیادہ وقت ان کے ہاں رہتی تھیں۔

یہ اُن سرد راتوں میں سے ایک رات کا قصہ ہے جب سرد ہواؤں اور برقی اذیت ناک سردی سے گھبرا کر ہر ڈی ٹیس اپنے اپنے گھر میں مقید ہو چکا تھا، رات کے نجانے کون سے پہر بلال کی آنکھ کھلی تو وہ بلیک پر نہیں تھی۔

وہ اٹھا، لائٹ جلائی وہ کمرے میں نہیں تھی۔ باہر آیا، صحن، دوسرا کمرہ، چھت... وہ کہیں نہیں تھی۔ بھی اس کی نظر بیرونی دروازے تک گئی، وہ کھلا تھا، وہ باہر نکل آیا۔

شال اور جرسی سے بے نیاز وہ باہر نکل آیا تھا، ٹھنڈ کے تھپڑے اندر تک روح پکھلا دیتے تھے اور اسے پسینے آ رہے تھے، گلیاں خالی، ہر گھر کا دروازہ مقفل، وہ بے قراری کے عالم میں خالی سنان گلیوں میں اسے ڈھونڈتا پھرتا رہا... پھر وہ اسے نظر آ گئی۔

مجد کے دروازے کے پاس، اس برقی سیاہ تاریک رات میں وہ دوپٹے جوتوں سے بے نیاز مسجد کے آہنی دروازے کے پاس زمین پر بیٹھی تھی، دھند میں لمبوں اس دروازے کو تھا ہے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”تو ہر ایک کی سستا ہے۔ جو تجھے سناے اس کی بھی اور جو تجھے نہ سناے اس کی بھی۔ تو دلوں کے راز جانتا ہے۔ تو ہر ایک کی جھولی بھردیتا ہے۔ جو تجھ سے مانگے اسے بھی اور جو نہ مانگے اسے بھی تو خالی ہاتھ نہیں لوٹا تا، تو بھرتا جاتا ہے، میری جھولی بھی بھر دے... مجھے بھی وہ دے دے۔“ رات کے اس تاریک سناٹے میں اُس کی سسکیاں باز گشت بن کر گونج رہی تھیں۔ مسجد کا دروازہ تھا وہ ہلک رہی تھی۔ وہ مانگنے آئی تھی، اس سے جو مانگنے سے پہلے ہی عطا کر دیتا ہے۔ اس لمحے جب عبد اور موجود کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہوتا، تب وہ آئی تھی،

☆.....☆.....☆

وہ رات کا کھانا کھائے بغیر لیٹے چلا گیا تھا۔ دل بہت بوجھل تھا۔ ذہن میں میمونہ بلال کی باتیں چل رہی تھیں، یونہی سوچتے سوچتے اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور میلر چیک کرنے لگا، علی حسان نے ناول کی کاپی ارسال کی تھی، اس نے میلر کھولی۔

”وہ نمازوں کی پابند لڑکی

اس کی نظروں نے چن لیا کافر“

ابتدائی صفحے پر لکھے شعر نے اسے چونکا دیا، نظروں کے سامنے نمازوں کی پابند میمونہ بلال اور اس کا کافر عشق آ گیا۔ وہ دیر سے دیر سے پوری تحریر پڑھتا گیا، آخری ہیج پڑھنے کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو حیرانگی عروج پر تھی، دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا اور پورا وجود پسینے میں ڈوبا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور بلال کا نمبر ملایا۔

”پھر وہ آدمی کہاں گیا بلال؟ فیضان؟“ ابتدائی باتوں کے بعد اس نے سوال کیا۔

”پتہ نہیں ڈاکٹر اس رات کے بعد وہ اور اس کی ماں گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“

☆.....☆.....☆

عشق کا فسون زائل ہوا تو اسے لگا وہ جلتی دھوپ میں کھڑی ہے۔ واپسی کا سفر آسان نہیں تھا، بلکہ وہ جس مقام پر تھی وہاں سے واپسی شاید ممکن ہی نہیں تھی۔ احساس عداوت اور پشیمانی اسے ہر وقت گھیرے رکھتے تھے، دنوں میں اس کی صحت گر گئی، حلقے بڑ گئے، جنون حد سے بڑھ گیا، وقت بے وقت وضو کرتی اور کرتی چلی جاتی... جائے نماز دیکھتی رہتی۔ کبھی جو بچھتا کوئی تو جھپٹیں مار مار کر ہلانک ہو جاتی۔ کبھی روتی تو بس روتی رہتی... چھ مہینے میں وہ مکمل کئی۔ کمزور، بیمار اور پاگل... بچی پر دو تین دفعہ حملہ کیا تو پاگل خانے میں داخل کروادی گئی، بے چاری میمونہ بلال...

☆.....☆.....☆

وہ بیڈ پر بیٹھی تھی جب ڈاکٹر شاہ زیب اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا شاہرینڈ پر رکھ دیا اور خود پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

”موننا! طویل خاموشی کے بعد وہ بولا تھا۔

”غلطی ہاں ہم سب سے ہو جاتی ہیں، گناہوں بھری دنیا میں گناہوں سے بچ جائیں تو فرشتے نہ ہو جائیں، لیکن اگر ہم فرشتے نہیں تو ابلیس بھی نہیں کہ گناہوں کے بعد مایوس ہو جائیں۔ ہم اسی لئے ابلیس سے بڑھ کر ہیں کہ گناہ کے بعد توبہ کر لیتے ہیں اور اس طرح ہم فرشتوں سے بھی افضل ہو جاتے ہیں۔“ وہ ذرا رکا۔

”نئی ابتدا تو کرو، نیا آغاز، نئی زندگی تمہاری منتظر ہے۔“ وہ بے بسی بیٹھی رہی۔

”اس کے در پر بیٹھ کر میں نے نمازوں کا اجر مانگا تو بدلے میں مجھے زنا کی دعوت ملی، میری عبادتیں اس قابل تھیں، مجھے یہ بات جینے نہیں دیتی۔“ وہ اسے دیکھتا رہا۔

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے وہ تمہاری نمازوں کا اجر ہو ہی نہیں، وہ تمہارے گناہوں کی سزا ہو، وہ تمہاری طرف سے گناہوں کا کفارہ ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری نمازوں کا اجر اس قابل ہو ہی ناں کہ اس ناپاک دنیا میں اتارا جا سکے، ہو سکتا ہے وہ نور ہو، ہو سکتا ہے وہ جنت کی صورت میں تمہارا منتظر ہو۔“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میمونہ بلال اللہ کو اتنی پیاری ہو کہ اس کے گناہوں کو اللہ نے اوپر جانے ہی نہیں دیا، میمونہ بلال کے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی دے دی گئی ہو کہ آخرت میں وہ اس کی بارگاہ میں صرف نیکیاں لے کر جائے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ناں۔“ میمونہ بلال کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

”غور اور نافرمانی ابلیس اور انسان دونوں کی مشترکہ خصوصیات ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ انسان غرور اور نافرمانی کے بعد مایوس نہیں ہوتا، وہ رحمت سے امید لگا لیتا ہے اور یہی فرق اسے برتر کرتا ہے، اور تم تو اللہ کی اچھی بندی ہو، نیک... پرہیزگار... صرف اس سے ڈرتی ہو، صرف اس سے پیار کرتی ہو۔“ وہ رو پڑی۔

”میں اس سے پیار کرتی ہوں، لیکن وہ مجھے اپنی طرف بلاتا ہی نہیں، میرا دل اس کی طرف جانے کو ہمتا ہی نہیں۔“

وہ آگے کو ہوا اور سر گوشی میں بولا۔

”کیا خبر وہ تمہاری طرف سے پہل کا منتظر ہو، کیا خبر وہ تم سے چاہتا ہو کہ شکست دید و مایوسی کو، کیا خبر وہ تمہارے قدم کے بڑھنے کے انتظار میں ہو، کیا خبر وہ توبہ سننا چاہتا ہو۔“ وہ اٹھا، شاہرینڈ میں سے کچھ نکال کر زمین پر بچھا دیا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

زمین پر جائے نماز بھی تھی۔

وہ ابتدا کی، میمونہ بلال کی طرف سے پہل... مایوسی کے سنگلاخ پہاڑ کی طرف پہلا کاری وار... ابلیس کے خلاف پہلی صدا...

ہاں میں تم سا تو نہیں، میرا اتنا رجم و کریم موٹی ہے، میں مایوس کیوں ہوں؟ اسے پتہ ہے راستہ کسٹھن ہے، اسے پتہ ہے راستے میں کئی دشواریاں ہیں، اسے پتہ ہے میں کمزور ہوں، اسے پتہ ہے مجھے جھٹکنے کی عادت ہے، اسے پتہ ہے... لیکن اسے یہ بھی پتہ ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ وہ رحمان ہے، اسے پتہ ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ وہ معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ اسے سب پتہ ہے، تو بس میں بھٹکا ہوا ہوں تو کیا ہوا، ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ہے، مدد اس سے مانگ لی ہے، اب مایوسیوں کی خیر نہیں، اب ڈر کی بات نہیں، اب پار لگنے کا وقت ہے۔

وہ مسکرا رہا تھا اور وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اُٹھ کر بے ریا آنسو، مایوسیوں کی سیاہی مٹا دینے والے، شہنشاہوں کے شہنشاہ کو منانے والے ہیرے موتی جیسے آنسو۔

وہ نہیں مانگا عبادتیں، لمبے لمبے جہدے، وہ نہیں مانگا صدیوں کی ریاضتیں، اسے کوئی غرض نہیں غرور و تکبر سے تنے ماتھے پر سجدوں کے نشان سے، وہ بے نیاز ہے سردیوں اور گرمیوں کی تبدیلی سے، وہ تو دلوں میں رہتا ہے، وہ تو عاجزی پسند کرتا ہے، دلوں کو آباد رکھو، وہ ہمیں آباد رکھے گا۔

یاد رکھو! غرور کا ایک لمحہ صدیوں کی عبادتیں راہ کر دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

اسی دن شام کی فلائٹ سے وہ کراچی آ گیا تھا۔

علی حسان اسے گھر پر ہی ملا تھا، ویسی ہی گرجوئی سے جیسے وہ ہمیشہ ملتا تھا لیکن وہ گرجوئی آج ڈاکٹر شاہ زیب کے اعزاز سے مفقود تھی۔

”میرے گھر کو چار چاند لگ گئے جو ڈاکٹر شاہ زیب میرے گھر تشریف لائے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ

رہا تھا۔
 ”ہاں... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں کیا کہہ کر پکاروں میرے دوست۔“ وہ ہولے ہولے چلا
 اس کے سامنے اکھڑا ہوا اور اسے دیکھنے لگا۔
 ”علی حسان... دی گریٹ رائٹر۔“ وہ ڈراؤں لگا۔
 ”یا پھر فیضان مظفر... ایک اہل ہوا کم ظرف انسان۔“ ڈاکٹر شاہ زیب کی بات پر اس کی بڑی بڑی روشن
 آنکھوں میں حیرانی اتر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسے ایک کہانی کی تلاش تھی۔
 ایک ایسی کہانی جو ہر پڑھنے والے کو اندر تک ہلا دے، ہر کہانی سے ایک منفرد ایک ایسی منفرد کہانی جو اپنی
 مثال میں بے مثال ہو اور ایک ایسی داستان جو اسے راتوں رات شہرت کے آخری آسمان کے بھی اوپر لے
 جائے۔ اسی کہانی کی تلاش میں وہ گاؤں گاؤں، شہر شہر بھٹکتا پھرتا تھا۔ نام بدل بدل کر اور اسے اپنی کہانی مل گئی۔
 اپنی کہانی کا مرکزی کردار مل گیا، اس شام جب وہ چھت پر موجود تھا وہ لڑکی اسے دکھائی دی جو انتہائی جذب سے
 اسے دیکھ رہی تھی، وہ بھی اسے دیکھتا رہا۔ اگلی شام وہ پھر آئی تو وہ چھت پر چھپ گیا، وہ بے قراری سے اسے
 ڈھونڈتی رہی۔ وہ روز یونہی کرتا، چھپ کر اسے خود کو کھوجتے دیکھتا، پھر اس روز وہ اسے دروازے کی حالت میں
 ملی۔ اسے دیکھتے...
 ایک دلچسپ کہانی تھی جو غنی چلی گئی۔ ایک لڑکی جو کسی اور کی تھی اور کسی اور کی ہونا چاہتی تھی، پھر کافی
 دنوں بعد وہ اسے چھت پر ملی تو وہ اس کے پاس چلا گیا، وہ نظریں جھکائے بنا اسے سمجھتی رہی اور وہ
 اسے... اس کی نظروں میں سے کہانی کے لفظ چتر رہا اور صفحے بھر گیا... لفظ ملتے رہے، کردار جڑتے
 گئے اور کہانی بنتی گئی۔ وہ لڑکی، اس کا شوہر... اور وہ خود... معاملہ بڑھ گیا۔ اس لڑکی کے شوہر سے وہ
 پٹ بھی گیا۔ ایک عورت کو کچھ پیسے دے کر اس نے ماں کا کردار کر دیا، اور اس رات جب وہ اسے مسجد
 کے پاس ملی، وہ اسے ساتھ لے آیا۔ وہ اب کلائیکس (عروج) چاہتا تھا۔ انتہا تک لیکن نجانے کیسے وہ
 لڑکی واپس پلٹ گئی۔ پر خیر تھی۔ انت وہ خود بھی کر سکتا تھا۔ اس نے بوریا بستر باندھا اور راتوں رات
 گاؤں چھوڑ دیا، انت بن لیا اور دلچسپ داستان تیار ہو گئی، مسودہ پڑھنے کے بعد کئی پبلشنگ ادارے وہ
 ناول چھاپنے پر تیار ہو گئے، پروڈیوسر سے بات ہوئی، کروڑوں کے بجٹ کی فلم کے لیے سیٹ لگ گئے،
 شہرت نزدیک تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شاہ زیب نے اس کی ساری کتھا خاموشی سے سنی تھی اور بغور اسے دیکھا تھا۔
 ”تو کٹھی (افسوس زدہ) نہیں ہے؟ تجھے ذرا بھی افسوس نہیں؟“ علی حسان ذرا چپ ہوا۔
 ”اب کٹھی ہونے کا فائدہ؟ جو ہونا تھا ہو گیا، کہانی تیار ہے اور...“ اس نے بات کاٹ دی۔
 ”کسی کی زندگی پر یاد کر کے کہانی بنا کر تو کہہ رہا ہے افسوس کا کیا فائدہ۔ ٹھیک ہے وہ ہاتھ بڑھا رہی تھی تیری
 طرف، تو جھٹک دیتا۔“ وہ خاموش رہ گیا بھی ڈاکٹر شاہ زیب ہولے سے ہنسا تھا۔
 ”ہاں تو بھی کیا کرتا، تو بھی تو کھٹکتی تھا۔“ تقدیر کے ہاتھ میں تھیں تیری ذریعہاں، تو خوش تھا کہ لڑکی جال میں

رداؤ انجسٹ 188 مارچ 2016ء

پھنس رہی تھی، جال میں تو تو پھنس رہا تھا، کسی دوسرے کی کہانی لکھ کر بیٹھ گیا ہے تو اور جو تیری زندگی کی کہانی لکھی
 جا چکی اس کا کیا؟“ علی حسان ششدر رہ گیا تھا۔
 ”وہ مرجائے گی، زندوں میں وہ اب بھی نہیں، پاگل پن کے عروج پر ہے اور تو کہہ رہا ہے افسوس کا کیا
 فائدہ؟“ وہ ذرا خاموش ہوا۔
 ”اسے تو یہ سب سزا میں ملا میرے دوست! لیکن تجھے سزا ملنی ابھی باقی ہے، اس کی تو یہ فصل تھی اُس نے
 کاٹ لی، لیکن تو نے تو ابھی بوٹی ہے، تو نے تو ابھی کاٹنی ہے۔“

☆.....☆.....☆

کراچی سے واپس آنے کے بعد دوسرا ضروری کام اس کے ذمے تھا جس کی ادائیگی کے لیے وہ بلال سے ملا
 تھا۔
 ”مجھے تانیہ سے ملنا ہے، تانیہ سے...“
 بلال جی بھر کر حیران ہوا۔ (پاگلوں کا ڈاکٹر پاگل تو نہیں ہو گیا؟)
 ”وہ تو جی مر گئی۔ کب کی...“

ڈاکٹر شاہ زیب مسکرایا اور میمونہ بلال کے ذریعے ملنے والی ساری معلومات اسے دے دیں۔ اگلے دن وہ
 بلال کے ساتھ گاؤں آیا تھا۔ میمونہ رئیس کے گھر، اس وسیع آنگن والے گھر جس کے ایک کونے میں آم کا پڑ
 اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا۔ بنریوں کی کباریاں اجڑ گئی تھیں، پھولوں کے پودے مرجھا گئے تھے، وہاں اب
 میمونہ تھی، نہ تانیہ... صرف اداسی اور ویرانی، ہونا کی امی اور رشتے کرانے والی اماں کے ذریعے اسے تانیہ کے
 گھر کا پتہ چلا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اس نے اپنے کئے کی فصل کاٹ لی، تو نے ابھی بوٹی ہے تو نے ابھی کاٹنی ہے۔“ لفظ بازگشت بن کر اس
 کے کانوں میں بھٹکے پیسے کی مانند اتر رہے تھے۔ تاریک کمرے میں ہولے سے نمودار ہو رہے تھے۔ حلقوں سے
 ڈھکی بے جان سی آنکھوں والی لڑکی... ننھا سنا زک دھڑکتا دل... وہیں آس پاس تھا۔
 ”عظمتی نہیں گناہ ہوا ہے تجھ سے... کفارہ اور توبہ ابھی واجب الا داپیں۔“ ڈاکٹر شاہ زیب نے اسے جانتے
 ہوئے کہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں، یہ ساری شورش، سارا کھڑاگ جس شہرت کے لیے تھی وہ چہلچوں کی دوری
 پر تھی۔ اب اس کے نشوونے کی باری تھی، اب افسردگی کی لہر اسے ڈبوئے پر تلی تھیں، اتنی لمبی مسافت کے بعد
 جب گرج کی عمارت کے اونچے مینار دکھائی دینے لگے تھے تو وہ جھٹکنے لگا تھا۔ اب پاؤں زخموں سے بوجھل تھے اور
 قدم ڈمگمانے لگے تھے۔ کچھ چھین کر دکھائی ملے ہیں۔ خسارے ہی ہاتھ آتے ہیں۔ اس نے پاس رکھی کتاب
 اٹھائی۔

ایک لڑکی کا ادھر سا سا کچھ جس کی صرف آنکھیں عریاں تھیں اور باقی چہرے پر غائب تھا۔ بے قراری کے
 سمندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔

رداؤ انجسٹ 189 مارچ 2016ء

”کیا تم واقعی گھٹی نہیں؟“ اب کی بار سوال کرنے والا وہ خود تھا اور جواب دینے والا اس کا ضمیر جو اب بھی مرا نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

نیم تاریک کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی کی ایک باریک سی کرن اندر داخل ہوئی، اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر جھکنا بھول گئی، ایسے جیسے اندر داخل ہونے والے وجود نے اس پر کوئی سحر پھونک کر اسے اسیر کر دیا ہو، وہ ایک تک اندر آنے والے کو دیکھتی رہی۔ لمبے گزرتے گئے اور نظریں نہٹنے لگیں، آنے والے ذی نفس نے اندھیرے سے روشنی میں قدم رکھا اور اپنے لیوں میں مقید الفاظ فضا میں آزاد کیا۔

”آئی...!“

اس نیم تاریک کمرے میں اسیر، ہوش و حواس کی دنیا کی سرحد کے اُس پار بھٹکنے والی لڑکی جیسے خواب سے جاگی اور تیزی سے اپنے بستر سے اتر آنے والے وجود کے قدموں میں جا بیٹھی، ہاتھ جوڑے، سر جھکائے، روتے ہوئے۔

معافی مانگتی ہی پڑتی ہے۔ آج ماگ لیں یا صدیوں بعد۔ آج ماگ لیں گے تو شاید آنے والی صدی میں ملنے والی تکالیف اور مصائب سے بچ جائیں۔

آنے والی اس کے پاس فرش پر بیٹھ گئی اور اس کے بندھے ہاتھ کھول دیئے۔
”مجھے معاف کر دے تانی! مجھے معاف کر دے، میں نے تجھے برباد کر دیا۔“ تانی نے اس کے آنسو صاف کیے۔

”میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا آپ! جو برباد ہو جاتی، چند غلطیاں کیں اور پھر ان کی سزا بھی کاٹ لی۔ باپ کو دیا، ماں اور بہن بھی... سزا کاٹ لی تو پھر آگے سختیاں کیوں ملتیں؟ محبت کرنے والا شوہر مل گیا، عمر میں چاہے جتنا بھی بڑا ہو مجھ سے مخلص ہے، میرے لئے یہ کافی ہے۔ دو بچے بھلے مجھ سے چند سال چھوٹے ہیں اور مجھے ماں نہیں کہتے لیکن ماں سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔ آپنی آدم غلطی کر کے جنت سے نکال دیئے گئے تھے لیکن توبہ کے بعد زمین پر خاندان کی صورت میں جنت سے ہی نوازے گئے تھے ناں تو پھر مجھے جنت کیوں نہ ملتی آپنی؟“ وہ بوٹی چلی گئی۔

”مجھے کوئی گلہ نہیں۔ میں نے سب کو معاف کر دیا ہے۔“

نیم تاریک کمرے میں روشنیاں بھگتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

دو دن بعد کتاب کی رومانی کی تقریب تھی۔ دوسری طرف فلم کی شوٹنگ کے لیے سیٹ لگ چکا تھا۔ ان حالات میں اس کا مطالبہ سن کر ہر بندہ اسے باگل ہی سمجھا تھا بلکہ باگل سے بھی اگلی تھے۔
”مجھے کوئی بک پبلش کروانی ہے نہ ہی فلم وغیرہ۔ ہر شے کینسل کر دیں۔“

پبلیشنگ بورڈ، پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز حیران۔

”کارڈ چھپ کر تقسیم بھی ہو گئے ہیں، ناول کی ایک لاکھ کاپیاں چھپ گئیں ہیں، اب کینسل کا مطلب ہم

رواۃ انجیل 190 مارچ 2016ء

سب کا دیوالیہ ہے مسٹر علی حسان!“ ہر بندے نے اسے اپنے طریقے سے سمجھایا پر وہ نہ مانا۔ کامیابی تک جانے کا زینہ اب اسے رومی کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ جب وہ نہ سمجھا تو وہ قانون درمیان میں لے آئے۔ ایگریمنٹ یاد کروائے۔ اسے سب یاد تھا، کورٹ کچھریوں کی باتیں، وہ ایگریمنٹ توڑ رہا تھا بدلے میں اسے کروڑوں کا ہرجانہ ادا کرنا پڑتا۔

اس کے حصے یہ کفارہ آیا تھا۔

گھر بچ دیا، گاڑی، زمینیں... پائی پائی ادا کر کے جب وہ فارغ ہوا تو خالی دامن تھا، وہ سب جو بنانے میں سترہ سال لگے، سترہ گھنٹوں میں بک گیا۔ پبلیشنگ کینسل ہو گئی، ایک لاکھ کا پیزا اسے مل گئیں، بدلے میں سب چھن گیا۔ اوپر آسمان رہ گیا اور نیچے زمین۔ وہ مسکراتا رہا۔ دنیا بچ کر آخرت خرید لیتا کھائے کا سودا نہیں ہوتا، وہ خاموش کھڑا بجز بھڑ جلتے ورق دیکھتا رہا، قرض ادا ہوئے۔

☆.....☆.....☆

میمونہ بلال کی ذہنی حالت تیزی سے بہتری کی طرف گامزن تھی۔ وہ ریکور کر رہی تھی۔ ہر شے ٹھیک تھی جب وہ اُس دن اپنے کمرے میں بے ہوش ملی۔

برین میں بننے والا ٹیومر پھٹ چکا تھا، انتہائی سیریس حالت تھی، اسے فوری طور پر ایمر جنسی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

بلال گاؤں سے آ گیا تھا۔ آپریشن تھیر میں سرجری چل رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہ زیب اسے تسلیاں دیتا رہا تھا تبھی i.c.u کے دروازے سے ڈاکٹر دانیال باہر آئے تھے۔

”We did it“ (ہم نے کر دکھایا)۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے پرسکون سانس فضا میں آزاد کی۔

”خطرے سے باہر ہیں اب۔“

وہ دیہاتی بے ریا انسان ڈاکٹر شاہ زیب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اس کے وجود سے لپٹی ممکن قطرہ قطرہ دھلنے لگی تھی۔ وہ عام سا انسان تھا لیکن بہت خاص تھا۔ اس کے پاس جمہولی بھرپور عزم اور نمازیں چاہے نہیں تھیں پر بہت انمول اور بہت پیارا دل تھا جس میں غلوں بھری محبت تھی۔ وہ آزمائشوں کی بھی سے کندن بن کر نکلتا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ہولے ہولے چلا اس لیے کوریڈور کے آخری کونے میں بنے کمرہ نمبر 21 کے سامنے آ کر رک گیا تھا۔ اپنی چالی والی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی تو اندر لگی سی روشنی تھی۔ نیچے فرش پر چائے نماز بھی ہوئی تھی جس پر وہ تشہد میں بیٹھی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے دوپٹے میں خود کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے، وہ وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔

اس نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے، کافی دیر دعا مانگنے کے بعد وہ ہولے سے اٹھی اور جائے نماز تہہ کر کے بیڈ پر رکھ دی بھی کسی احساس نے اسے مڑنے پر مجبور کیا تھا۔

رواۃ انجیل 191 مارچ 2016ء

ایکسپریٹ مہندی



مہندی کے بہتر نمونہ،
نت نئے اور پرکشش ڈیزائن!

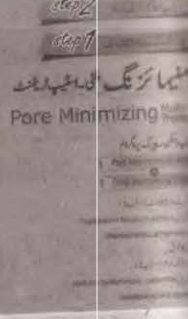


ایکسپریٹ
دلی
میک اپ

پاکستان میں پہلی بار کورین ٹیکنالوجی کا شاہکار

3D

فیشنل



35833929-35833930

زمرہ

34977970-34977972

گلشن اقبال

36636824-36636825

نارنگہ ٹائم

36707479-36707480

نارنگہ آباد

Website: www.roseparlour.com

روز بیوٹی پارلر

کھڑکی میں وہ کھڑا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں جن میں اول روز کی طرح دیپ روشن تھے۔ ذہانت کے ٹھانڈے سمندر میں فسون کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔

میونہ بلال نے جلدی سے دوپٹہ کھینچ کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ سارا چہرہ ڈھک گیا۔ آنکھیں عریاں رہ گئیں جو ایک نظر ڈال کر جھک گئیں، نہ دل دھڑکا اور نہ کچھی چھائی۔ زمانہ جاہلیت گزر گیا تھا، وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر دیپ جلاتی اُن نگاہوں سے آنسو نال پڑے۔

”مجھے معاف کر دو“۔ اندر خاموشی سی چھا گئی۔

”معاف کر دیا“۔ معافی کے چند سکے اس کی خالی جھولی میں پھن سے آگرے اور وہ مالا مال ہو گیا۔ بس ہر مرحلہ طے ہوا۔ داستانیں رقم ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد وہ ویسے ہی چہرہ ڈھانپے، اس دیہاتی انسان کے ساتھ ہسپتال سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھی، اس نے پاس کھڑے ڈاکٹر شاہ زیب کو دیکھا۔

”انت میں نے ڈھونڈ لیا ڈاکٹر، آخر میں سچی محبت جیت گئی“۔

ڈاکٹر شاہ زیب نے دور جاتے راستے پر اسے دیکھا جو بلال کا ہاتھ تھا جسے جاری تھی اور مسکرا دیا۔

”واقعی انت یہی ہوا، سچی محبت ہمیشہ کے لیے جیت گئی“۔

☆.....☆.....☆

نئی زندگی کی ابتدا تھی۔ صفر سے...

وہ چھوٹا ساقیٹ تھا، ایک چھوٹا سا کمرہ، ڈرائنگ روم اور ایک طرف کچن۔ ڈرائنگ روم میں ایک طرف رکھے صوفے پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا اور گود میں ایک رجسٹر جس پر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے اندر آتی ہوا رجسٹر کے صفے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہی ہوا دور بہت دور فاصلہ طے کرتی اس صحن میں بھی اتری تھی جس کے وسط میں نیم کا درخت تھا۔ وہ چار سال کی گول منڈل سی بیٹی تھی جس کے ساتھ اتنیس تیس سالہ وہ لڑکی تھی جو شرارتی آنکھوں سے مسکراتی ہوئی نیم کے درخت کے پاس خاموشی سے چھپی کھڑی تھی۔ اس صحن میں تیسرا انسان وہ مرد تھا جو آنکھوں پر پٹی باندھے ہاتھ اٹھائے ان کو ڈھونڈ رہا تھا۔

”پکڑ لیا“۔ وہ اندازے سے درخت تک آیا اور پچی کو جکڑ لیا اور گود میں اٹھا لیا۔ فضا بھٹی کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ ہولے ہولے چلتی ہوا اس ہسپتال کے نیم تاریک کمرے میں بھی سر کے بل داخل ہوئی تھی جس کی دیوار سے ٹیک لگا کر وہ اٹھارہ انیس سال کا لڑکا بیٹھا چلا رہا تھا اور اس کے پاس نزدیک زمین پر وہ ڈاکٹر بیٹھا اسے دلا سہ دے رہا تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے جس سے گھبرا کر اسیر ہوا باہر مکلی فضا میں آزاد ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رکشہ والہ

آفس سے نکلے ہی گھور سنائے نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایک کال سینٹر میں دوسری شفٹ میں جاب کرتی تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ لیٹ ہو گئی تھی۔ عموماً وہ 8 بجے تک فارغ ہو جاتی تھی۔ آج اس کی کو لیگ ایمان کا برتھ ڈے تھا۔ کال سینٹر میں ایمان ہی اس کی واحد دوست تھی پوری ٹیم نے مل کر ایمان کو سر پر اتار دیا تھا۔ اس نے گھر فون کر کے امی کو تھوڑا لیٹ آنے کا بتا دیا تھا لیکن کراچی کی حالات کی وجہ سے وہ جلدی نکلنا چاہ رہی تھی۔ ایمان نے پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ سب کو ڈنر کی ٹریٹ دے رہی ہے اور دوست ہونے کے ناطے راین کو ضرور ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ مجبوراً راین کو ڈنر تک رکنا پڑا۔ آفس سے ڈنر کے فوراً بعد نکلنے والوں میں وہ چلی تھی۔ ورنہ پارٹی تو ابھی چل رہی تھی۔ باہر نکل کے اسے صبح معنوں میں وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ ان کا آفس ایک پوش علاقے میں تھا اگر وہ آفس کی گاڑی کا انتظار کرنی تو مزید ایک گھنٹہ لگتا کیونکہ باقی سب تو پارٹی میں مصروف تھے اور گاڑی اسے اکیلی کو لے کر نہیں جاتی۔ اس لیے اس نے رکشے میں جانے کا سوچا۔ آفس چونکہ پوش علاقے میں تھا اس لیے رکشے وغیرہ کے لیے تھوڑا آگے جانا پڑتا تھا۔ بہت دیر کھڑے رہنے کے باوجود بھی کوئی رکشہ نہیں رک رہا تھا۔

”اف اوه گھر میں امی ابو پریشان ہو رہے ہوں

گے۔ آج بہت ڈانٹ پڑے گی۔“ وہ عجیب پریشانی میں گرفتار تھی بہت مشکلوں سے انہوں نے اسے جاب کی اجازت دی تھی۔ ورنہ وہ اس کی پڑھائی کے بعد اپنے اس اکلوتے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ابھی وہ واپس آفس جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک رکشہ اس کے قریب آ کر رک گیا۔

”کہاں جانا ہے باجی!“ رکشے والے نے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا لفظ بمشکل اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے۔

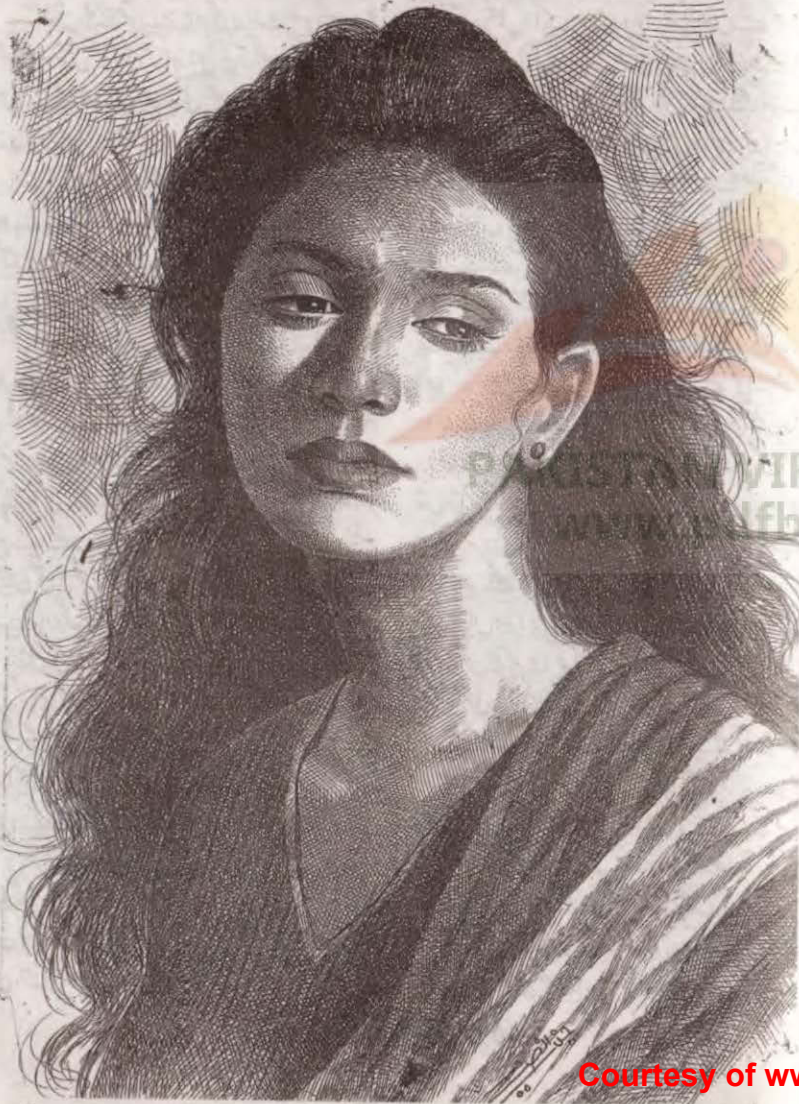
”قیوم آباد کا کہہ کر وہ جلدی سے رکشے میں بیٹھ گئی۔

مبادیہ واپس نہ چلا جائے۔

رکشے میں بیٹھ کر اسے تسلی ہوئی۔ وہ رکشے والے کا جائزہ لینے لگی عجیب بے ترتیب سا حلیہ تھا۔ لمبی سی داڑھی میلے سے کپڑے، کار کا پیچھے کا حصہ کالا ہو رہا تھا۔ ابھی وہ اس کا معائنہ کر رہی رہی تھی کہ فرنٹ مرر پر اس کی نظر پڑی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا راین نے فوراً نگاہوں کا زاویہ بدل دیا اور رکشے سے باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔ چونکی اس وقت جب رکشے والے نے رکشہ سائیڈ میں روکا۔

”ابھی دو منٹ میں آیا باجی۔“ کہہ کر وہ وہیں بنے ایک پان کے کیمین کی طرف بڑھ گیا۔ نہ جانے کیمین والے سے کیا باتیں کر رہا تھا تھوڑی دیر میں ہاتھ میں پان لیے وہ واپس آ گیا۔ اس کی اس کارروائی نے راین کے ذہن میں وہ خبر تازہ کر دی

نہر شہد



جو پچھلے ہفتے ٹی وی پر چلی تھی۔ جس میں ایک رکشے والے نے ایک عورت کو اغوا کیا تھا اور بعد میں عورت کی لاش کچرا کنڈی سے ملی تھی۔ یہ واقعہ یاد آتے ہی اس کی سٹی کم ہو گئی۔ رات کے سناٹے میں گاڑیاں ایسے چل رہی تھیں جیسے گاڑیوں کا سمندر بہہ رہا ہو۔ گاڑیوں کے شور کے علاوہ دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ ایسے میں ایکدم ”ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے“ کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ رکشے والا فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

”ہاں بس میں راستے میں ہوں۔ سواری ساتھ ہی ہے۔ قیوم آباد کی ہے۔۔۔۔۔ چل میں پہنچ کر تجھے بتاتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ سامنے والا کیا کہہ رہا تھا وہ تو پتا نہیں چلا بس رکشے والے کی ہی آواز آرہی تھی۔

”بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے دیکھ بھال کر بیٹھنا چاہیے تھا مجھے۔ یہ شخص تو شکل سے ہی چور اچکا، بد معاش لگ رہا ہے۔ پالندہ! اپنا کرم کر دے۔“ اچانک ہی اسے اپنے موبائل کا خیال آیا جیٹ سے موبائل نکال کر گھر کا نمبر ملانے لگی۔

”نہیں امی، ابو پریشان ہو جائیں گے۔ ابو تو ویسے ہی ہارٹ پیسٹ ہیں۔“ اپنے خیالات کی نفی کرتے ہوئے اس نے کال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ لاکھ بھادر کبھی مگر اس وقت اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سنسنی سی ہو رہی تھی۔ دل پری طرح دھڑک رہا تھا۔ جتنی بھی دعائیں اسے آتی تھیں وہ انہیں پڑھنے لگی۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار رکشے والے کے پاس کال آئی مگر اس نے دھیان نہیں دیا اور مسلسل آپہانکر سی پڑھتی رہی، رکشہ اب بلوچ پل سے گزر رہا تھا جو کسی شیطانی آنت سے کم نہیں لگتا، اپنا علاقہ قریب آتے دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس ملی مگر دل کی کیفیت ابھی بھی ویسی ہی تھی۔ اب رکشہ اس کے گھر

کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ رہا تھا۔ جیسی اس کے ذہن میں آئینہ یا آیا کہ اپنے گھر کے سامنے نہیں اترتا، رکشے والے کو اپنے گھر کا پتا نہیں لگنے دینا تھا۔ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے گلی میں اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے۔ وہ گلی کے ٹکڑ پر اتر گئی تھی۔ کراہی دے کر وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا گھر گلی کے درمیان میں تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ گھر کی طرف بڑھ رہی تھی جیسی اسے رکشہ اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے چلنے کی رفتار بڑھا دی۔ خوف نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا۔ ذرا سی دیر میں گلابی رنگت میں ہلدی گل گئی تھی جیسی رکشہ اس کے برابر آکر رکا۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ وہ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہ رہی تھی مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی، اسے اپنا دل حلق میں آتا محسوس ہو رہا تھا جیسی رکشے والے کی آواز اسے حال میں لے آئی۔

”باجی! یہ لیں آپ اپنا موبائل رکشے میں ہی بھول آئی تھیں۔“ جیسی اسے یاد آیا کہ ابو کو کال کرنے کے لیے اس نے بیک سے موبائل نکالا تھا، پھر گود میں رکھ کر ہی پیٹھ پیٹتی تھی اترنے کی جلدی میں وہ رکشے میں ہی گر گیا۔ یہ قیمتی موبائل اسے ابو نے گفت کیا تھا۔

”باجی! مجھے لگا کہ آخری سواری آپ تھیں، تو آپ کا ہی ہوگا۔“

”بہت بہت شکریہ بھائی!“ اس نے دل سے شکریہ ادا کیا۔ رکشے والا واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ آج اسے احساس ہوا کہ کسی کے حلقے کو دیکھ کر آپ اس کی شخصیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے، کچھ لوگ شرافت کے لہارے میں بھیڑے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ شیطانی لباس میں فرشتے نکل آتے ہیں۔ وہ طمانیت سے مسکراتی گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ گھر جا کر اسے چارفل شکرانے کے پڑھنے تھے۔

☆.....

جس میں ایک رکشے والے نے ایک عورت کو اغوا کیا تھا اور بعد میں عورت کی لاش کچرا کنڈی سے ملی تھی۔ یہ واقعہ یاد آتے ہی اس کی سٹی کم ہو گئی۔ رات کے سناٹے میں گاڑیاں ایسے چل رہی تھیں جیسے گاڑیوں کا سمندر بہہ رہا ہو۔ گاڑیوں کے شور کے علاوہ دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ ایسے میں ایکدم ”ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے“ کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ رکشے والا فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

”ہاں بس میں راستے میں ہوں۔ سواری ساتھ ہی ہے۔ قیوم آباد کی ہے۔۔۔۔۔ چل میں پہنچ کر تجھے بتاتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ سامنے والا کیا کہہ رہا تھا وہ تو پتا نہیں چلا بس رکشے والے کی ہی آواز آرہی تھی۔

”بہت بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے دیکھ بھال کر بیٹھنا چاہیے تھا مجھے۔ یہ شخص تو شکل سے ہی چور اچکا، بد معاش لگ رہا ہے۔ پالندہ! اپنا کرم کر دے۔“ اچانک ہی اسے اپنے موبائل کا خیال آیا جیٹ سے موبائل نکال کر گھر کا نمبر ملانے لگی۔

”نہیں امی، ابو پریشان ہو جائیں گے۔ ابو تو ویسے ہی ہارٹ پیسٹ ہیں۔“ اپنے خیالات کی نفی کرتے ہوئے اس نے کال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ لاکھ بھادر کبھی مگر اس وقت اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں عجیب سنسنی سی ہو رہی تھی۔ دل پری طرح دھڑک رہا تھا۔ جتنی بھی دعائیں اسے آتی تھیں وہ انہیں پڑھنے لگی۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار رکشے والے کے پاس کال آئی مگر اس نے دھیان نہیں دیا اور مسلسل آپہانکر سی پڑھتی رہی، رکشہ اب بلوچ پل سے گزر رہا تھا جو کسی شیطانی آنت سے کم نہیں لگتا، اپنا علاقہ قریب آتے دیکھ کر اسے کچھ ڈھارس ملی مگر دل کی کیفیت ابھی بھی ویسی ہی تھی۔ اب رکشہ اس کے گھر

زندگی جہرِ سلسلہ

زندگی جس میں دھوپ کی تپش بھی ہے بارشوں کی ٹھنڈک بھی، ایسے ہی جلتی دھوپ میں چلتے چلتے سایہ مل جاتا ہے، اور یہی تمام عمر آبلہ پاتیتی زمین پر تنہا چلنا پڑتا ہے، جہاں زندگی میں تناؤں

کی صبح ہوتی ہے، وہاں آرزوؤں کی شام بھی ڈھل جاتی ہے، اگر محبتوں کی کرنیں چھائی ہیں تو جدائیوں کی آندھیاں بھی ضرور چلتی ہیں، اس شاہراہِ زیست میں خلوص لٹانے والے بھی ملتے ہیں اور پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔

ایسا ہی کنول کے ساتھ بھی تھا، کنول جو ہر کسی کے لیے پر خلوص جذبات رکھتی تھی، مگر اکثر انہی خلوص بھرے جذبات کی بدولت گہرے دکھوں نے بھی اس کے دل پر دستک دے ڈالی تھی۔ انہی

دکھوں میں رقم گہرا دکھ جو اس کی زیست پر چھا چکا تھا وہ احمر کے جیون ساتھی بننے کا دکھ تھا۔ احمر اور کنول شہر کی معروف یونیورسٹی میں اکٹھے زیر تعلیم تھے۔ رکی بات چیت سے بات شروع ہوئی اور پھر یہ گہری دوستی میں بدل گئی۔ احمر نے کچھ اس انداز سے اپنی محبت کا مدعا سامنے رکھا کہ کنول، کنول کے پھول کی مانند چھوٹی موٹی سی ہو گئی اور اس کی خاموشی کو احمر نے حوصلہ افزائی سمجھا۔ جلد اپنے والدین کو کنول کے گھر رشتے کے لیے بھیج دیا۔ یوں بھی کنول تعلیم سے فراغت حاصل کر چکی تھی،



کنول کے والدین نے جب کنول سے عندیہ لیا تو کنول نے بھی حای بھری۔ احمر وجہ تھا اسارٹ تھا اور سب سے بڑھ کر چاہت سے طلبہ رہتا۔ کنول جس عمر میں تھی وہاں محبت کی طلب ہر طلبہ پر حاوی ہو جایا کرتی ہے، یوں کنول بھی احمر کی محبت میں ڈوب کر اپنے اطراف میں اپنے والدین کی پریشانی کی وجہ نہ بھانپ سکی۔ اس کی والدہ نے بارہا کنول کی توجہ اس طرف دلانا چاہی کہ کنول اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ خوب نازوں پٹی، احمر پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے اور اس پر کافی ذمہ داریاں ہیں۔ پھر جب رشتے کے سلسلے میں احمر کے گھر والے آئے تو اس کی ہونے والی نندوں کی گھومتی گھامتی نظروں سے فریجہ بیگم اس عمر میں بھی ہول کر رہ گئی تھیں۔ کنول محسوس بھی اور اسے دنیا کی چالاکیوں کی قطعاً سمجھ نہ سکی، فریجہ بیگم گھبرائی تھیں کہ نجانے اگلے گھر میں جہاں نندوں کا اس قدر عمل دخل ہوگا، ان کی نازوں پٹی اکلوتی بیٹی کیسے اس گھر میں نباہ کر سکے گی۔

کنول نے ان سب باتوں سے قطع نظر محض احمر کو مرکز نگاہ بنا رکھا تھا۔ یوں قدرت کی رضا سے احمر اور کنول رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ کنول بچہ درج میں نرالی چھپ دکھلا رہی تھی۔ وہ اس قدر حسین اور جاذب نظر حسن جادواں کی مالک لگ رہی تھی کہ نگاہ اس کے چہرے پر آن کے ٹک سی جاتی تھی اور پلٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اتنا پر نور وجود لگ رہا تھا اس کا۔ میرون وزنی کا ہمارے لہنگے میں وہ کسی اپسر سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اندرونی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر جھلما رہا تھا۔ ماں باوا کی دعاؤں میں رخصت ہو کر وہ احمر کے گھر آ گئی۔

☆.....☆.....☆

عروسی کمرے میں بیٹھی کنول احمر کا انتظار کر رہی

تھی اور دل کبھی تیز اور کبھی مدہم لے پر دھڑک رہا تھا۔ اگرچہ یہ وہی احمر تھا جس سے وہ گھنٹوں باتیں کر لیا کرتی تھی مگر آج وہ اس احمر سے سامنا کرنے سے گھبرادی تھی، بے انتہا فطری شرم نے اس کی ذات کا احاطہ کر رکھا تھا۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب احمر کمرے میں نہ آیا تو کنول کو سخت کا ادراک ہوا، وال کلاک پر نگاہ ڈالی تو صبح کے چار بج چکے تھے، وہ مستقل ایک ہی زاویے سے جھپٹے دو گھنٹوں سے تنہا اس کمرے میں بیٹھی احمر کا انتظار کر رہی تھی۔ اب تو اس کا وجود بھی پتھر کا بن چکا تھا، اچانک مایوسی اس کے وجود میں گھر کرنے لگی، بھی دروازے پر ہلکی دستک کے بعد احمر کمرے میں آ گیا۔ کنول محتاط ہو کر مٹ کر بیٹھ گئی اور سر جھکا لیا۔ احمر کنول کے پاس آ کر دو زانو بیٹھ گیا۔

”ارے تم تو یوں شرماری ہو جیسے کہ پہلی بار مل رہی ہو مجھ سے، یہ دکھاؤ کیوں بھی؟ ریلیکس کرو۔“

احمر کے لب و لہجے میں ایسا کچھ اٹکھان تھا کہ کنول چونک کر رہ گئی اور حیرت و استعجاب سے احمر کو دیکھنے لگی۔

”دیکھو کنول! اب جب کہ تم اس گھر میں آ چکی تو خود کو اس گھر کا حصہ ہی سمجھو۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ میری پانچوں بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اور قابل احترام ہیں۔ امی کی وفات کے بعد کلثوم آپا نے مجھے پالا ہے اور میں ان کی کوئی بات نال نہیں سکتا۔ اس گھر میں کلثوم آپا کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ان کو وہی مقام وہی مرتبہ دو جن کی وہ مستحق ہیں۔“

شادی کی اولین رات ہی احمر اپنی بہنوں کی باتیں کنول سے کرتا رہا اور کنول حیران تھی کہ آج سے پہلے تو احمر نے کبھی بھی اپنی ان بہنوں کا تذکرہ

نہ کیا تھا۔ ایک آدھ بار سرسری سا ذکر ہوا تھا اور آج کی رات جب وہ احمر کی جانب سے کسی محبت بھرے تعریفی انداز کی توقع کر رہی تھی احمر اسے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے میں مصروف عمل تھا، وہ دم سادھے احمر کی ہر بات نہایت توجہ سے سن رہی تھی۔

”آپا نے ابھی مجھے کہا ہے کہ اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دو کہ آپا کا ہر حکم ہمیں پلاچوں جہاں مانا ہوگا اور مجھے امید ہے کنول کہ تم مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دو گی، اچانک احمر نے کنول کا ہاتھ تھام لیا تو کنول کے برف بار ہاتھ میں حرارت کی رقیق آئی۔

احمر کے بدلتے انداز دیکھ کر کنول کا چہرہ جھک گیا، احمر ہر گزرتے پل کے ساتھ اپنے رنگ بدلتے ہوئے کس قدر اجنبی لگ رہا تھا، کنول زیادہ دیر تک کچھ سوچ نہ سکی کیونکہ احمر نے اسے اپنے وجود کے حصار میں قید کر لیا تھا اور کنول کسما کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی کے یہ رنگ کنول کے لیے بالکل نئے تھے۔ کنول کو لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد محض کلثوم آپا کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے، اس کی زندگی کا مرکز و محور کلثوم آپا تھیں۔

کلثوم آپا نے اپنے بھائی اور چھوٹی بہنوں کے لیے خود شادی نہ کی تھی، اور وہ روکے رنگوں بھری زندگی گزارنے پر مجبور تھیں، یہی روکھاپن اب ان کی شخصیت کا خاصا بن چکا تھا۔ ہر بات کہتے ہوئے ان کا انداز اس قدر سخت ہوتا تھا کہ اولین دنوں میں تو کنول سمجھ ہی نہ سکی کہ کلثوم آپا اس سے بات کر رہی ہیں یا اسے ڈانٹ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ گھر کا ماحول اور آپا کا مزاج سمجھنے لگی تھی۔ اس میں اس کی ذاتی کاوش کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔

کلثوم آپا کا مزاج تب تک ہی ٹھیک رہتا تھا جب تک کہ وہ گھر گریہتی میں الجھی رہتی، جوں ہی اس کا کوئی کام احمر سے متعلق ہوتا وہ بھی تیار ہوتی کہ احمر کی آمد کا وقت ہے تو کلثوم آپا کا موڈ سخت آف ہو جاتا تھا۔ شروع میں تو کنول اسے محض اپنا وہم سمجھتی مگر یہ اس کا وہم نہ تھا۔ ایک دن جب اس نے احمر کی پسند کے کپڑے کے کپڑے زیب تن کئے اور خوب اہتمام سے تیار ہوئی تو احمر کی آمد سے قبل ہی کلثوم آپا نے اسے اپنے پاس بلایا اور تیوریاں چڑھا کر کہا۔

”بی بی! کچھ تو شرم لحاظ کرو، اتنی بھی کیا ہے مہربانی ہے کہ سر شام تم بچہ درج کر بیٹھ جاتی ہو، معلوم بھی ہے کہ احمر کی دو بہنیں ہیں جو قریب ہی رہتی ہیں، شام کو آ کر احمر کو دیکھ نہ لیں تو ان کے بے قرار دل کو قرار نہیں ملتا۔ تمہارے یہ تیور دیکھ کر ان کے اوپر کیا اثر پڑے گا، پھر محسوس بھانجیاں، توجہ توجہ۔ امی مرحومہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ وہ اور ابابھی ساتھ بیٹھ کر کھانا تک نہ کھاتے تھے۔ ایک شرم تھا، پاس لحاظ تھا، مگر ایک آج کا دور ہے۔ خیر تم سے تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ تم نے تو شادی سے پہلے ہی احمر پر ایسا جادو چلایا کہ وہ تن تنہا اٹھ کھڑا ہوا ہم بہنوں کے سامنے ٹر میری ایک بات یاد رکھنا تم اس گھر میں تو آ گئی ہو مگر اگر یہ سمجھتی ہو کہ اس گھر پر بھی قبضہ کر لو گی اسے ان تیوروں سے تو یہ تمہاری سراسر بھول ہے۔ اچھی جاؤ اور جا کر کوئی مناسب سادہ لباس پہن کر آؤ، ہمیں بھی تو کبھی ایسا لگے کہ کسی شریف گھرانے کی لڑکی بیابھ کر لائے ہیں۔“ کلثوم آپا بنا لحاظ رکھے جو منہ میں خرافات آئیں بولتی چلی گئیں۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ آخر کنول کے دل پر کیا گزرے گی۔

شگفتگی سی در آئی تھی کنول کے وجود میں۔ عجیب سی جھکن زدہ ہستی لئے وہ کمرے میں آ گئی،

پہلے چوڑیاں اتاریں، بندے اتار کر بے دلی سے ٹیکل پر رکھ دیئے۔ آنسوؤں کی نمی میں کاجل پہلے ہی بہہ رہا تھا، لپ اسٹک بھی بے دردی سے رگڑ ڈالی۔

”تو یہ تھا تمہارا مقدر کنول! کتنے ارمان تھے تمہارے آج معلوم ہوا کہ ہر آرزو کے مقدر میں منزل نہیں ہوتی، بعض آرزوئیں ہمیشہ نامکمل، ناقص، ادھوری سی، تشنہ لب، تشنہ روح رہ جایا کرتی ہیں۔“

وہ کافی دیر یونہی بیٹھی اپنی قسمت پر ماتم کتنا رہی، بھی اچانک دروازہ جھٹکے سے کھلا، احمر سخت طیش کے عالم میں نظر آ رہا تھا۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟ وہاں آپا جان کچن میں خود چائے بنا رہی ہیں، اس قدر سرد ہے آپا جان کو اور تم سارا دن کیا کرتی رہتی ہو، میری کچن میں جیسی بہن وہاں کچن میں گری میں جھلس رہی ہیں اور تم یہاں بیٹھی ہو آرام سے سچ سنو رکڑ۔“

احمر کی بات پر کنول فقط ہنسنی آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ بھی کہنا عجب تھا۔ یہاں نہ کوئی سننے والا تھا اور نہ ہی کوئی درد سمجھنے والا تھا۔

”اب جا کہاں رہی ہو؟“ احمر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”آپا جان کے پاس کچن میں۔“ آنسوؤں کی نمی میں گھلا اس کا لہجہ پر سوز تھا۔

پھر یہ کہہ کر کنول رکی نہیں تیزی سے کچن کی جانب چل دی۔ کنول کا رویا رویا سوئی آنکھوں والا چہرہ دیکھ کر کلثوم آپا نے گہری طمانیت بھری سانس لی اور کچن سے باہر آ گئیں۔

کلثوم آپا اور حقیقت ان خواتین میں سے تھیں جو اپنے بھائی کو فقط اپنی ملکیت تصور کرتی ہیں، پھر وہ بھائی نہ تو کسی کا بیٹا ہوتا ہے نہ کسی کا شوہر۔ فقط ایک ہی رشتہ ہر رشتے پر حاوی ہو جاتا ہے۔

بہن کا رشتہ۔ کلثوم آپا کو باقی سارے رشتے اس رشتے کے سامنے محض ایک ڈھکوسلہ دکھاوا لگا کرتے تھے۔ اکثر کلثوم آپا کے لیوں پر یہی جملہ ہوا کرتا تھا۔

”کنول! اپنی حیثیت اپنا مقام یاد رکھنا تم کبھی بھی احمر کی زندگی میں وہ جگہ حاصل نہیں کر سکتی جو میری ہے، میں نے احمر کو گودوں میں کھلایا ہے، قربانی دی ہے اپنی زندگی تیاگ دی ہے، میرے بیٹوں سے بڑھ کر ہے احمر۔“ کنول کو کلثوم آپا کی اس بات سے اس نظر بے سے کوئی اختلاف نہ تھا کہ وہ بھی کلثوم آپا کی قربانی کی قائل تھی۔ کلثوم آپا نے محض احمر کی خاطر شادی نہ کی تھی جبکہ ان کی بات اپنے چچا زاد سے ملے سبھی اور بچپن کی چاہت کو چھوڑنا اس قدر بھل نہیں ہوا کرتا۔ کافی انتظار کے بعد سبیل نے شادی کر لی تھی۔

احمر ہی نہیں دو چھوٹی نندا اور شرا کے لئے بھی کلثوم آپا نے اپنی ساری زندگی تیاگ دی تھی۔ دیکھا جائے تو کلثوم آپا کا یہ جذبہ قابل ستائش تھا اور یہ کلثوم آپا کا حق تھا کہ احمر ان کو ماں کا مقام بھی دیتا مگر اللہ رب العزت نے ہر رشتے کو اس کی اصل اہمیت کے ساتھ رکھا ہے۔ جو مقام کلثوم کا تھا وہ کنول پر گزرنے لے سکتی تھی، یہ بات کنول بخوبی سمجھتی بھی تھی۔

مگر کلثوم آپا کو اس بات کا قطعاً ادراک نہ تھا کہ کنول کے بھی بیوی کی حیثیت سے کچھ حقوق تھے کچھ خواب تھے، کلثوم آپا نے کنول کو محض ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا تھا جس کی ڈور کلثوم آپا کے ہاتھ میں تھی۔ کلثوم آپا جیسا چاہیں کنول ویسا ہی پہنا دیا۔ اپنے حدود یہ کہ کلثوم آپا کو اگر احمر کا کنول کے ساتھ بات کرنا مسکراتا گوارا خاطر گزرے تو احمر بھی محتاط ہو جائے اور ایسا ہی ایک رات ہوا۔

احمر اگرچہ احترام کے رشتے کی زنجیر میں قید تھا

مگر بسا اوقات احمر کے دل پر بھی ماضی کے درپچوں کی دستک ہوا کرتی تھی، کنول کا اداس سراپا اس کو عداوت کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جایا کرتا تھا مگر وہ کنول کو ماپوسی سے خوشی میں لانے کے لیے چند لمحات کی دجوبی ہی کر سکتا تھا جب کلثوم آپا کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا اور یہ مختصر لمحات احمر اور کنول کی زندگی کا کل تھے۔

ایک رات کنول کو اداس دیکھ کر احمر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دونوں لاؤنج سے باہر نکلنے والے ٹیرس پر کھڑے ہو کر کھلی ہوا میں سانس لیں۔ کٹے ماحول میں دونوں آئے تو ایک دم دونوں کو ہلکا ہلکا محسوس ہوا۔ احمر نے کنول کو گہری نگاہوں سے دیکھا، کنول کی دودھیا رنگت اس منظر میں خاصی چمک رہی تھی اور کنول کے چہرے کی دھیمی سی مسکان اس منظر کو بہت دلچسپ بنا رہی تھی۔ احمر کا شدت سے دل چاہا کہ وہ از سر نو کنول سے اظہار محبت کرے، اچانک احمر نے کنول کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”کنول! اداس مت رہا کرو، میری مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں دو کشتیوں کا سوار ہوں، نہ ادھر کا نہ ادھر کا۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کلثوم آپا کا رویہ تمہوڑا سخت ہے مگر دل کی بری نہیں ہیں، وہ میرے معاملے میں کچھ زیادہ ہی پوزیو ہیں۔“ احمر جیسے لہجے میں کنول کو اپنی مشکل سے آگاہ کر رہا تھا۔ کنول کو اچھا لگا کہ کم از کم احمر کو کنول کی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ تو ہوا۔

”احمر! آپ کی خاطر ہی تو ہر بار ہر تکلیف وہ جملہ سہہ جاتی ہوں کیونکہ آپ کو کھودینے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے، آپ تو محبت کر کے بھول بیٹھے ہیں مگر میں بھانے والوں میں سے ہوں۔“ کنول کا شاکھی لہجہ کنول کی ناراضی کی جھلکی کھارہا تھا۔

آخر وہ بھی کہاں تک صبر کرتی۔ اگر انسان کو معلوم ہو کہ کوئی ساتھ بھانے والا ہے تو پھر زندگی کی ہر مشکل اور ہر راہ آسان ہو جایا کرتی ہے، مگر کنول کو تو یوں لگتا تھا کہ وہ شکے پاؤں اکیلی اس دشت سفر کی راہی ہے۔

”ہونہہ... تو بیگم صاحبہ لانے کے موڈ میں ہیں۔“ احمر نے محبت پاش انداز میں کہا تو کنول کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اتنے عرصے کے بعد تو کنول سے احمر نے چند محبت بھری باتیں کی تھیں۔ دل کے کچھ راز کہہ ڈالے تھے۔ کنول نے مسکرا کر احمر کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ تبھی پیچھے سے کلثوم آپا آن وارد ہوئیں۔

”تو تو بے کچھ تو شرم لحاظ کرو، احمر، کنول تو ایسی ہی ہے مگر مجھے تم سے قطعاً ایسی امید نہ تھی، اگر اتنی ہی بے تابی بے صبری ہے تو کمرے میں جا کر عشق نامہ بیان کرو، یہاں یوں سرعام جبکہ معلوم بھی ہے گھر میں جوان جہان بھانجیاں ہیں، اگر حفسہ اور ریمہ میں سے کوئی ادھر آ جاتا اور تم دونوں کو یوں شترے مہار دیکھ لیتا۔“ کلثوم آپا کا پس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کنول کے چہرے پر پھینچر رسید کر دیں۔ کنول کے لئے ان کے چہرے پر پھیلی نفرت کے گہرے سائے صاف عیاں تھے۔ احمر نہایت تابعداری سے ہاتھ باندھے نادم سا کھڑا تھا۔

کنول کو کچھ دیر قبل پیش آنے والا وہ محبت بھرا لمحہ کوئی خواب کوئی خیال گزرا۔

”اب کھڑی بے شرمیوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو دفعتاً ہو جاؤ اسے کمرے میں۔“ کلثوم آپا نے سخت طیش کے عالم میں کہا تو کنول اپنے اچانک اللہ آنے والے سیلابی ریلے کو روک نہ پائی اور بے اختیار چہرہ نم کر دینے والے آنسوؤں کو دہانی ہوئی سستی کمرے میں بھاگ گئی۔

”اور احمر! تم رکو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

کلثوم آپا کی بات پر احمر کے قدم جہاں تھے وہاں رہ گئے۔

”احمر بیٹا! بیوی کوئی سر پر چڑھانے والی شے نہیں ہے، اسے برو تو مگر اپنے سر کا تاج مت بٹاؤ، سمجھ رہے ہونا میری بات؟ تمہاری ضد بروہ اس گھر میں آ تو گئی ہے مگر یہ خیال دل سے نکال دو کہ اس کے چال چلن کو بھی فراموش کر دوں گی، کیسے جال میں چھنسا لیا میرے معصوم بھائی کو...“ کلثوم آپا نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اچانک چکر کر گر گئیں۔

وہ ساری رات احمر نے کلثوم آپا کے سرہانے بیٹھ کر گزاری۔ کلثوم آپا ساری رات احمر کا ہاتھ تھامے یہ یقین دہانی کرتی رہیں کہ ان کا لاڈلا اکلوتا بھائی اُن کی نظروں کے سامنے ہے اور احمر نے اس دن دل میں حتمی طور پر طے کر لیا کہ وہ اپنی پیاری آپا کا بھی دل نہیں دکھائے گا اور کنول سے ایک دوری کا تعلق بنائے رکھے گا۔ وہ کلثوم آپا کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا تھا، کیسے سلائی کر کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اوپر کا پورشن کرائے پر دے کر انہوں نے سب کو تعلیم دلائی۔ ابا کی پیشین کا بھی سہارا تھا۔ یہ سب معاملات وہ فقط دس سال کی عمر میں سمجھ نہیں سکتا تھا یہ کلثوم آپا ہی تھیں جنہوں نے یہ سب معاملات بخوبی سنجالے تھے۔

دو چھوٹی بہنیں تو دوسرے شہروں میں بیابا ہی تھیں مگر دو آخر والی عدا اور شہزاد قریب ہی رہتی تھیں۔ سسرال بے حد قریب تھی آئے دن کی آمد و رفت بھی پھر اُن کی اپنی بیٹیاں تھیں جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں۔ کلثوم آپا کا زیادہ ساتھ نہ آئی ہی دیا کرتی اور ان کی بڑی بیٹی حصہ ہو بہو اپنی ماں کا پر تو تھی۔ کنول سے اس قدر بدتمیزی سے بات کیا کرتی تھی کہ کبھی کنول کو گمان گزرتا کہ کیا واقعی وہ حصہ کی ممانی ہے؟ کیونکہ اس کے گھر میں ہمیشہ والدہ نے یہی سبق

دیا تھا۔

”بیٹا! بڑوں کی عزت کرو، درمیان میں ٹوکنا بھی بے ادبی کہلاتا ہے۔“

مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ کنول کو بچوں کو سمجھانے تک کی آزادی حاصل نہ تھی۔ ایک دن حصہ کھڑے ہو کر پانی پی رہی تھی کنول کی شامت اعمال آئی تھی اس نے کہا۔

”حصہ بیٹا! اب ہر گرمی سے آئی ہو، آرام سے بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیو پھر یہ سنت رسول بھی ہے۔“

کنول کا اتنا سمجھانا تھا کہ حصہ کو تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے۔

”ممائی! آپ مجھے ہر بات میں ٹوکنا چھوڑ دیں، آپ کے آنے سے پہلے بھی میں اسی طرح آ کر حق سے بچن کی چیزیں استعمال کیا کرتی تھی، اب جب سے آپ آئی ہیں ہر وقت کی روک ٹوک۔“ حصہ سخت بدتمیزی سے گلاس کاؤنٹر پر پھینک کر بولی، کنول حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

یہ سب قصور تو سراسر احمر کا تھا کہ وہ آج اتنی چھوٹی لڑکی کے ہاتھوں اپنی تذکیل کروا رہی تھی۔ اس گھر میں اس کی وقعت ہی نہ تھی۔

”حصہ! تم بات کو بالکل غلط رنگ دے رہی ہو اور یہی تیز کشانی ہے تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی۔“ کنول بھی شدید غصے کی لپیٹ میں تھی۔

”سن رہی ہیں آپا جان! اس طرح ہمیں یہاں آ کر باتیں سننا پڑتی ہیں اور میری تربیت کی بات کرتی ہے، پہلے اپنی ماں کی تربیت کی بات کرو جس نے لڑکوں پر ڈورے ڈالنا سکھایا ہے۔ عدا آپا اور کلثوم آپا نہ جانے کب وہاں آئیں اور کنول کا آخری جملہ سن کر عدا آپا کا غصہ عروج پر تھا۔

”بہت افسوس کا مقام ہے کنول! ابھی اور اسی

وقت تم عدا آپا اور حصہ سے معافی مانگو ورنہ تمہیں پھٹانا پڑے گا۔“

”معافی مگر کس بات کی؟“ کنول حیرت زدہ تھی۔

”میں نے حصہ سے ایسا کچھ نہیں کہا جس کی معافی مانگی جائے، معافی تو حصہ کو مجھ سے مانگی چاہئے۔“ کنول نے بھی آج جرات مندی سے کہہ دیا۔

”یہ معافیاں تم اب احمر کے سامنے پیش کرنا اور صفائی پر یقین بھی احمر کر سکتا ہے، بھولا ہے ناں میرا بھائی اور رعنا بات معافی کی تو اب یہ معاملہ احمر کے سامنے ہی طے ہوگا۔“ کلثوم آپا نے قطعیت بھرے انداز میں کہا۔

پھر شام کو احمر نے کنول کو طلاق کی دمکی دے کر معافی منگوائی۔

☆.....☆.....☆

گھبرا کر ادا حلاصہ کنول کی آنکھوں کو سکون دے رہا تھا۔ واپس ایک طرف رکھ کر اس نے صحن پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ زندگی کی دھول مٹی کو تو صاف کرنے کی اہل نہ تھی مگر گھر کے کونے کونے سے اس جذبہ کو تسکین دیا کرتی تھی۔

اس دن کے بعد کنول بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ بہت کم صدم، اگر احمر نہ بلاتا تو بھی اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاید وہ اپنی اصل حیثیت اور مقام کو بخوبی جان چکی تھی اور اپنی قسمت پر مجبوتہ کر کے خاموشی اختیار کر چکی تھی۔ کسی نے بھی اس کی اس قدر خاموشی کی وجہ پر غور نہ کیا البتہ کلثوم آپا اکثر فاتحانہ نگاہوں سے اس کے اجاڑ چلیے اور ویران نگاہوں کو دیکھ کر مطمئن ہی ہو جایا کرتی تھیں۔

یہ ان کی جیت ہی تو تھی کہ احمر جو کنول کو ضد کر کے اس گھر کی زینت بنا کے لایا تھا آج اسے ایک کونے میں ڈال کر نام کے ساتھ جوڑ کر بھول بیٹھا

تھا۔ احمر شام کو آتا تو ساری بہنیں اسے گھیر لیتیں اور احمر کے ساتھ خوب چہلچل لگاتی تھیں۔

کنول بچن میں ایک کے بعد ایک فرمائشیں پوری کرنے میں لگی رہتی اور جب کنول کو فراغت ملتی آ کر کمرے میں بند ہو جاتی۔ اب اسے احمر کے انتظار کی عادت بھی نہ رہی تھی۔ جب احمر کے آنے کا وقت ہی متعین نہ تھا تو یہ انتظار لا حاصل تھا۔

شامی فرمان نازل ہوتا تو احمر دبے قدموں سے کمرے میں جاتا۔ بھی تو کنول تھک کر سو چکی ہوتی اور اگر جاگ بھی رہی ہوتی تو کروٹ بدل کر سوئی بن جاتی۔ نا معلوم کیوں اسے اب احمر سے وحشت سی ہوتی تھی۔ ایک ایسا رشتہ جس کی اصل معنوں میں کوئی حقیقت اور وقعت ہی نہ تھی، یہ محض نام کا رشتہ تھا جس میں اب کسی جذبے کی حدت کا دخل نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار احمر اپنا حق ملکیت جتنا تھا تو کنول تب بھی کسی پس و پیش کے بنا احمر کی بات مان لیتی۔ احمر کی محبت رات کی تاریکی میں چند لمحات کی مرہون منت تھی جو دن کے اجالے میں کسی تاریکی میں جا کر ڈوب جایا کرتی تھی۔ کنول کے جذبات تہجد برف بار تھے اور اب اسے کوئی امید نہ رہی تھی۔

شاید زندگی کا یہ سلسلہ یونہی ساری عمر رہتا مگر ایک دن کنول کام کرتے کرتے بچن میں لہرا کر گر گئی۔ احمر جو بانی پینے کے ارادے سے بچن میں آیا تو کنول کو یوں گرے ہوئے دیکھا تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا۔ وہ کافی دنوں سے کنول کا متحمل وجود دیکھ رہا تھا مگر حالات کے پیش نظر خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔

مگر آج جب کنول کو یوں دیکھا تو اچانک اسے کھودینے کا احساس ہر شے پر حاوی ہو گیا۔ ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ کرنے کے بعد کہا۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے ایسی حالت

ماہِ سنگِ کمرِ آرمی کیا



”تم کیوں نہیں سمجھتے اسامہ! وہ پرانی باتوں کو آج تک بھلا نہیں سکیں۔“

”بھابی چھوڑیں اماں پرانے خیالات کی ہیں۔“ ہانیہ بھی افسردہ ہو کر بیٹھ گئی۔ پچھلی باتیں سب اسے یاد آنے لگیں۔ ساس مندوں کا سلوک اور دیگر باتیں۔

اسامہ اور ہانیہ کی شروع سے بہت بیتی تھی۔ اسامہ اپنے کالج کے قصبے ہانیہ کو سنا تا تھا۔ ہانیہ کو بے وقوف بنا کر اس نے اسے اپنی بایک پر بٹھایا تھا۔ ہانیہ چیخ رہی تھی اور اسامہ ہنس ہنس کر اپنی بایک کو اڑاتا پھرتا تھا۔

”رکو اسامہ رکو۔“ اور اسامہ کو بایک روکنی پڑی تھی۔

”اسامہ کالج سے آنے والا ہے۔“ وہ کچن میں جا کر کھانا بنانے لگی۔

اماں جل بھن کر کہتیں۔ ”ہاں اسامہ کا اس کو بڑا خیال رہتا ہے۔ اس کی بہن ہے ناں تو اس کو یوں اسامہ اچھا لگتا ہے۔ چاہتی یہ ہے کہ اپنی بہن کو بھی اس گھر میں لے آئے۔“ ہانیہ کو ادھر ادھر سے خبریں ملتی رہتی تھیں کہ اماں یوں کہہ رہی ہیں وہ اداس ہو کر حمزہ کو بتاتی تو حمزہ ہنس کر کہتا۔

”ارے یار! اماں بوڑھی ہو گئی ہیں جودل میں آتا ہے بولتی رہتی ہیں تم کیوں براماتی ہو۔“

”حمزہ وہ میری بہن کو سچ میں لے آتی ہیں ہر ایک سے کہتی ہیں کہ میں حمزہ پر نظر رکھتی ہوں۔“

حمزہ چھیڑتا۔

”سچ بچہ تادو نظر تو نہیں رکھے ہو تم اسامہ پر۔“ وہ مصنوعی غصے سے حمزہ کے کمر پر مکہ مارتی اور وہ ہنستا ہوا ہار نکل جاتا۔

”کیا ہوا بھابی! حمزہ بھائی بڑے ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے ہیں۔“

”میں کہتی ہوں کہ تم کمرے سے نکل جاؤ۔“ وہ

اسامہ کی بیوی اور ہانیہ کے درمیان اکثر شغنی رہتی تھی۔ گھر کا ماحول بہت ٹینس تھا۔ اسامہ کی بیوی ویسے تو بڑی ٹھیک ٹھاک اور بڑھی لکھی عورت تھی لیکن اسامہ اپنی بیوی سے کھنچا کھنچا رہتا۔ آج بھی اسامہ جب گھر جلدی لوٹا تو اپنے کمرے سے پلٹ کر نکل آیا تھا۔ باہر جاتے جاتے پلٹا اور ہانیہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”بھابی آپ کے ہاتھ کی چائے مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“ پاس کھڑی ہوئی رومیہ غصے سے پلٹ کر اندر چلی گئی تھی۔

”دیکھو اسامہ! تم یہی بات اتنے ہی پیار سے رومیہ سے بھی تو کہہ سکتے تھے؟“

”پتا نہیں بھابی! نجانے کیوں مجھے تو آپ کے ہاتھ کی چائے پسند ہے اور خاص طور پر جب حمزہ بھائی ہوں تو آپ جب چائے سیٹ میں لے کر آتی ہیں تو کیا بات ہے۔ بھابی بھینی بھینی چائے سے اتنی خوشبو پر سکون سا ماحول بہت اچھا لگتا ہے۔ نجانے کیوں بھابی ہمارے اور رومیہ کے درمیان ایک ٹینشن سی رہتی ہے۔ پتا نہیں کیوں رومیہ نے عجیب سا ماحول کر دیا ہے۔ بھابی وہ آپ کی طرح نہیں رہ سکتی؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس نے پلٹ کر کپ رکھا تو اس کے سارے گھنے بال اس کے دائیں بازو پر آگرے اس نے بالوں کو لپیٹتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔

”اس قسم کی باتیں مت کیا کرو اسامہ! میں جانتی ہوں کہ تم رشتے میں بھی مجھ سے چھوٹے ہو اور عمر میں بھی مجھ سے چھوٹے ہو لیکن اماں اور رومیہ تمہارے اس رویے کو پسند نہیں کرتیں۔ خاص طور پر اماں بہت برا سمجھتی ہیں۔“

”سمجھنے دیں بھابی! سب کچھ جانتے ہوئے آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔“

شدید غصے سے اسے جھڑک دیتی۔ اماں بڑے غور سے ہانیہ کو دیکھتیں۔ آنکھوں سے کہیں۔ ”میں تمہارا سب ڈرامہ سمجھتی ہوں۔“ زندگی کے معاملات میں اماں اور ہانیہ ہمیشہ الجھے رہتے۔ دیکھتے دیکھتے وقت گزر گیا۔ اسامہ کی وہ دہن بھی لے آئی اماں کے سارے دوسے ختم تو ہو گئے مگر آنے والی رومیصہ کے کان میں اماں نے کچھ جملے پھونک دیئے کہ ہانیہ بہن کے لیے اسامہ کو پسند کرتی تھی۔ اب جونہی اسامہ کو ہنستے ہوئے رومیصہ دیکھتی وہ شک کی آگ میں جلنے لگتی۔ اسامہ آج بھی ہانیہ کو کسی نہ کسی بات پر چھیڑتا رہتا۔ اسامہ ان باتوں سے بے خبر ہانیہ کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔

☆.....☆

”دیکھو رومیصہ! ہم لوگ ایسے کیوں نہیں رہ سکتے جیسے حمزہ بھائی اور بھائی رہتے ہیں۔“
 ”ہاں تو اماں کہتی ہیں کہ آپ تو شروع سے ہانیہ بھائی کے دیوانے ہیں۔“
 ”ہاں یار بات تو سچ ہے مگر حمزہ بھائی ان کے سب سے بڑے دیوانے ہیں۔ سچ کہتی ہو تم بھائی کی منہ می میں تو نہیں البتہ ان کی شخصیت میں جادو ضرور ہے۔ حمزہ بھائی اتنے سنجیدہ انسان ہیں کہ جب شادی ہوئی حمزہ بھائی اور ہانیہ بھائی کی تو آفس کی لڑکیاں بھائی سے پوچھتی تھیں کہ حمزہ ہنستا ہے، بولتا ہے تو بھائی کہتیں کہ ہاں ہاں کیوں نہیں اور انہیں یقین نہیں آتا تھا۔ ویسے یار ایک بات اور ہے۔ ہم لوگ ڈرتے تھے کہ حمزہ بھائی کا کیا ہوگا ان کا غصہ اتنا تیز تھا۔“

”ہاں..... بھائی نے ایسا جادو کیا ہے کہ حمزہ بھائی ان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔“
 ”بالکل سچ کہہ رہی ہو تم وہ تو غصہ کرنا ہی بھول گئے ہیں۔ گھر میں تھکے مارے آتے ہیں لیکن اگر

بھائی سامنے آجاتی ہیں تو قسم خدا کی بھائی کھل اٹھتی ہیں میں چاہتا ہوں کہ میرا استقبال بھی تم ایسا ہی کرو۔“

”استقبال کرنے کے لیے ہانیہ بھائی موجود ہیں میری ضرورت نہیں۔“

”ٹھٹ آپ آہستہ بولو۔“
 ”دیکھا کیسا برا لگا۔ جائیں کمرے سے چلے جائیں۔ بیٹھیں جا کر ہانیہ بھائی کے پاس۔“

”میرا خیال ہے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ اسامہ غصے سے باہر آیا تھا۔ اماں نے سب باتیں سن لیں تو پلٹ کر رومیصہ کی طرف آئی تھیں۔

”دیکھو رومیصہ! ہانیہ عمر میں اسامہ سے بڑی ہے، شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں یہاں یہ سب نہیں چلتا۔“

”تو پھر بتا دیں اماں جان یہاں کیا چلتا ہے۔“
 ”بڑوں کی عزت کی جانی ہے یہاں۔ ہانیہ بننے کی کوشش کرو تم۔“

”کیا کہہ رہی ہیں اماں! میں ہانیہ بن جاؤں۔“

”ہاں میں یہی چاہوں گی کہ تم ہانیہ بن جاؤ تاکہ ہمارے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ جب تھکا ہارا حمزہ آتا ہے تو ہانیہ فوراً اس کی دیکھ بھال کرتی ہے اس کا خیال کرتی ہے۔ تم اور اسامہ تو ہر وقت لڑتے ہی لڑتے ہو یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ اماں بولی تھیں۔

”لیکن اماں! آپ ہانیہ بھائی کی طرفداری کر رہی ہیں۔“

”نہیں میں سچ بول رہی ہوں بیٹا۔ میں ہانیہ پر غلط شک کرتی تھی۔“

”آپ ہی کہتی ہیں کہ وہ جادو کرواتا ہے۔“
 ”ہاں کہتی تھی لیکن اب سچ جان گئی ہوں اور تم

بھی جتنی جلدی ہو سکے جان لو۔“
 ہانیہ جب واش روم سے شاہور لے کر نکلی تو ٹاول میں اس نے بال کیپٹے تھا تو حمزہ ایکسپریز می کہہ کر ہانیہ کے روم میں آیا۔

”بھائی میں آپ کا واش روم یوز کر لوں وضو کے لیے۔“

”واؤ.....“ جونہی اسامہ نے واش روم کا دروازہ کھولا تو اس کے منہ سے آواز نکلی تھی۔ قریب ہی کھڑی ہوئی رومیصہ، حمزہ کو غور سے دیکھنے لگی۔

”کیا بھئی بھئی خوشبو ہے واش روم میں۔“
 ”کچھ بھی نہیں اسامہ!“

”نہیں بھائی کچھ تو ہے بڑی زبردست مہک آ رہی آپ کے واش روم میں۔“

”ارے اسامہ! چھوڑیں۔“ رومیصہ بڑی چونکا سے دیکھ رہی تھی۔ بھی اماں وہاں آگئیں اور اسامہ کو دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا ہوا؟“
 ”کچھ نہیں۔“ رومیصہ غصے سے باہر نکل گئی۔

”اماں! بڑی بھئی بھئی خوشبو آ رہی ہے۔ بھائی کے واش روم سے لیکن بھائی بضد ہیں کہ انہوں نے کوئی اسپرے نہیں کیا۔“ اماں نے ایک گہرا سانس لیا اور مسکرا کر ہانیہ کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”ہانیہ! یہ شک و شبہات تم دور کر دو۔ میں تو سب جان چکی ہوں۔“ ہانیہ بری طرح چونک گئی۔

”کیا جان گی ہیں اماں جان آپ۔“ وہ حیران ہو کر بولی۔ تب تک اسامہ وضو کر کے واش روم سے باہر نکل چکا تھا۔ چھپے چھپے اماں بھی نکل گئیں۔

”اب کیا ہو گیا؟“ اسامہ جب اپنے کمرے میں گھسا تو بولا۔ رومیصہ منہ بنائے بیٹھی تھی۔

”جب بھی گھر آؤ میں تمہاری شکل سوگوارسی یا کسی غم میں ہوتی ہو۔ میں یہاں سے چلا جاتا

ہوں۔“ اسامہ بلند آواز میں چیخا تو ہانیہ جلدی سے بالوں کو ٹاول سے لپچھتی ہوئی اسامہ کے روم میں آئی اور اماں بھی آگئیں۔

”کیا ہوا رومیصہ! اسامہ کیوں چلا رہا ہے۔“
 تو رومیصہ بولی۔ ”انہیں تو بھائی کے واش روم میں سے بھی خوشبو آتی ہے۔“ ہانیہ اندر آچکی تھی تو رومیصہ نے چونک کر ہانیہ کو دیکھا۔

”دیکھا یہ ہے وہ جادو جو ہانیہ کے پاس ہے۔“ اماں بولیں۔ رومیصہ نے پھر ایک بار دیکھا پھر کمرے کے ماحول کو دیکھ کر حیرانگی سے سوچنے لگی۔

”ہانیہ ہمیشہ لائف بوائے شیپو استعمال کرتی ہے جس سے ماحول میں ایک تازگی سی محسوس ہوتی ہے اور حمزہ بھی خوش رہتا ہے۔“ اماں جان ہنس کر بولیں۔

”ارے نہیں! اماں جان ہاتھ ننگن کو آری کیا رومیصہ خود استعمال کر کے دیکھ لے۔“ اسامہ کا غصہ رنو چکر ہو جائے گا۔“

رومیصہ کو اماں کی بات سچ لگی۔ اسامہ غصے ہو کر گھر سے چلا گیا تھا۔

رومیصہ نے ہانیہ سے لائف بوائے شیپو لیا اور پھر شاہور لے کر جب وہ نکلی تو نہ صرف اس کے وجود سے بلکہ ماحول میں بھی بھئی بھئی خوشبو تھی۔

اسٹیپ میں کٹے بالوں میں جب وہ آہستہ آہستہ برش کر رہی تھی نہ صرف طہانیت بلکہ ایک بھئی سی مہک کے ساتھ اسے بہت چٹچٹ محسوس ہو رہا تھا اور جونہی اسامہ کمرے کے اندر داخل ہوا اسے بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا اور اس نے ارد گرد نظر ڈالی ویسا تو کچھ نہیں تھا مگر کچھ تو تھا کہ اسامہ مسکرانے پر مجبور ہو گیا اور رومیصہ ہنسنے لگی تو اسامہ اس کے قریب آ گیا۔

☆.....☆

الشیخہ کی بات

محلے میں غافلہ سا اٹھا کہ امداد بھائی کی شادی ہو گئی اور
تمام لڑکوں کی (پلائون) پلٹن دلہن دیکھنے پہلی۔
اندھیرے گھب کمرے میں دلہن نہیں دکھائی نہیں
دیتی تھی، پتا چلا کہ دلہن کی رنگت اچھی خاصی پکی تھی، لہذا

دیکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

☆.....☆

زیتون خالہ جب امداد بھائی سے شادی ہو کر
آئیں، تو ساس، سر اور نند پر مشتمل سسرال ملا۔ سر تو
چند ماہ بعد ہی انتقال کر گئے، رہ گئیں ساس اور نند تو ان
سے نبھنا کیا مشکل تھا، وہ اپنے نام کی ایک تھیں، ہر بات
کے بعد بحث اور بحث کے بعد وہ لڑائی ہوتی کہ
الامان والی محفظ۔

سارا قصور غربت کا تھا، پائی پائی کو ترسی ہوئی زیتون

خالہ جو اپنے ماں باپ کے گھر سے بھی غربت و افلاس
کے دن گزار کے آئی تھیں، یہاں بھی تنگی اور مسائل
دیکھ کر چڑچڑا جاتیں۔ ہر جنگ کے بعد ساس نند تھک
کے دوسرے کمرے میں جا بیٹھتیں، اگر زیتون خالہ کا
دل ابھی بھی نہیں بھرا اور لڑنے کا موڈ مزید ہے تو ستار
بھائی (پڑوسی) کی بیوی زندہ باد۔ وہ وہ باتیں ہوتیں وہ
وہ الزام لگتے کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے پورا محلہ جمع
ہو جاتا اور اگر ستار بھائی کی بیوی بھی تھک جاتیں تو
کوئے والی منی خالہ۔



ایک بار تو مٹی خالہ سے ایسی لڑائی ہوئی۔
فائر بریکڈ کی سرکاری کالونی کوارٹر، کسی غریب بستی
کا سامان پیش کرتے تھے۔

ایسی لڑائی ہوئی کہ مٹی خالہ کے بال زیتون خالہ کے
ہاتھ میں اور زیتون خالہ کے بال مٹی خالہ کے ہاتھ میں
اور دونوں کسی معروف و مشہور ریسرلر کی طرح داؤ بیچ
کر رہی تھیں۔ شکر ہے دفتر قریب ہی تھا دونوں کے
شوہر تک جھگڑے کی اطلاع بہم پہنچی تو دوڑے چلے
آئے اور اپنی اپنی زوجہ کو چھڑوایا، شکر ورنہ تو آج بغیر
نانی کے نائیل نائیل فٹ ہو جاتی تھی۔

☆.....

خیر اب تو ان کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ نندھی
شادی ہو کر دوسرے شہر بس گئی تھیں۔ رہ گئیں ساس وہ
ان کو آمد ادبھائی نے باہر راہ داری میں چھپر اڈال کر ایک
چھوٹا سا کمرہ بنا کر ان کی رہائش گاہ بنادی تھی۔ سو وہ اپنی
زندگی کے آخری دن کاٹ رہی تھیں۔

اب تو معر کے بھی ماضی کے قصہ ہوئے۔

ان کے بچے راجیل جاوید اور ارشد بھی بڑے ہو گئے
تھے۔ جاوید اور ارشد کے نوکری کرنے سے حالات بہتر
ہونے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ سنا تھا کہ راجیل بھی
میٹرک کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر لگ گئیں
تھیں۔ بچوں کے مستقبل تباہ کرنے کے لئے۔

نتیجہ سو ماہوار تنخواہ تھی جس میں سے دس روپے کی
روزانہ بریک میں بریائی کھا لیتی تھی۔ یہ بات ہمیں خالہ
زیتون نے بڑے فخر سے بتائی تھی جس پر ہم اپنا تہقبہ
روکتے کرے سے باہر بھاگے۔

☆.....

گھر کے حالات تبدیل ہو رہے تھے، اب گھر میں
تھوڑی خوش حالی نظر آنے لگی تھی۔

زیتون خالہ جنہیں ہم نے بھی اچھی کواٹی کا کپڑا
پہنے نہیں دیکھا تھا، اب سال میں دو سوٹ لان کے
بنائے لگئیں تھیں۔

☆.....

ایک بار ہم اور ہماری بڑوں سلمی میٹھے تھے کہ زیتون
خالہ آئیں۔ وہ کالے رنگ کا برقعہ اوڑھا کرتی تھیں
رنگت تو ان کی پہلی ہی۔

اب تو اور بھی حالات کی ستم ظریفی ان کے چہرے
سے عیاں ہوتی تھی۔

خیر خالہ بڑی خوش دکھائی دے رہی تھیں، اور وجہ
ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی، ان کے گلے تک بند
برقع کے اوپر سے نکالی گئی سونے کی چین، جو ہمیں
دکھانے کے لئے نکالی گئی تھی، تاکہ ہم دیکھ کر پوچھیں۔
اور ہم پوچھنے ہی والے تھے مگر سلمی نے ہمیں شہوکا
دے کر روک دیا۔

کہ مت پوچھو سو ہم چپ ہو گئے، چائے پینے کے
بعد زیتون خالہ جانے لگیں، ان کا چہرہ ایک دم مجھ سا
گیا۔

وہ جانے کو کھڑی ہوئی تھیں کہ میں نے چونک کے
پوچھا۔

”ارے واہ خالہ! سونے کی چین لی ہے کیا“

ہم نے (ایکسٹرا زوری) اشتیاق دکھایا۔

زیتون خالہ جو بھی ہوئیں تھیں ایک دم کھل اٹھیں۔

”ہاں ناں۔۔۔ اپنے ارشد کی خواہ میں سے لی ہے
ڈالی تھی، وہ کھلی تو تمہارے خالو نے کہا پوری زندگی کچھ
نہیں دلو اسکا، اب پیسے آئے ہیں تو سونے کی چین
بنوالو۔ پھر ارشد کی بھی یہی مرضی تھی۔“

اور میں سوچ رہی تھی کہ ایک عورت جس نے کبھی
کوئی خوشی نہیں دیکھی اسے اگر اتنی سی بات سے سچی خوشی
مل جائے تو کیا برا ہے۔

میرے دل میں ایک اطمینان سا اتر گیا۔ اور میں
خالہ سے تفصیل پوچھنے لگی۔

☆☆☆

فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

☆ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو دیکھے اور سکھائے۔

☆ حق سبحانہ و تقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت
نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی
فضیلت سے بھیجی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

☆ حدود و شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات
اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔
☆ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و
ذلیل کرتا ہے۔

☆ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور پھر پھر
پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں پھر پھر کر پڑھا کرتا تھا۔ پس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

☆ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔
میں نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، ہم ایک حرف ہے۔

☆ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی
سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

☆ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل
فرمادیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرماویں گے جس کے لئے جہنم
واجب ہو چکی ہو۔

☆ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

☆ داؤں کو بھی رنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی نکلنے سے رنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت
ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

☆ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق
سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

☆ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چاند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

☆ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا عین صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا اخفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

☆ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی تہ نہ فرشتہ وغیرہ۔

☆ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سکھ لے تو تو اہل کی 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سکھ
لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات فضل پڑھنے سے بہتر ہے۔

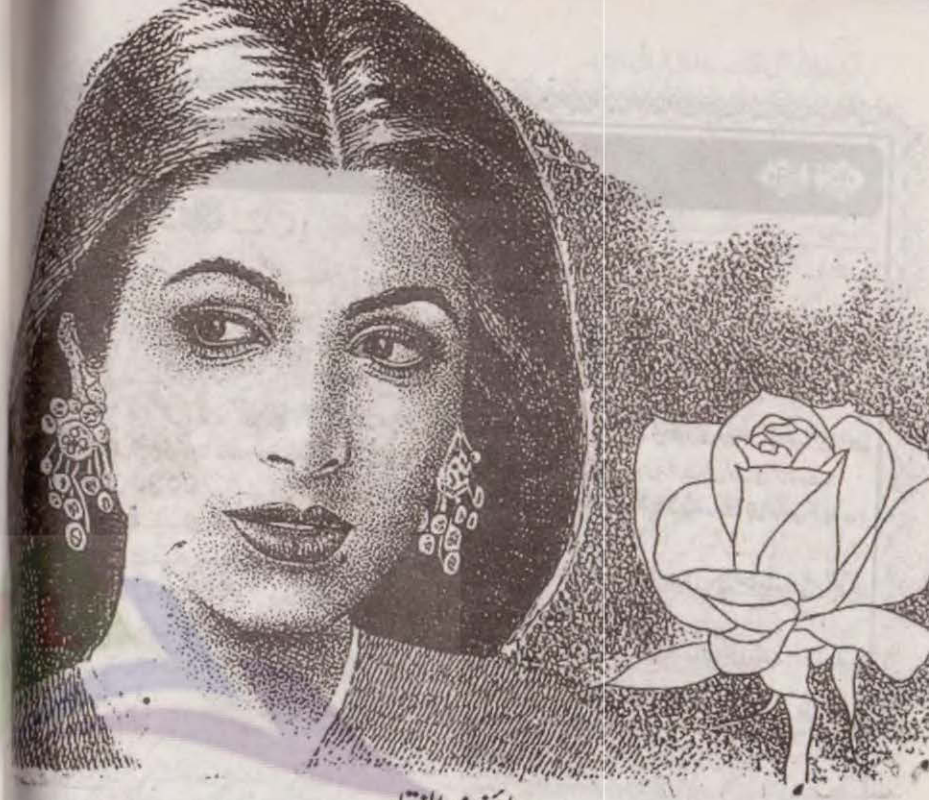
☆ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فقہ ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان
سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔



Tunjidhnsar

عزت دینے کے بعد اس قدر محبت کرنے کے بعد، اس قدر محبت کرنے کے بعد یہ صلہ بننا تھا میرا کہ انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ ”حاری یہ سب کیوں کیا؟ ایک بار بھی میری بات نہ سنی، ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ حزمہ تو پرایا تھا غیر تھا، اس سے تو ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں بنا تھا میرا سو اس سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا مگر میرے ابو جی..... میری اماں..... عارش..... یہ تو میرے اپنے تھے۔ میرے سانبان تھے۔ میری عمر بھر کا سرمایہ تھے۔ ایک بار مجھ پر اعتبار تو کرتے۔ ایک بار تو پوچھتے کہ ”حاری یہ سب کیوں کیا؟“ پر نہیں پوچھا۔ کچھ نہیں پوچھا۔ کچھ نہیں مناصف اپنی ہی سناتے چلے گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا اور لہان کر دیا۔ نیل و نیل کر دیا۔ میری اپنی اماں میرا گلا دبانے کے درپے ہو گئیں۔ کیوں ہوتا ہے ایسے، مجھے وہیں دیوار کے ساتھ گرے ہوئے نہ جانے لٹی در ہو گئی تھی۔ خون رس رس کے آخر خود ہی چھنے لگا تھا۔ پورے بدن میں اکڑاؤ ہو رہا تھا۔ ابو جی نے آنے والے مہمانوں سے یہی کہا کہ میں ان کی بیٹی تھی ہی نہیں۔ کہیں کسی سڑک کے کنارے سے اٹھا ہوا تھا انہوں نے مجھے نہ جانے کس کا خون بھی میں جس نے اوقات دکھا دی تھی۔ عمیر کو کیا فرق پڑا۔ اور بھر بھی نہیں مگر میں لحوں میں تباہ ہو گئی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر عارش نے آکر مجھے ہلایا تھا۔ ”حاری اٹھ! سر عمیر آئے ہیں۔“ میں بمشکل دیوار کا سہارا لے کر اٹھی۔

فصل نمبر 4



عائشہ ذوالفقار

سلسلے وار ناول

لڑکھالی قبری بدرگاہ

اپنی پوری زندگی آنکھ بند کر کے ان کی ہر بات پر اعتبار کیا میں، نے ان کی ہر بات کے آگے اپنی بات ختم کر دیا کرتی تھی میں جو انہوں نے کہا ہمیشہ وہی کہا، یہ بھی ناں نہیں کی۔ بی ایس بی کے دوران صبح سات بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک میں ان کی نظروں سے اوچھل 35 کلومیٹر دور رہا کرتی تھی۔ وہ کون سا دیکھتے تھے مجھے۔ انہیں کون سا کچھ پتا چلنا تھا مگر میں نے ایک بار بھی ان کا اعتبار چکنا چور کرنے کا نہ سوچا۔ بھی ان کے مان کو نہیں نہ پہنچائی۔ دو سال ان سے دور یونیورسٹی میں گزارے۔ میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر نہ ملی۔ ابو جی کا مان اور بھر وسہ ہمیشہ بلند ہی رکھا، میری وجہ سے انہیں بھی کوئی غلط بات سننے کو نہ ملی۔ کبھی میری وجہ سے کوئی پشیمانی نہ ہوئی۔ کبھی کوئی شکایت نہیں ملی۔ جب بھی انہوں نے میرا ڈکڑنا، جس سے بھی سنا ہمیشہ اچھے لفظوں میں سنا۔ وہ خود کہتے تھے کہ حاری نے تو میرا سراونچا کر دیا، اب عارش کی باری ہے۔ تو کیا اس سب کے بعد اس قدر

”اب یہ کیوں آیا ہے؟“ یہ ہی سوچتے ہوئے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ عمیر میرا حشر دیکھ کر ہولے سے مسکرایا تھا۔ میں بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”انگل جی! آپ جانتے ہیں کہ کوئی اور ہوتا تو کسی صورت یہاں نہیں آتا لیکن آپ کی عزت یوں نیلام ہونے سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں ہونے والا، میرے معافی مانگنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ میں نے اسے نہیں بلایا تھا، یہ خود چل کر آئی تھی۔“ میں نے تڑپ کے ایکدم عمیر کی بات کا لی۔

”خدا کا خوف کرو تم نے مجھے عارش کا نام لے کر بلیک میل کر کے زبردستی.....“ میری بات ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ابوجی کا زانے دار پیٹھ میرے گال پر پڑا۔ میں ایک دم جھٹکا کھا۔ عمیر کے پاس زمین پر گر گئی۔

”اب بکو اس کی تو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔“ ابوجی سرد لہجے میں بولے تھے۔

”بیٹے عزت تو نیلام ہوگئی ہے میری، اس نا تنجار کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو مہربانی ہوگی۔“ میرے ماتھے سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

”میں اس سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک چھوٹی سی شرط پر۔“ عمیر بولا۔

”بیٹے تمہاری کسی بات کے جواب میں ”کیوں“ کہنے کا بھی حق نہیں رکھتا ہوں تو ناں، تو بہت دور کی بات ہے بولو۔“ ابوجی ہولے سے بولے تھے۔ عمیر نے جوتے سے اپنا پاؤں نکالا اور ناگ سیدھی کر کے میز پر رکھی۔

”یہ لو ویڈیو بناؤ ذرا۔“ اپنا موبائل عارش کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔

”میں نے بے یقین نظروں سے عمیر کی طرف دیکھا۔

”بس اتنی سی شرط ہے میری۔“ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”حاری پکڑ اس کے پاؤں۔“ ابوجی نے تیز آواز میں کہا۔

”اتنا سب کچھ کر کے تمہیں سکون نہیں ملا۔“ میرے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔

”حاری! چپ چاپ اس کے پاؤں پکڑ لے۔“ عارش ویڈیو بنانا شروع ہو گیا تھا۔

”ایک دو لمحوں کا درد نہیں ہے حائقہ ارشد جوتی آسانی سے سکون مل جائے گا مجھے۔ کئی بیٹیوں کی اذیت ہے جاتے جاتے ہی جائے گی۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔

”حاری!“ ابوجی کی شاید بس ہوگئی تھی۔ مجھے بالوں سے پکڑا۔ اس نے اپنا پاؤں میرے لبوں سے لگایا۔

عمیر ہولے سے مسکرایا۔

”بلائیں مولوی صاحب کو۔“ کہتے ہوئے اس نے میز پر سے پاؤں ہٹایا۔ دس منٹ کے اندر اندر میرا اس سے نکاح ہو گیا۔ نہ جانے کس نے میرے سر پر چادر ڈالی تھی۔

”حاری! اب بے شک مرجائیں مگر دوبارہ میرے گھر مت آئیں۔“ ابوجی نے بازو سے تھکیت کے مجھے گھر سے باہر نکالا۔

”آج کے بعد بھول جائیں کہ تیرے ماں باپ بھی تھے، تیرا کوئی تھا اور نہ ہے۔“ یہ آخری بات تھی جو ابو جی نے مجھ سے کہی تھی۔ اس کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔

☆.....☆

وہ ابھی نہا کے واش روم سے نکلا ہی تھا کہ موبائل کی بپ ہوئی۔ کوئی MMS آیا تھا، تو لیے سے بال خشک کرتے ہوئے اس نے Play کا بٹن پریس کیا تھا اور.....

رداؤ انجسٹ [220] مارچ 2016ء

”آئی لو یو، آئی لو یو سوچ۔“ وہ ہنسی ہوئی آواز حائقہ کی ہی تھی۔ تو یہ ایک دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بے یقینی کی آخری حدوں کو چھوٹا وہ ایکدم بستر پر گر اٹھا۔ ویڈیو بند ہوگئی اس سے پہلے کہ اسے کچھ سمجھ آئی عمیر کی کال آگئی۔ غائب دماغی سے اس نے کال اٹینڈ کی تھی۔

”کیسی لگی وہ ویڈیو.....؟“ عمیر کی مسکراتی آواز اس کے وجود میں پھل پھل چلا گئی۔

”عمیر! یہ سب کیا ہے؟“ اس نے گھمبیری ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

”واقعی نہیں نہیں پتا، حارث یہ وہی چار سال پہلے والا سین ہے۔ بس کر دار بدل گئے ہیں۔“ عمیر بولا تھا۔

”گھٹیا پن کی بھی انتہا ہوتی ہے عمیر راؤ! آج رات نکاح ہے اس کا، وہ بھی اس شخص سے جو مجھ سے زیادہ تمہارا دوست ہے۔“ حارث کی آواز میں دکھ بول رہا تھا۔

”نکاح ہے نہیں، نکاح تھا، میں نے یہ ویڈیو حمزہ کو بھی Send کی ہے۔“ حارث کو جیسے ایک دم دھچکا لگا۔ وہ بول نہ سکا۔

”اور وہ یقیناً مجھے نہیں حائقہ کو ہی غلط سمجھے گا کیونکہ رو بھی وہی رہی ہے۔ بول بھی وہی رہی ہے اور چل کر بھی وہی میرے پاس آئی ہے۔“ عمیر ہنس رہا تھا۔

”تم سے غلطی ہوگئی حارث! تمہیں حمزہ کے حق میں دستبردار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب ذرا دیکھنا تم، کیسے تمہارے سامنے اسے حمزہ سے کھینچتا ہوں۔“ عمیر ہنستے ہوئے کال ڈس کنکٹ کر گیا۔ حارث کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بھاگتا ہوا نیچے آیا بایک نکالی اور طوفانی رفتار سے بایک اڑاتا حمزہ کے گھر آیا۔

”حمزہ کہاں ہے؟“ اس نے حمزہ کے چھوٹے بھائی سے پوچھا تھا۔

”حمزہ بھائی! ابھی تو نہیں تھے پتا نہیں کہاں گئے۔“ وہ کہتا ہوا ادھر ادھر ہو گیا۔ حارث کا ذہن بند سا ہوتا جا رہا تھا۔

”نیچا نے کہاں گیا ہوگا؟“ کہتے ہوئے اس نے حمزہ کا نمبر ملایا۔ نمبر بند تھا۔ بار بار اس کا نمبر ملا تو وہ باہر کی طرف آیا۔ ابھی اس نے حمزہ کو آتے دیکھا اس کا ستا ہوا چہرہ حارث کو سب کچھ سمجھا گیا۔

”کہاں گئے تھے تم؟“ حارث تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔

”کہیں نہیں۔“ کہتا ہوا وہ اندر آیا۔

”کب تک جانا ہے بارات لے کر۔“ اس نے پھر پوچھا۔

”حارث! مجھے کہیں نہیں جانا بارات لے کر، ختم ہو گیا سب کچھ کہیں نہیں جا رہے ہم۔“ اونچی آواز میں کہتا وہ دوبارہ اندر کی طرف بڑھا۔

”حمزہ میں نے وہ ویڈیو دیکھی ہے۔“ حارث کی آواز نے ایک دم اس کے قدم روکے۔ حیران نظروں کے ساتھ وہ ایکدم پلٹا۔

”اتنا ہی اسے تیرا خیال تھا تو حائقہ کی اصلیت صرف تجھے بتاتا ناں مجھے وہ ویڈیو بھیجنے کا کیا تنگ تھا۔“ حارث بولتے ہوئے آگے کو آیا۔

”حمزہ! وہ صرف تجھے بدظن کرنا چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔“ حارث نے اسے سمجھانا چاہا۔

”حارث میں پاگل نہیں ہوں۔ بچ نہیں ہوں میں حائقہ سے مل کر آ رہا ہوں، اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ

رداؤ انجسٹ [221] مارچ 2016ء

عمر کے پاس گئی تھی آج اور اس نے عمر سے خود یہ سب کہا ہے۔ ”حزہ اونچی آواز میں بولا۔ حارث چپ رہ گیا۔“

”حارث فرشتہ تو ہوں نہیں میں کہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود ماننے سے انکار کر دوں۔ اسے جانتا تھا کہ آج میرا اور اس کا نکاح ہے پھر کیوں گئی اس کے پاس؟ چلو مان لیتا ہوں کہ اس نے بلایا تو کیا منع نہیں کر سکتی تھی۔ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بلانے پر بھی کیوں گئی۔ اتنی کیا قیامت آ رہی تھی اس کی بات ماننے کی۔“

حارث، عمر نہیں بول رہا۔ وہ بول رہی ہے۔ روتے ہوئے اظہار محبت کر رہی ہے اس کے گلے لگ کے کہہ رہی ہے کہ اس کے بغیر میرے جانے کی۔ اتنا کیسے مجبور ہو گئی وہ ایکدم اس کے سر پر کسی نے پستول رکھا ہوا تھا کہ نہیں کہے گی تو مر جائے گی۔ ”حزہ کی آواز بھرا رہی تھی۔“

”اور حارث..... اس تو بہتر وہ مر جاتی مگر یہ سب نہ کہتی۔ اتنا ہی پیار کرتی تھی اس سے تو اسی سے شادی کر لیتی۔ میرے لیے ہاں کیوں کی۔ میں نے کوئی مجبور تو نہیں کیا تھا کہ منع کرتی تو کنویں میں پھینک دیتا۔“

حزہ کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

”حزہ! ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ اسے عمر نے نہیں بلایا۔ وہ خود گئی اس کے پاس، پر عمر بھی بچہ تو نہیں تھا۔ انجان تو نہیں تھا تیرا دوست تھا اسے سب جانتا تھا تیرے اور حارث کے بارے میں۔ جانتا تھا وہ کہ آج رات تیرا اور اس کا نکاح ہے۔ پھر کیوں نہیں روکا اس نے حارث کو، کیوں آگے آنے دیا اسے۔ کیوں نہیں کہا کہ دروازے سے ہی واپس چلی جاؤ۔ یہ سب غلط ہے۔ کیوں نہیں کہا کہ تم میرے دوست کی امانت ہو اور میں خیانت نہیں کر سکتا۔“ حارث کی آواز بھی ادا ہو گئی۔

”حزہ تو کچھ نہیں جانتا وہ یہ سب صرف مجھے اذیت دینے کے لیے کر رہا ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں حارث اور اس کی فیملی کو وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

”حزہ نے ایکدم اس کی بات کاٹی۔“

”حارث پلینز یا! تیری ساری باتیں ٹھیک ہوں گی مگر اس نے اپنی ماں اور باپ دونوں کے سامنے اقرار کیا ہے کہ وہ آج خود عمر کے پاس گئی تھی اور اس نے یہ سب خود عمر سے کہا ہے اور حد تو یہ ہے کہ اس سارے واقعے سے اس کے والدین بھی انجان ہیں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اماں کو ایسے بتاؤں۔“

”حزہ کہتا ہوا اندر بڑھ گیا۔ حارث چپ کھڑا رہ گیا۔ عمر کا داؤ چل چکا تھا۔ واقعی..... کسی نے یہ تھوڑی سوچنا تھا کہ حارث نے یہ سب کیوں کیا۔ آج اگر وہ حارث جاوید نہ ہوتا تو خود بھی یقیناً حارث کو ہی غلط سمجھتا۔ لیکن آج اگر کوئی حارث کے حق میں تھا۔ تو وہ حارث جاوید ہی تھا کیونکہ وہ عمر کی رگ رگ سے واقف تھا۔ صرف وہ جانتا تھا کہ عمر یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ صرف وہ تھا جو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے اور کانوں سے سب کچھ سننے کے باوجود حارث کو غلط نہیں کہہ رہا تھا کیوں؟ کیونکہ وہ حارث سے بہت محبت کرتا تھا یا پھر..... عمر سے بہت نفرت کرتا تھا۔ حزہ نے شاید اندر بار بار لے جانے سے منع کر دیا تھا بھی ایک دم سناٹا ہو گیا۔ حارث ہولے سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔“

”عمر! صرف مجھے جھکانے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

”صرف مجھ سے بدلہ لینے کے لیے وہ حارث کو اذیت دے رہا ہے۔ تکلیف دے رہا ہے۔“ وہ چلتے چلتے ایک دم رکا۔

”کیا فائدہ میری اس محبت کا جو حارث کو خوشی نہ دے سکے جو اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنے۔ جو اسے رسوا کر دے۔“ اس نے ایکدم فیصلہ کیا۔

”اپنی چاہت کو یوں رسوا نہیں ہونے دوں گا میں چاہے مجھے عمر کے آگے ہاتھ ہی کیوں نہ جوڑنے پڑیں۔“

سوچتے ہوئے اس نے بایک نکالی اور رخ عمر کے کھر کی طرف موڑ دیا عمر کو ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ آئے گا۔ بھی اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”کیوں کر رہے ہو یہ سب؟“ حارث نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

”کیونکہ آج مجھے یہ سب کرنے کا موقع ملا ہے۔ میری جگہ تم ہوتے تم بھی یہی کرتے بلکہ کرتے کیا چار سال پہلے تم نے بھی تو یہی کیا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میری محبت میری آنکھوں کے سامنے سے چھین لی تھی تم نے ایسے ہی رسوا کیا تھا تب تم مجھے۔“ حارث کی بس ہو گئی۔

”فارگاڈ میک عمر! بس کرو چار سال سے تم اس محبت کا ماتم کر رہے ہو جو تمہیں تھی ہی نہیں۔“ عمر نے ایک دم اس کی بات کاٹی۔

”تمہیں کیسے پتا کہ مجھے عزیزہ سے محبت نہیں تھی۔ تم نے میرے دل میں جھانک کر دیکھا تھا کیا؟“ عمر کا کرب اس کی آنکھوں سے جھلکا تھا۔ حارث اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں غلطی ہو گئی مجھ سے، مجھے تمہارے اور عزیزہ کے بیچ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے جو کیا غلط کیا مگر پلینز اب تم وہ غلطی دوبارہ مت دہراؤ، عمر یہ یونیورسٹی نہیں ہے کہ تم حارث کے قریب آؤ گے۔ میں تم سے لڑوں گا اور کھیل ختم ہو جائے گا۔ پانچ زندگیوں کا سوال ہے یا پلینز۔“ حارث نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”بہت عرصے بعد مجھے ایسا موقع نصیب ہوا ہے حارث جانی! اتنی جلدی نہیں گناؤں گا۔“ عمر ہنسا تھا۔

”عمر! میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑنے کو تیار ہوں لیکن پلینز میری وجہ سے اس معصوم لڑکی کو کدوہ مت دو، اسے یوں رسوا نہ کرو پلینز۔“ حارث دو قدم آگے آیا تھا۔ عمر ہولے سے مسکرایا۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ تمہیں تمہاری اوقات کے اندر میں ہی لے کر آؤں گا۔“ وہ کہتے ہوئے رکا۔

”جوڑو ہاتھ۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا حارث نے چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔ عمر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”کتنا مجبور کر دیتی ہے ناں محبت.....“ وہ حارث کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”پلینز! حزہ کو فون کر کے سب بتا دو پلینز۔“ حارث ہولے سے اپنے دونوں ہاتھ کھولتے ہوئے بولا۔

”پتا ہے حارث! پراہلم کیا ہے۔ پراہلم یہ ہے وہ مجھے تم سے زیادہ بری لگنے لگی ہے۔ تم سے زیادہ اذیت دینا شروع ہوئی تھی وہ مجھے۔ میرے رستے کی راکاوٹ بننے لگی تھی وہ اور کاوشیں دور کیے بغیر میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پاتا۔ سو اسے تو میں اپنے رستے سے ہٹا کے ہی دم لوں گا۔“ عمر اٹل لہجے میں بولا تھا۔

”تمہیں اس کے میری اکیڈمی میں بڑھانے سے پراہلم ہے ناں تو میں منع کر دوں گا اسے آج کے بعد سے نہیں آئے گی وہ میری اکیڈمی میں۔ وعدہ کرنا ہوں تم سے۔“ حارث کوششوں پر کوششیں کر رہا تھا۔

”اچھا تو پھر یہ بھی وعدہ کرو کہ وہ اور کسی اکیڈمی میں نہیں جائے گی۔ یہ بھی وعدہ کرو کہ میرا کوئی اسٹوڈنٹ رائل چھوڑے اس کی طرف نہیں جائے گا۔ یہ بھی وعدہ کرو کہ میں اپنے کسی اسٹوڈنٹ کے منہ سے اس کا نام نہیں سنوں گا۔ یہ بھی وعدہ کرو کہ وہ کہیں کم ہو جائے گی۔ دوبارہ بھی میں اس کا نام نہیں سنوں گا۔“ حارث اسے دیکھ کر رہ گیا۔

سے پہلے کہ وہ اسے زندہ درگور کریں جا کے اپنا لے اسے۔“ سلمان نے اسے کھڑا کیا تھا۔

”ابو کو بتادوں؟“ حارث دروازے کے قریب جا کے رکھا۔

”پہلے کیا سارے کام ابوجی سے پوچھ کر کرتا آیا ہے تو۔ بعد میں بتادیں۔“ سلیمان بایک اشارت کرتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں ہال پہنچے تو وہ تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ سلمان نے بایک کارخ حائقہ کے گھر کی طرف موڑ دیا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی عیسرا اپنی اس چھوٹی سی غلطی کو سدھار کر چاچا کا تھا۔

”انکل جی حائقہ.....!“ بند دروازہ کی مرتبہ کھٹکھٹانے پر کھلا تھا۔

وہ جس کے پاس جانا چاہتی تھی میں نے ہمیشہ کے لیے اس کے پاس ہی بھیج دیا ہے اسے عیسر لے گیا ہے اسے نکاح کر کے اور آئندہ اس دہلیز پر آکر کبھی اس کا نام مت لینا۔“ حارث بن کھڑا رہ گیا۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ سچی اس کے موبائل کی بیل بجی ایک اور ایم ایم ایس اس نے لرزتی انگلیوں سے Play کا بٹن دبایا تھا۔ عروسی جوڑے میں ملبوس خوں اور نیل و نیل چہرہ لیے حائقہ عیسر کے پاؤں چومتی اس کی روح تک کھینچ گئی۔ سلمان بھی دم بخود رہ گیا تھا۔

”میری آج سے خدا سے ایک ہی دعا ہے عیسر کہ کاش تم جیسا موقع زندگی میں کم از کم ایک بار مجھے بھی ملے کاش.....“ حارث نے آنکھوں کے گوشوں میں آیا پانی صاف کرتے ہوئے سلمان سے کہا۔

”چل.....“ اور سلمان نے بایک اشارت کر دی۔

☆.....☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب وہ مجھے لے کر اپنے گھر داخل ہوا، شاید وہ گھر والوں کو کچھ بتا کے میری طرف آیا تھا سچی جب میں اس کے پیچھے پیچھے لاؤنگ میں داخل ہوئی تو میڈم شہینہ صوفے پر بیٹھیں جاگ رہی تھیں۔ عالیہ ان کے کندھے سے ٹیک لگائے شاید اونگھ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم تمہارا تو آج نکاح تھا ناں۔“ وہ حد سے زیادہ حیران ہو رہی تھیں۔

”تو نکاح ہی ہوا ہے ماما میرے ساتھ۔“ عیسر ہنسا تھا۔

”اور ایسے بھی یہی چاہتی تھیں ناں آپ کر دی میں نے آپ کی خواہش پوری بنادیا آپ کی فیورٹ حائقہ ارشد کو آپ کی بہو۔“ میڈم شہینہ اور عالیہ دونوں دم بخود کھڑی تھیں۔ میں ان سے نظریں بھی نہ ملا سکی۔

”اوپر.....“ عیسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں چپ چاپ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”آپ کی انجمنیں صبح دوڑ کر دوں گا۔“ ہولے سے کہتا ہوا وہ میرے پیچھے ہی اوپر آیا تھا۔

”تم تو آج مجھ سے زیادہ خوش ہو گئی ناں کیونکہ مجھ سے پیار کرنے کے بعد تم نے کہیں نہ کہیں تو اس رات کی خواہش کی ہوگی۔“ ہے ناں۔“ اس نے میرے ساکت وجود کو پیچھے سے آکر حصار میں لیا تھا۔ میرے سر سے چادر سرک کے ایک دم نیچے جا گری۔ عیسر کی سائیں میری گردن سے گھلنے لگی تھیں۔

”میری بات نہیں مانی تھی نا تم نے۔ تو اب آنے والی زندگی میں کوئی گلہ مت کرنا۔“ اس کا حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

”جو مجھے ذرہ بھر دکھ دیتا ہے ناں میں اسے چٹان جیسا بدلہ دیتا ہوں۔“ وہ میرے وجود کو پوری طرح سمیٹتے ہوئے بولا تھا۔

”ابھی تو کھیل شروع کیا ہے میں نے حارث جاوید اتنی جلدی ختم تھوڑی کروں گا۔ آج تو صرف ہاتھ جوڑے ہیں ناں تم نے۔ کل قدموں میں گر کے روؤ گے بھی اور رہ گئی حائقہ ارشد..... اس کا تو نام و نشان مٹا دوں گا میں۔ وعدہ کرتا ہوں تم سے کہ چند دنوں میں لوگ اس کا نام تک بھول جائیں گے۔“ عیسر کے لفظوں سے صرف نفرت ٹپک رہی تھی۔

”کاش اتنا اونچا اڑنے کے بعد تم جہاں گرو وہاں میں کھڑا ہوں عیسر راؤ۔“ حارث ہولے سے بولا تھا۔

”اچھا تب تم کیا کرو گے؟“ عیسر نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

”یہ تب ہی بتاؤں گا جب گرو گے۔“ حارث کہتے ہوئے باہر آیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو عیسر کے پاؤں بھی پکڑ لیتا۔ رو کر اس سے معافی بھی مانگ لیتا مگر حائقہ کو اتنی رسوائی سے ضرور بچا لیتا لیکن عیسر کو آج اس کی معافیوں اور آنسوؤں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف حائقہ کو برا دکھانا تھا اور وہ شاید کر چکا تھا۔ وہ ابھی عیسر کے گھر سے نکلا ہی تھا کہ سلمان کی کال آ گئی۔

”حارث! کہاں ہے تو.....؟“ سلمان پریشانی سے بولا تھا۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟“ اس نے ایک دم پوچھا۔

”میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہال گیا تھا لیکن وہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا یار، حائقہ کے والد نے سب کو کہہ دیا ہے کہ بارات نہیں آئے گی۔“ حارث نے اس کی بات کافی۔

”سلمان! تو مجھے اس اکیڈمی میں آکے مل پارس بتاتا ہوں تجھے۔“ حارث نے اسے کہہ کے بایک کارخ اکیڈمی کی طرف کیا ماجرا کیا ہے یار؟“ اس نے آتے ہی پوچھا تھا۔ حارث نے اسے مختصر آسب کہہ سنایا۔

”واٹ! تو عیسر کے آگے ہاتھ جوڑ کے آیا ہے۔“ ساری گفتگو میں سلمان کو یہی ایک بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”ہاں مگر کاش میرے ہاتھ جوڑنے کا کوئی فائدہ ہوتا۔“ حارث بے بسی سے بولا تھا۔

”اب کیا ہوگا حارث؟“ سلمان پریشانی سے بولا۔

وہ حارث نے کندھے اچکا۔

عیسر سے اتنے گھٹیا پن کی امید نہیں تھی مجھے۔“ حارث نے ہولے سے کہا۔ سلمان ایک دم چونکا۔

”حارث! تجھے یہ تو یقین سے ناں کہ حائقہ بے قصور ہے۔“ حارث نے غصے سے اسے دیکھا۔

”تجھے ابھی بھی کوئی شک ہے کیا؟“ سلمان ایک دم اس کے قریب آیا۔

”تو حائقہ سے شادی کر لے۔“ حارث دم بخود رہ گیا۔

”عیسر یہی نہیں چاہتا ناں تو یہی کر۔“ اس نے حارث کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”یہاں آکر عیسر سے غلطی ہو گئی۔ اسے تجھے اتنی جلدی سب کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اب تو اس کی اس غلطی سے فائدہ اٹھا۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑنے کا بدلہ تو لے کم از کم اپنا لے حائقہ کو کیونکہ حمزہ تو اب اسے کسی صورت نہیں اٹھائے گا۔“ سلمان شاید درست تھا حارث سوچ میں پڑ گیا۔

”مگر حائقہ..... وہ مان جائے گی کیا.....“ وہ بولا تھا۔

”حارث جن لڑکیوں کے ساتھ عین بارات والے دن اتنی رسوائی ہو جائے ناں وہ تو جینے کا حق ہی کھودیتی ہیں نہ کہ بولنے کا اختیار۔“ میں دیکھ کے آیا ہوں اس کے ابو کا چہرہ کھلی نظر میں اٹھائیں پار ہے تب وہ۔ اب اس

”وعدہ ہے تم سے کہ تمہیں یوں مٹاؤں گا کہ پھر کسی ابھر نہیں پاؤ گی۔“ وہ اپنے لبوں سے میرے وجود پر نقش بناتے ہوئے بولا تھا۔ میرے بس میں تو شاید ماتم کرنا بھی نہیں تھا۔
 ”تم سے اتنی نفرت نہ کی ہوئی۔“ ناں تو قسم سے آج رات تم سے پیار ہو جاتا۔“ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔

☆.....☆

میرے سورج کے ساتھ ہی شاید میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا دھنکارا ہوا۔
 بھونکارا ہوا۔

جس کی شروعات ہی عمیر کے تپشور سے ہوئی۔ عمیر کے نزدیک میری اوقات ایک ملازمہ کے برابر بھی نہیں تھی۔ جب جی چاہتا لفظوں سے لہو لہان کر دیتا اور جب جی چاہتا۔ ہاتھوں سے لہو لہان کر دیتا۔ اس کی اجازت کے بغیر مجھے بولنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس کی موجودگی میں، میں بیٹھ نہیں سکتی تھا۔ کھانسی سکتی تھا۔ پی نہیں سکتی تھی۔ بول نہیں سکتی تھی۔ ابو جی کے ہاتھوں نے اس رات میرے چہرے اور بدن پر جونیل اور زخموں کے نشان چھوڑے، عمیر کے ہاتھوں نے انہیں بھی مندمل ہونے ہی نہ دیا۔ میں اس کے ہر لمس کی تسکین تھی۔ ہر دکھ کا ازالہ تھی۔ ہر زخم کا مرہم تھی۔ ہر اذیت کا بدلہ تھی۔ میڈم شیمین چند دن تو مجھ ہی نہ پائیں کہ آخر ہوا کیا تھا۔ پھر جیسے جیسے انہیں لوگوں سے خبریں مانتی گئیں مجھ سے بدظن ہوئی گئیں۔ عالیہ نے بھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ اس دن وہ صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ میں ان کے پاس ہی نیچے بیٹھ کے بڑی چھیلے گی۔ میرے آتے ہی عمیر نے ہر ملازمہ کی چھٹی کرادی تھی۔ انہوں نے اخبار سے نظر ہٹا کر مجھے دیکھا۔ عمیر نے رات کھل کے اپنے دکھوں کا بدلہ لیا تھا۔ میرے چہرے اور بازوؤں پر جا بجا زخموں کے نشان تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

”حادثہ! میں آسانی سے لوگوں سے امپر لیں نہیں ہوا کرتی لیکن تم سے چند دنوں میں ہی ہو گئی تھی۔“ میں چپ چاپ سنتی رہی۔
 ”اکثر میں عالیہ سے کہا کرتی تھی کہ لڑکی ہو تو تم جیسی، ذہین، بااخلاق، مضبوط۔“ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

”مجھے اب بھی یقین نہیں ہوتا کہ تم جیسی لڑکی اس قدر گر گئی۔ سب کچھ کیسے بھول گئیں تم چند لمحوں میں حادثہ؟“ انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ میں ہولے سے ہنسی تھی۔
 ”میڈم! میں کچھ نہ بھولی تھی۔ سب یاد تھا مجھے۔ میں نے جتنی جلدی عمیر سے پیار کیا اتنی جلدی اسے بھلا بھی دیا لیکن شاید یہ ہی میری غلطی تھی۔ شاید اسی کی سزا ملی مجھے۔ میں گھر پر بھی جب مجھے عمیر کا فون آیا۔ وہ مجھے آنے کو کہہ رہا تھا اور جب میں نے منع کیا تو.....“ میں نے آنسوؤں کے ساتھ انہیں سب بتا دیا۔

”میڈم! مجھے پتا ہے آپ یقین نہیں کر سکیں گی کیونکہ واقعی یہ یقین کرنے والی بات ہی نہیں ہے۔ آپ بے شک مجھے اپنے دل میں کوئی اونچا مقام نہ دیں لیکن اپنی نظروں سے پاتال میں بھی مت گرائیں پلیز۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے بے دردی سے آنکھوں کو گرٹا تھا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہیں پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ہولے سے بولیں۔

”اللہ تم پر رحم کرے۔“

☆.....☆

15 اگست سے اسکول اوپن ہو رہے تھے، اکیڈمی جانا، وہ بھی حارث جاوید کی وہ بھی فزکس پڑھانے کے لیے خواب و خیال ہی ہو چکا تھا۔ میں ایک مرتبہ عمیر کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی غلطی کر بھی چکی تھی اور اس نے مجھے روٹی کی طرح دھنک کے رکھ دیا تھا۔ اس دن بھی میں کچن میں کھڑی یہ ہی سوچ رہی تھی کہ اس سے کیسے بات کروں۔

”حادثہ بات سنو!“ عمیر نے مجھے لاؤنچ سے آواز دی تھی۔ میں تیزی سے باہر آئی۔ میڈم شیمین اپنے کمرے میں تھیں اور عالیہ صوفے پر بیٹھی کوئی کام کر رہی تھی۔ میں چپ چاپ اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے ایک کاغذ اور پین میز پر پھینکا تھا۔

”یہ کیا ہے۔“ حالانکہ اسے میرا زیادہ بولنا پسند نہیں تھا پھر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔
 ”تمہارا ریزائن لیٹر ہے۔ آج سے اسکول ختم۔“ عمیر کی بات نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ عالیہ بھی حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔

”عمیر پلیز یہ جاب میرے لیے.....“ عمیر نے میری بات یکدم کاٹ دی۔
 ”تمہیں دراصل ہر کام مار کھا کے کرنے کی عادت ہوئی جا رہی ہے۔ چپ چاپ کرو سائن۔“ میں ساکت کھڑی رہ گئی۔

میں کیسے کر دیتی سائن؟ وہ جاب میرے آگے بڑھنے کا سہارا تھی۔ عارش کا فوچر تھی۔ میرے ایم فل کا واحد راز یہ بھی میں خود کو بولنے سے باز نہ رکھ سکی۔
 ”عمیر! آپ نہیں جانتے یہ جاب میرے لیے ملتی ضروری ہے پلیز ایسا نہ کریں۔“ عمیر ایک دم اٹھ کے میرے سامنے آیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اس جاب کی، زندہ رہنے کے لیے تمہیں دو وقت کی روٹی چاہیے بس اور وہ اس گھر سے مل جائے گی۔ سائن کرو۔“ وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔

پلیز۔ عمیر مجھے عارش کو ڈاکٹر بنانا ہے۔ ابو جی نے صرف میرے بھروسے پر اسے میڈیکل پڑھنے دیا تھا۔ اب آپ یہ بھروسہ تو نہ چھینیں مجھ سے پلیز۔“ میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔

”کوئی رشتہ نہیں رہا تمہارا اب عارش سے۔ یاد ہے ناں اس رات تمہارا بے پاب نے کیا کہا تھا کہ مر گئیں تم آج سے ہمارے لیے اور جو مر جاتا ہے اس کا اس دنیا اور یہاں بسنے والوں سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ جیسے تمہارا نہیں رہا۔“ عمیر نے انگلی اٹھا کے مجھے بتایا تھا۔

”عمیر! خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ یہ کوئی کھلونا تو نہیں ہے جو میں نے چند روپے میں خریدا تھا اور اب آپ اسے چھین لیں گے تو میں اور لے لوں گی۔ یہ میرے سولہ سالوں کا صلہ ہے عمیر، میرے سولہ سالوں کی واحد کمائی ہے۔ ایک بار کھودی تو واپس نہیں ملے گی۔“ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بلک بلک کے روئی تھی۔

عالیہ میڈم شیمین کو بھی بلا لائی۔
 ”اور آپ تو جانتے ہیں کہ کھودنے کا درد کیا ہوتا ہے۔ پلیز مجھے ابھی سے درود نہ دیں۔ صرف عارش کے ڈاکٹر بننے تک اس کے بعد آپ بے شک نہ کرنے دینا، بلکہ میں خود چھوڑ دوں گی مگر پلیز عارش کے ڈاکٹر بننے تک ایسا نہ

کریں پلیز۔“ عمیر کو سامنے والے سے اتنا کچھ سننے کی عادت نہیں تھی جب کہ سامنے والا انتہائی قابل نفرت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دسڑ میں بھی ہو۔ اب بھی اس نے میرا منہ سختی سے اپنے سیدھے ہاتھ سے پکڑا تھا۔

”حائقہ! آخری بار کہہ رہا ہوں چپ چاپ سائن کر دو۔“ عمیر کی آواز شاید اس سے زیادہ سرد نہیں ہو سکتی تھی مگر عارش سے کیے وعدوں نے مجھے اپنی جلدی ہارنے کی اجازت نہ دی۔

”عمیر! آپ کو خدا کا واسطہ پلیز ایسا.....“ عمیر نے زناٹے دارچھتر میرے منہ پر مارا تھا۔ میں سن رہی تھی۔ اس نے اس بار مجھے اشارے سے سائن کرنے کو کہا۔ میں نے ایک بار پھر ہمت کی۔

”عمیر! میں نے عارش سے وعدہ کیا ہے پلیز مجھے.....“ دوسرا چھتر اس سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑی نہ رہ سکی۔ پیچھے کولہ کھڑا گئی۔

”عمیر! ہاتھ نہ اٹھاؤ۔“ میڈم شینہ ایک دم آگے کو آئی تھیں۔ عمیر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں وہیں روک دیا۔

”ماما پلیز! اسے ان چھتروں کی عادت ہو گئی ہے اب۔“ کہتے ہوئے اس نے تیسرا چھتر رسید کیا تھا۔ میں لڑکھڑا کے کچن کے دروازے میں گر گئی۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ عمیر نے وہ کاغذ اور تین میرے پاس زمین پر پھینکا۔

”سائن کرو۔“

میں نے روتے ہوئے آخری بار بولنے کی کوشش کی تھی۔ ”عمیر میں.....“

عمیر نے اپنا پاؤں جو تے سمیت میرے منہ پر رکھا پوری قوت سے، میری چھین نکل گئیں۔

”عمیر چھوڑو اسے۔ مرنے لگی۔“ میڈم ایک دم میری طرف آئیں۔ عمیر نے اس قدر زور سے میرا چہرہ دبایا ہوا تھا کہ میری سسکیاں بھی نہ نکل رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے میں اس کا جوتا ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مارا ہی تو ہے اسے تاکہ پھر دوبارہ بھی میرے سامنے کھڑی نہ ہو سکے۔“ عمیر نے کہتے ہوئے جوتا گڑا تھا۔ میری چھین کمرے کے دروازے پر ہلا گئیں۔

”حائقہ کرو سائن۔“ میڈم شینہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی سائن کروا کے عمیر کو پرے دھکیلا تھا۔ میرا پورا چہرہ خوں خون ہو چکا تھا مگر درد..... درد دل میں ہو رہا تھا۔ عارش کا ہنسا ہوا چہرہ بار بار نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔

آج عمیر نے مجھے دوسری بار مار دیا۔ پہلی بار اس دن مارا تھا جب مجھ سے میرے بائیس سالوں کی عزت چند لمحوں میں چھین لی تھی اور دوسری بار آج مار دیا جب مجھ سے میرے بائیس سالوں کی کمائی چند لمحوں میں چھین لی۔

”میں عارش سے کیا کہوں گی۔“ بے ہوشی میں بھی میرے لبوں سے یہی الفاظ نکل رہے تھے۔

☆.....☆

آخر کار آج فیصلہ کر کے وہ عمیر سے ملنے آئی گیا۔ ابھی تو رشتہ بنایا بھی نہیں تھا۔ ابھی تو محبت کرنی شروع ہی کی تھی کہ اس نے ایک ہی جھٹکے میں چھین لی۔ ذرا نہ سوچا کتنی سالوں کی دوستی کا کیوں کیا عمیر نے ایسا بس یہی پوچھے آیا تھا وہ اس سے۔ عمیر اسے دیکھ کے کافی حیران ہوا۔

”مجھے لگا تھا شاید تم جلدی میرے پاس آؤ گے۔“ عمیر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”مجھے صبر آ گیا ہوتا تو شاید آج بھی تمہارے پاس نہ آتا۔“ حمزہ خالی خالی لہجے میں بولا۔ عمیر چپ رہا۔

”مگر میں کیا کروں۔ میرے وجود کی ہر خالی جگہ میں اتر گئی تھی وہ، میرے ذہن میں آج بھی اس کی آوازیں گونجتی ہیں۔ عمیر میں نے تو ابھی اس کے سنگ نہ جانے کہاں کہاں گھومنا تھا یا! پر تو نے تو پوری طرح خوش نہ

ہونے دیا وہ ابھی میری ہوئی بھی نہیں تھی اور تو نے چھین لیا۔“ حمزہ کی آواز شاید بھراؤنی تھی۔

”اچھا ہوا ناں پہلے ہی چھین لیا بعد میں چھیننا تو زیادہ تکلیف ہوتی۔“ عمیر بولا تھا۔

”مگر چھیننا ہی کیوں۔“ حمزہ ایک دم بولا۔

”کیونکہ اگر میں اسے نہ چھینتا تو وہ مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیتی۔ میرا ماضی، میرا مستقبل سب کچھ مجھ پر چھانے لگی تھی وہ مجھے کہیں گم کرنے لگی تھی۔“ عمیر کی بات پر حمزہ ہولے سے مسکرایا۔

”یعنی تو ڈر گیا تھا اس سے۔“ اس کی بات پر عمیر سن رہا گیا۔

”اسی لیے اسے مٹا دیا تو نے۔ اس ڈر سے کہیں وہ تجھے گم نہ کر دے۔ تو نے اسے گم کر دیا۔ کس چیز کا ڈر تھا تجھے عمیر؟ وہ تیرا نام چھین لیتی، تیرا مقام چھین لیتی، تیرے اسٹوڈنٹس چھین لیتی تو یہ ڈر تو مجھے بھی ہونا چاہیے تھا۔ میرا بھی ایک نام تھا۔ میری بھی اپنی اکیڈمی تھی۔ میرے اسٹوڈنٹس بھی اس کے پاس جانے لگے تھے۔ پر میں تو نہیں ڈرا عمیر۔ مجھے تو نفرت نہیں ہوئی اس سے۔“ عمیر چپ تھا۔

”کیونکہ میری فطرت الگ ہے۔ تیرے جیسی نہیں ہے۔ اپنی منوانے والی اونچاڑنے والی۔ دوسروں کو ہمیشہ نیچا دکھانے والی لیکن عمیر آخر تک تک..... کب تک خود کو منوانے کے لیے دوسروں کو مٹاتا رہے گا۔ دوسروں کو خود سے چھوٹا دیکھنے کے لیے کتنا اونچا اڑے گا۔ آج حائقہ کھڑی ہوئی تھی تیرے آگے۔ کل کوئی اور کھڑا ہو جائے گا۔ پرسوں کوئی اور کس کس کو مٹائے گا۔“ عمیر نے حمزہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”ہراس شخص کو جو میرے رستے کی رکاوٹ بنے گا۔“ وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔

”کیونکہ میری فطرت الگ ہے حمزہ! اپنی منوانے والی بہت اونچا اڑنے والی۔“ حمزہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”عمیر! حائقہ ارشد کسی صفے پر لکھا ہوا نام نہیں ہے کہ تو نے مٹایا تو مٹا رہے گا۔ جیتی جاگتی لڑکی ہے وہ دوبارہ کھڑی ہو گئی تو.....“ عمیر ہولے سے ہنسا۔

”جیتے جاگتے وجود جب قبر میں اتار دیئے جائیں تو دوبارہ زندہ نہیں ہوتے حمزہ! حادث ہو یا حائقہ مجھے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے۔“ حمزہ بھی مسکرایا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ حادث درست تھا۔ یہ اسی کی نفرت کی چنگاری ہے جو حائقہ کو بھی جلا گئی۔“ عمیر آگے کو ہوا۔

”غلطی صرف میری نہیں ہے حمزہ! منع کیا تھا میں نے اسے کہ اپنی اور میری جنگ میں حائقہ کو نہ کھینے مگر وہ نہیں مانا اپنے اور میرے بیچ حائقہ کو کھڑا کر دیا اس نے، اب تو تو جانتا ہے کہ مجھے حادث سے کتنا پیار ہے میں کسی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا اپنے اور اس کے بیچ۔“ عمیر ہنستے ہوئے بولا تھا۔ حمزہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر ہولے سے بولا۔

”عمیر! میں نے سنا ہے کہ بہت اونچا اڑنے والے جب گرتے ہیں تو منہ کے بل بہت گہرائی میں جا کے گرتے ہیں۔ کاش جب تیرا وقت آئے تو میں تیرے پاس نہ ہوں۔ کئی سالوں کی دوستی ہے دیکھ کے بہت درد ہوگا مجھے۔“ حمزہ کہہ کے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

میں اس دن اوپر کمرے میں تھی جب عمیر تقریباً دو بجے کے قریب گھر آیا۔

”حائقہ.....!“ مجھے آوازیں دیتا ہوا وہ اوپر آیا تھا۔

”ادھر آؤ“ مجھے بازو سے کھینچتا ہوا وہ نیچے لے آیا۔
 ”بیٹھو۔“ کرسی لاؤنج میں آنے والے دروازے کے بالکل درمیان میں رکھ کے اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران ہوتے ہوئے چپ چاپ بیٹھ گئی۔
 ”لوگوں کو تو ابھی بھی تم سے بڑی امیدیں ہیں بھئی، ہو کیا چیز تم۔ جس سے ملتی ہو اس پر جادو کر دیتی ہو۔ پھر بس تمہارا ہی ہو کر رہ جاتا ہے وہ۔“ میرے گلے سے دوپٹے کھینچ کے اس نے میرے دونوں بازوؤں کو کرسی سے باندھنا شروع کر دیا۔

”پہلے حادثہ پھر جزہ میری ماما میری بہن کیا میرے اسٹوڈنٹس کیا جزہ کے اسٹوڈنٹس۔ سب پر جادو کر دیا تم نے سوائے میرے، پتا نہیں کیا وجہ ہے جو بس مجھے ہی اچھی نہیں لگتیں تم، باقی تو سارا جہان گرویدہ ہے تمہارا۔“
 ”عیر کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔
 ”کہتے ہیں میں ڈرتا ہوں تم سے، کہتے ہیں تم دوبارہ کھڑی ہو جاؤ گی میرے سامنے۔“ عیر نے مجھے اچھی طرح کرسی سے باندھ دیا تھا۔

”مگر کیسے؟ میں کھڑا ہونے دوں گا تب ناں میں تم میں رتی برابر بھی جان چھوڑوں گا تب ناں۔“ کہتے ہوئے اس نے عالیہ کو ٹھینک دیا وہ کمرے میں دھکیلتے ہوئے باہر سے دروازہ بند کیا تھا۔ مجھے ایک دم خوف آیا۔
 ”یہی ہے ناں تمہارا غور تمہاری طاقت، اسی پر ناز ہے ناں تمہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے میرے سارے ایکڑ ڈاکو منٹس میرے سامنے میز جیوں پر پھینک دیے۔
 ”میری سانسیں ختم کیں۔ عیر کیا کرنے لگا تھا۔
 ”میٹرک، فرسٹ ڈویژن 86%۔“ وہ میرے سامنے میز جیوں پر بیٹھا تھا۔ ہنستے ہوئے میرے ڈاکو منٹس دیکھ رہا تھا۔

”F.sc فرسٹ ڈویژن 84%۔“ میرے ہاتھ پاؤں کاپنے لگے۔ آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگیں۔
 ”B.sc فرسٹ ڈویژن ٹاپراف ڈسٹرکٹ۔“ اس نے ہنستے ہوئے مجھے دیکھا۔
 ”عیر!۔۔۔!“ سرگوشی میرے لبوں پر بھی دم توڑ گئی۔ میڈم ٹھینک کے کمرے کا دروازہ تو اسے ہیچ رہا تھا۔
 ”ایم ایس سی فرسٹ سیلور میڈلسٹ۔ پتا ہے یہ بھی مجھے سب سے بری لگتی ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو نکلتا شروع ہو گئے۔ عیر مجھے دیکھ کے اور ہنسا۔
 ”بی ایڈ سرگودھا یونیورسٹی سے۔“ وہ ایک ایک کر کے سب پڑھ رہا تھا۔

”ایم ایڈ، GC یونیورسٹی سے Continue۔“ اس کے بعد دھیر سارے کیریکٹر سرٹیفیکیشن، اعزازی سرٹیفیکیشن، اسکا لرشپ کے سرٹیفیکیشن..... اس نے میز جیوں پر ڈھیر لگا دیا۔
 ”کیا کریں ان فالو کاغذوں کا حاقہ؟“ وہ میری طرف دیکھ کے ہنسا تھا۔
 ”عیر کیا کرنے لگے ہو؟“ میری آواز میرے لبوں پر ہی خاموش ہو گئی۔ عیر نے لمحوں میں تلی چلا کے انہیں آگ لگائی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں ساکت رہ گئی۔ جو ہوا تھا اس پر یقین ساندہ آیا مگر وہ سب واقعی ہوا تھا۔ ان کاغذات سے نکلنے شعلے مجھے اصل دنیا میں واپس لے آئے۔

”عیر! وہ میری آواز نہیں تھی۔ میرا دکھا تھا۔ درد تھا تکلیف تھی۔ یوں سے نکلتی تھی۔
 ”عیر! خدا کا واسطہ رک جائیں۔ عیر پلیز رک جائیں۔“ میں نے پوری قوت سے خود کو کھولنے کی کوشش کی

تھی۔

”عیر! یہ میری عمر بھر کا صلہ ہے۔ میں نے بہت مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد حاصل کیے ہیں یہ، پلیز رک جائیں۔ عیر! آپ مجھے مار دیں۔ میری جان نکال لیں مگر انہیں نہ جلائیں۔“ میں پاگلوں کی طرح روتے ہوئے خود کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عیر مسلسل ہنس رہا تھا۔ میڈم ٹھینک کے کمرے کا دروازہ ٹوٹنے والا ہو گیا۔
 ”عیر! میں مرجاؤں گی ان کے بغیر، مجھے اپنے خون سے زیادہ عزیز ہیں۔“ مجھ سے یوں لادو بھر ہورہا تھا۔
 میرے پائیس سالوں کا صلہ میرے سامنے جل کے راکھ ہو رہا تھا اور میں چپ تھی۔ بے بس تھی۔ مجبور تھی۔ میرا دل شاید کب کا دھڑکننا بند ہو گیا تھا۔ زور زور سے ہلنے کی وجہ سے کرسی آگے کو گر گئی۔ میرا منہ پوری قوت سے زمین پر لگا تھا۔ ہاتھ ابھی بھی کرسی کی پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے زمین پر ہی گھسنے کی کوشش کرنا شروع کی۔

”عیر! رک جاؤ، خدا کا واسطہ، عیر میرے ساتھ جو مرضی سلوک کرو۔ خدا کا واسطہ۔ عیر میرے ساتھ جو مرضی سلوک کرو۔ میری کھال ادھیڑ دو، مجھے زندہ درگور کر دو مگر خدا کا واسطہ ایسے مت کرو۔“ میرے ماتھے اور ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ میڈم ٹھینک کے کمرے کا دروازہ ایک دم کھلا۔ سامنے کا منظر دیکھ کے وہ بھی چند لمحوں کے لیے دم بخور ہو گئیں۔ پھر عالیہ نے تیزی سے آ کر میرے ہاتھ پاؤں کھولے تھے۔
 ”عیر! خدا کا خوف کرو۔“ میڈم ٹھینک جیسے بے بس ہو گئیں۔ میں پاگلوں کی طرح اپنے ڈاکو منٹس کی طرف بھاگی تھی جو تقریباً جل کے راکھ ہو چکے تھے۔ ماتھے سے ٹپکتے خون کی پرواہ کیے بغیر سلیکی ہوئی راکھ کی پرواہ کیے بغیر میں نے اس میں ہاتھ مارے تھے۔ میرے ہاتھوں کی کھال طے لگی۔

”حاری! چھوڑ دے کچھ نہیں بچا۔“ عالیہ نے مجھے پیچھے ہٹایا مگر مجھے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ وہ راکھ نہیں تھی۔ وہ میرے پائیس سال تھے جو لمحوں میں ختم ہو گئے تھے۔ وہ میری محنتوں کا صلہ تھا جو چند لمحوں میں راکھ ہو گیا تھا۔ چہرے سے خون صاف کرتے ہوئے میں نے راکھ میں ہاتھ مارتے ہوئے چند ادھ جلمے کھڑے ڈھونڈ لیے۔ نہ جانے کس سند کے کون سے حصے تھے۔ میں نے پھونک مار مار کے انہیں ٹھنڈا کیا۔ مجھے اس لمحے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ میں بھول گئی کہ میں کہاں تھی کن حالات میں تھی۔ جہاں تھی وہاں کیوں آئی تھی۔ میں رونا بھول گئی۔ چلا نا بھول گئی۔ بھول گئی کہ میرے برابر میں عیر بیٹھا تھا جو مسلسل مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ اپنا درد بھول گئی۔ چہرے کو رنگین کرتا خون بھول گئی۔ ہاتھوں کی انگلیوں اور ہتھیلیوں کی جلتی ہوئی کھال بھول گئی۔ پٹھا ہوا ہونٹ بھول گئی جو نہ جانے کون سی دفعہ پٹھا تھا۔ سب بھول گئی۔ بس مجھے وہ یاد تھا جو ابھی چند لمحے پہلے ہوا تھا۔ دل کا وہ درد یاد تھا جو انتہا کو پہنچ کے ختم ہو گیا تھا۔ وہ شعلے یاد تھے جو ابھی چند لمحے پیشتر دیکھے تھے اور وہ ٹکڑے یاد تھے جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھے جنہیں میں نے ہونٹوں سے لگایا ہوا تھا۔ ہر احساس ختم ہو گیا تھا۔ ہر درد ختم ہو گیا تھا۔ ہر شے خالی ہوئی تھی۔ بس اس لمحے میں تھی اور میرے ہاتھ میں بند چند ٹکڑے۔

”عیر! اچھے ڈر لگنے لگا ہے تیرے انجام سے۔“ نہ جانے میڈم ٹھینک نے کیا کہا تھا۔
 ”اس کے انجام سے تو کم برا ہی ہوگا۔“ نہ جانے عیر نے کیا کہا تھا۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا۔ اس دن عیر نے مجھے تیسری بار مار دیا۔

☆.....☆

”حارث!۔۔۔!“ سلمان کی تیسری آواز پروہ چونکا تھا۔

(جاری ہے)

روحانی ڈائری

روشنی فیصل کی ڈائری سے

معین نظامی کی غزل

میرا بوجھ خود اٹھانا، میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا میرے حافظے میں رہنا
میرے منظروں میں بسنا میری گفتگو میں ہونا
میرے لمس میں سنانا میرے ذائقے میں رہنا
میرا حکم خود سنانا، میری مہر خود لگانا
میرے مشورے میں ہونا میرے فیصلے میں رہنا
بھی دھوپ کے نگر میں میرا ساتھ چھوڑ جانا
کبھی میرا عکس بن کے میرے آئینے میں رہنا
کبھی منزلوں کی صورت میری دسترس سے باہر
کبھی سنگ میل بن کر میرے راستے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
میرے خواہشوں کی خوشبو، میرے زائچے میں رہنا

شائقہ ایاز کی ڈائری سے

سپاس گل کا کلام

مجھے ایسا لطف آیا کیا
جو جہر تھا نہ وصال تھا
میرے موسموں کے مزاج داں
تجھے کتنا میرا خیال تھا
کسی اور کے چہرے کو دیکھ کر
تیری شکل ذہن میں آگئی
تیرا نام لے کے ملی اس سے

میرے حافظے کا یہ حال تھا
تیرے بعد کبھی کوئی نہیں ملا
جو یہ حال دیکھ کے پوچھتا
مجھے کس کی آگ جھلسا گئی
میرے دل کو کس کا مال تھا
کہیں خون دل سے لکھا تو تھا
تیرے سال بھر کا سید
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی
وہ نجانے کون سا سال تھا

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

حسن نقوی کا کلام

میں تنہائی پہنتا ہوں
اُداسی کے آجاؤ آنگن میں چلتا ہوں
کٹھن محرومیوں کے زرد پتوں کو
مری آنکھوں میں جکراتے بھرے ہیں ایک مدت سے
مرے ہونٹوں پہ چسپاں ہیں چٹختی ہچکیاں
چہرے پہ کٹی، کٹی، دھکتی خراشیں ہیں
میں اپنی ذات یہاں اجڑے ہوئے گاؤں کا میلہ ہوں
مرے یارو
تمہارے ساتھ رہ کر بھی اکیلا ہوں!
مری سنگت میں مت بیٹھو
تمہیں تو خود سنو رہا ہے
تمہاری خواہشوں کے بام و درپر

روشنی کے پھول کھلنا ہیں
تمہیں لکھنا ہے اپنی سانس کی گرمی سے
نیند کا سفر نامہ
مری سنگت میں مت بیٹھو
کہ میں پتھر کا مجسمہ ہوں
کہ میں محرومیوں کے شہر کا باسی ہوں
مری قسمت اُداسی
کم لباسی، ناشناسی ہے!
مری سنگت میں مت بیٹھو
مجھے ملنے سے کتراؤ
خود اپنے دل کو سمجھاؤ
میرے نزدیک مت آؤ
میرے دل میں اندھیرا ہے
اندھیرا صرف میرا ہے

صائمہ جواد کی ڈائری سے

انظہر جاوید کی نظم

تو اب ہم ایسا کرتے ہیں
محبت ترک کرتے ہیں
یہ شعر و شاعری کا سلسلہ یہ پیاری باتیں
سب ہی کچھ چھوڑ دیتے ہیں
ہم اپنی سوچ کا، احساس کا رخ موڑ دیتے ہیں
کسی کو بے وفا کہنا، کسی کو کج ادا لکھنا
کبھی اپنی وفاؤں کے صلے کی آرزو رکھنا
ہمیشہ دل کو جاہت کے لیے بے آبرو رکھنا
کسی عیبی، عیبی، لیلیٰ، کسی مولیٰ کی خاطر ہم
کسی سوتی، کسی بھی ہیر کے آچل کی خاطر ہم
نہیں برباد ہوں گے اب
تو اب یہ فیصلہ کر لیں
ہم اپنی زیست کی ناکامیاں تسلیم کرتے ہیں
ہم اپنی بے بسی کی خامیاں تسلیم کرتے ہیں

یہ شہرت ہے کہ بدنامیاں تسلیم کرتے ہیں
حقیقت مان لیتے ہیں
لیکتے، دوڑتے، بڑھتے ہمارا پاؤں رہتا ہے
ادھر و کٹوں کے پیچھے سے کوئی آنکلی بھی اٹھی ہے
ہماری عمر کی لمبی انگڑاں ختم ہوتی ہے
ستارے بجھ گئے ہیں اب
شرارے بجھ گئے ہیں اب
اکیلے پن کی اب کوئی نئی تدبیر کیا ہوگی
کسی بھی عشق کی پاؤں میں اب نہ بچیر کیا ہوگی
ستم پرورد بھلا اب اور بھی تقدیر کیا ہوگی
تو اب ہم ایسا کرتے ہیں
ہم اپنی خودکشی کا آپ خود اعلان کرتے ہیں
قلم کا غزوہ دھرتے ہیں
بہت کچھ لکھ لیا ہم نے
بہت دن جی لیا ہم نے
یہ رشتہ توڑ دیتے ہیں
سب ہی کچھ چھوڑ دیتے ہیں ہم

اسماء جشید کی ڈائری سے

وصی شاہ کا خوب صورت کلام

وسعت دشت بھر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
تجھ سے آگے کا سفر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
روز ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح شام گئے
میں بھی اک درد کے دریا میں اتر جاتا ہوں
وہ چپ چپ سی کہیں بیٹھ کے روتی ہوگی
میں راتوں کو ذرا دیر سے گھر جاتا ہوں
میں نے بھی جرم بغاوت کے ستم بھیلے ہیں
میں بھی اب لوگ جدھر جائیں ادھر جاتا ہوں
چل پڑا ہوں میں زمانے کے اصولوں پر وسی
میں بھی اب اپنی باتوں سے مکر جاتا ہوں

اس ماہ کی کرنیں

ضروریات کو کم کر لینا سب سے بڑی مالدار ہے۔
 بچائی بھی اپنی تلاش کرنے والوں کو ذلیل نہیں ہونے دیتی۔
 جو شخص تمہارے سامنے دوسروں کی برائی کرتا ہے۔ جان لو کہ وہ تمہاری برائی دوسروں کے سامنے کرتا ہے۔
 جاہل کے خیال اور عمل میں بہت کم وقفہ ہوتا ہے۔
 جو لوگ صبح کو فیصلے کرتے اور شام کو بھول جاتے ہیں وہ زندگی میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔
 جس شخص کے خیالات اور نظریات اچھے ہوں وہ بھی تنہا نہیں ہوتا۔
 زیادہ خوش حالی اور زیادہ بد حالی دونوں برائی کی طرف لے جاتی ہیں۔
 زندگی کو سادہ مگر خیالات کو بلند رکھو۔
 انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔
 عقل سے کائنات تسخیر ہوتی ہے لیکن لامکاں تک پہنچنے کے لیے عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔
 احتیاط، دانشمندی کی ہونہار اولاد ہے۔
 کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔
 تنہائی میں اپنے خیالات پر اور محفل میں اپنی زبان پر قابو رکھو۔
 علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔
 رشتے خون کے ہی نہیں احساس کے بھی ہوتے ہیں اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے اور اگر

احساس نہ ہو تو اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔

نوشین مدر۔ لاہور

اس ماہ آپ کی الجھن..... ہماری سلجھن!

☆ میں جب بھی ہوائی جہاز کا سفر کروں تو مجھے چکر آتے ہیں، متلی ہونے لگتی ہے۔ میرا مسئلہ حل کریں۔ (اڑن چھو۔ ہوائی پور)
 ☆ نیند کی گولی لے کر ہوائی جہاز کا سفر کریں۔ دوران سفر اگر آنکھ کھل جائے تو ہوائی جہاز سے چھلانگ لگا دیں پھر بھی چکر نہیں آئیں گے۔
 ☆ میرا ہر وقت میری ساس سے جھگڑا رہتا ہے۔ میں ہر روز کی تو تو میں میں سے تنگ آ چکی ہوں، مجھے حل بتائیں۔ (نئی بہو۔ گجر خان)
 ☆ آپ کو یہ تعویذ ارسال کیا گیا ہے۔ جب بھی ساس جھگڑا شروع کرے آپ اسے اپنے دانتوں کے نیچے دبا لیں۔ ساس خود بخود دو تین دنوں تک لڑنا بند کر دے گی۔ (جب آپ بول ہی نہ سکیں گی تو تو میں میں نہ ہوگی)۔
 ☆ میں ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں، کیا میری شادی اس سے ہوگی اور شادی کا میاب رہے گی۔ (آوارہ عاشق۔ محبت آباد)
 ☆ مطلوبہ جگہ شادی کا امکان بالکل نہیں ہے۔ شادی کا امکان وہاں ہے جہاں اوپر والے نے لکھی ہے۔ زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ بیوی کے غلام بن جائیں گے تو کامیاب رہیں گے۔
 ☆ میں نے اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے کیا میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ (بلو۔ جی روڈ)
 ☆ اگر آپ نے دل لگا کر پڑھا ہے ”کتابوں کو“ تو کامیاب ہو جائیں گی اور اگر صفائی پسند ہیں، پیپر صاف دے آئی ہیں تو اس کا انحصار آپ کی جیب پر ہے۔ جتنی رشوت کھلا

دیں، اتنی ڈویژن ہائی ہوگی۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کے لیے نظم

اس سمت چلے ہو تو اتنا اسے کہنا
 اب کوئی نہیں حرف تمنا اسے کہنا
 دنیا تو کسی حال میں جینے نہیں دیتی
 چاہت نہیں ہوتی رسوا اسے کہنا
 اس نے ہی کہا تھا تو یقین میں نے کیا تھا
 امید پہ قائم ہے دنیا اسے کہنا
 زرخیز زمینیں کبھی بخر نہیں ہوتیں
 دریا ہی بدل لیتے ہیں راستے اسے کہنا
 کچھ لوگ سفر کے لیے موزوں نہیں ہوتے
 کچھ راستے لگتے نہیں تنہا، اسے کہنا
 سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

اس ماہ کے اقوال

☆ اللہ کو وہ اچھا عمل پسند ہے جو ہمیشہ ہو
 اگر چہ تھوڑا ہو۔
 ☆ پھول اپنی خوشبو اور انسان اپنی خوشی نہیں چھپا سکتا۔
 ☆ کردار ایسا ہونا چاہیے کہ پتھر بھی موم ہو جائے۔
 ☆ ناامید کبھی مت ہو کہ اس سے زندگی کم ہو جاتی ہے۔
 ☆ ماں غریب ہو کر بھی اولاد کو پال سکتی ہے جب کہ باپ امیر ہو کہ بھی پرورش نہیں کر سکتا۔
 ☆ اونٹ صحرا کی طرف بھاگتا ہے۔ یعنی ہر شے اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔
 ☆ درزی کی سوئی کبھی ٹاٹ اور کبھی جمل میں۔
 ☆ مطلب انسان کو برا بھلا سب پیش آتا ہے۔
 ☆ ہر گمشدہ چیز وہیں سے ملتی ہے جہاں کھوئی ہو۔
 فرزانہ شوکت۔ کراچی

اس ماہ کی اہم معلومات

ادرک پٹھوں کے درد میں مفید ہے۔ امریکہ میں کی جانے والی حالیہ تحقیق کے مطابق ادرک کا استعمال ورزش کرنے کے بعد پٹھوں میں ہونے والے درد کو کم کر دیتا ہے۔ اس نئی ریسرچ میں بتایا گیا ہے کہ ہر روز ادرک کی تھوڑی سی مقدار کھا لینے سے پٹھوں کا درد کا کھینچاؤ کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادرک میں درد کو ختم کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہے جو خاص طور پر ان لوگوں کے لیے مفید ہے جنہیں سخت ورزش کرنے کے بعد مشکل پٹھوں میں درد رہتا ہے۔ ادرک ایک شافی علاج ہے۔ اسے صدیوں سے مختلف بیماریوں جیسا کہ متلی، قے، کھانسی، ٹھنڈ لگنا، معدے کی بیماریوں اور یرقان وغیرہ کے تدارک میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنسدانوں نے اسے اس نئے تجربے میں 76 رضا کار شاگردوں کے ساتھ کام کیا ہے جنہیں تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے گروپ کو دو گرام کچی ادرک کھانے کو دی گئی جب کہ دوسرے گروپ کو اتنی ہی مقدار میں کچی ہوئی ادرک کھانے کے لیے دی گئی اور تیسرے گروپ کو Tablet, Placabo دی گئی۔ نتائج کے مطابق کچی اور پکی ادرک کا استعمال کرنے والے گروپ میں درد کم ہونے کا تناسب تیسرے گروپ کے مقابلے میں 25 سے 23 فیصد تھا اس کے علاوہ حالیہ ریسرچ کے مطابق ادرک کا باقاعدہ استعمال آنکھ کے موتیا اور ذیابیطس کو بڑھنے سے روکتا ہے۔ بڑھنے کے عمل کو سست کرتا ہے۔
 ریانا نور رضوان۔ کراچی



اقوال زریں

☆ غصہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور ندامت پر ختم ہوتا ہے۔
☆ سب سے بڑا بزدل وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہے۔
☆ ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے۔
☆ عادت طبیعت کو ضعیف کر دیتی ہے اور اس کے خلاف کام کرتی ہے۔
☆ جو بات معلوم نہ ہو اس کے اظہار میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔
☆ مہمان کے واسطے زیادہ خرچ کرو کیونکہ یہ اسراف میں سے نہیں۔
☆ کم کھانا بیماریوں کا علاج ہے اور شکم سیری بیماری کی جڑ ہے۔
☆ تمہارے واسطے خیر یہی ہے کہ شر سے باز رہو۔

ثناء ملک - کراچی

آنسو

نہ جانے وہ آنسو کسی کے نام کے ہیں کہ جب میں خوش ہوں، تنہا ہوں، تب بھی آجاتے ہیں اور جج دجج کر آئینے میں اپنے آپ کو سراہتے سے دیکھوں تب بھی آجاتے ہیں اور جب گزرتے وقت کی لکیریں اپنے خدو خال میں محسوس کرتے

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ حضرت زینب ثقیفہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ ”کیا میری جانب سے اپنے خاوند پر اور اپنے زیر کفالت یتیموں پر خرچ کرنا صدقے کے طور پر کافی ہو سکتا ہے؟“
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس خاتون کو دو ثواب ملیں گے، صدقہ کرنے کا ثواب اور رشتے داروں سے نیکی کا ثواب۔“
فوائد و مسائل: اقارب اگر امداد کے مستحق ہوں تو ان کی مالی امداد کا ثواب دوسروں کو صدقہ دینے سے زیادہ ہے۔

سیدہ نورین - کراچی

صدقہ

جب انسان اپنے ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے تو صدقہ پانچ باتیں کہتا ہے میں فانی مال تھا تو نے مجھے بقادے دی۔ میں تیرا دشمن تھا لیکن تو نے اب مجھے دوست بنا لیا ہے۔ آج سے پہلے تو میری حفاظت کرتا تھا لیکن آج سے میں تیری حفاظت کروں گا۔ میں حقیر تھا تو نے مجھے عظیم بنا دیا۔ پہلے میں تیرے ہاتھ میں تھا اب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں۔
عانیہ نیازی - ربوہ

دی جاتی ہے۔ ہر مسلمان کو اذان کے معنی یاد ہونے چاہئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان و اقامت کی ادائیگی سے متعلق کئی احکام ہمیں دیئے ہیں۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم اذان دو تو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر دیا کرو (یعنی ہر کلمہ پر سانس توڑ دو اور وقفہ کیا کرو) اور جب اقامت کہو تو رواں کہا کرو اور اپنی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فاصلہ کیا کرو کہ جو شخص کھانے میں مشغول ہے وہ فارغ ہو جائے اور جس کو استنجہ کا تقاضا ہے وہ جا کر اپنی ضرورت سے فارغ ہو جائے اور گھر سے نہ ہوا کرو جب تک مجھے نہ دیکھ لو حضرت زید بن حارثؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ فجر کی نماز کے وقت رسولؐ نے مجھے علم دیا کہ تم اذان پڑھو میں نے اذان پڑھی اس کے بعد جب اقامت کہنے کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے ارادہ کیا کہ اقامت وہ کہیں تو حضورؐ نے (پرے متعلق) فرمایا کہ اس صدائی نے اذان پڑھی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جو اذان پڑھے وہی اقامت کہے جب موذن اذان دیتا ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی کبریائی، توحید اور رسولؐ کی رسالت اور دعوت کا اعلان کرتا ہے تو انسان کے علاوہ جن اور دیگر مخلوقات بھی اس کو سنتی ہیں اور یہ سب مخلوق قیامت کے دن اس کے حق میں شہادت دے گی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریمؐ سے سنا شیطان نماز کی پکار یعنی اذان سنتا ہے تو مقام روحا (روحانیت) سے 34 میل دور ہے) کے برابر دور چلا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں

وقت اداس ہوں تب بھی آدھکتے ہیں کسی خوشگوار یاد سے کچھ مانوس جملے یاد آجائیں تو پھر یہ آجائے۔ وقت تو گزرتا ہی رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عمر بھی نئے دوست بھی بن جاتے ہیں ہم ان کے ساتھ خوش بہت رہتے ہیں مگر جب بھی پرانے دوست اور ان کی یادیں ستاتی ہیں تو یہ آنسو بھی بھر پور ساتھ دیتے ہیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جن سے کچھ تلخ یادیں وابستہ ہیں آنسو ان کا سوگ بھی مناتے ہیں۔ تنگ آکر میں نے ان آنسوؤں سے پوچھا۔ ”اب کیوں چلے آئے، میں دکھی تو نہیں۔ میں تو غصے میں ہوں۔ تو جانتا ہے ان آنسوؤں نے کیا کہا؟ بولے اے نادان لڑکی ہم ان تلخ یادوں میں تیرا ساتھ دینے نہیں آئے جن پر تو غصہ ہے ہم تو اس غصے میں آئے ہیں کہ تو نے کن بے اعتبار اور کم فہم کم ظرفوں کو با وفا سمجھا۔ اعتبار کے قابل سمجھا اور انہوں نے تیرے سونے جیسے جذبے ضائع کیے اور تجھے بھی ان کے لیے نہ سمجھی تو اہم تھی نہ تیرے آنسو تو نے اپنے ساتھ ہمیں بھی بے وقعت کیا۔“ اپنے آنسوؤں نے میرا بھر پور ساتھ دیا اور جیسے دل کا سارا درد مٹ گیا۔

دھنک ناز - کراچی

اذان اور موذن کی فضیلت

اذان و اقامت بظاہر نماز کے وقت کا اعلان اور نماز کا بلاوہ ہے لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اذان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع اور بنیادی کلمات حکم فرمائے ہیں جو دین کی بنیادی اصولوں کی تعلیم اور دعوت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اذان و اقامت انتہائی تبلیغ اور موثر دعوت ہے جو ہماری ہر مسجد سے روزانہ پانچ وقت

جتنے میری آنکھ کے تارے ہیں

روشن کرن

خواہشیں بکھرنے کا

دکھ اسی لیے نہ تھا کہ

چاند اپنے پر پھیلانے

اک روشن کرن کا

راستہ دکھا رہا تھا

خواب

خواہشیں بس دیں

خواب سج جائیں

تمہیں جو ہنستا دیکھوں

میرے سبھی دکھ مر جائیں

فرزانہ شوکت - کراچی

پٹھان

ایک پٹھان بادام بیج رہا تھا۔ سردار نے

پوچھا: ”یہ کھانے سے کیا ہوتا ہے؟“

پٹھان بولا: ”دماغ تیز ہوتا ہے۔“

سردار بولا: ”کیسے؟“

پٹھان بولا: ”اچھا بتاؤ ایک کلو چاول میں

کتنے دانے ہوتے ہیں؟“

سردار بولا: ”پانچ نہیں۔“

پٹھان نے سردار کو بادام کھلایا اور بولا: ”اب

بتاؤ ایک درجن میں کتنے آم ہوتے ہیں۔“

سردار بولا: ”12۔“

پٹھان بولا: ”دیکھو ہو گیاناں دماغ تیز۔“

سردار بولا: ”یار جلدی سے دو کلو بادام دے

یہ تو بہت کام کی چیز ہے۔“

ریمانو ررضوان - کراچی

☆.....

گے دیا جائے گا۔

ملک جو ادواز قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

وقت کا کیا کہنا.....!

☆ جو وقت ہاتھ سے نکل جائے وہ دوبارہ

نہیں آتا اس لیے وقت کی اہمیت جانو۔

☆ گزرے ہوئے مشکل وقت کو بھول جانا

ہی بہادر لوگوں کی پہچان ہے۔

☆ وقت بے وقت زیادہ باتیں کرنا اچھی

بات نہیں، وقت کی مناسبت سے اچھی بات زیادہ

اثر انداز ہوتی ہے۔

☆ وقت کے ساتھ جتنا تیز بھاگو گے اتنا ہی

جلدی تھک جاؤ گے۔

☆ جب وقت ہاتھ سے نکل جائے تو اس کی

قدر و اہمیت بعد میں ہوتی ہے۔

☆ اچھے وقت کی امید رکھو اور اچھا وقت

آنے کا انتظار کرو۔

☆ اعتدال کی زندگی بسر کرنے والے کبھی

وقت کی ناقدری کا رونا نہیں روتے۔

☆ جب ہم وقت کا درست استعمال بھول

جاتے ہیں تو زندگی ہر وقت بدظمی کا شکار ہو جاتی ہے۔

☆ وقت اپنا ہے مگر تخت اپنا نہیں۔ وقت کا

صحیح استعمال کریں تو وقت میں برکت رہے گی۔

☆ ہر انسان کے لیے اس دنیا میں مخصوص

وقت مقرر ہے۔ ہر انسان نے اپنا اپنا وقت پورا

ہونے پر دنیا سے لوٹ جانا ہے۔

☆ ایس امتیاز احمد - کراچی

قسم کے بہرہ ور

آپ اتنی دور ہیں

جتنی دور آسمان کے تارے

اپنے اتنے قریب ہیں

اہمیت اور فضیلت بیان فرمائی بلکہ ان کے لیے دعا

بھی فرمائی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے

کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

امام ذمہ دار موزن پر بھروسہ کیا جاتا ہے اے

اللہ اماموں کی رہنمائی فرما اور موزنوں کی

معفرت فرما۔

امام کے ذمہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

امام پر اپنی نماز کے ساتھ ساتھ تمام مقتدیوں

کی نمازوں کی بھی ذمہ داری ہے موزن پر

بھروسہ سے مراد یہ ہے کہ لوگوں نے نماز اور

روزوں کے اوقات کے بارے میں اس پر

اعتماد کیا ہے چونکہ موزن سے بعض اوقات غلطی

ہو جاتی ہے اس لیے نبی کریمؐ نے ان کے لیے

دعا فرمائی ہے۔

ارشاد نبویؐ ہے اگر لوگوں کو اذان اور پہلی صف کا

ثواب معلوم ہو جاتا تو انہیں اذان اور پہلی صف قرعہ

اندازی کے بغیر حاصل نہ ہوتی اور وہ ضرور قرعہ

اندازی کرتے۔ صحابہ کرام موزن کی اہمیت و

فضیلت جانتے تھے اور اس لیے چاہتے تھے کہ اللہ

تعالیٰ نے جس اجر و ثواب کا وعدہ موزن کے لیے کیا

ہے وہ اجر ثواب کی طرح ہمیں مل جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک

شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اذان کہنے والے

ہم سے اجر و ثواب میں بڑھے ہوئے ہیں کیا کوئی

ایسا عمل ہے کہ ہمیں بھی اذان دینے والی فضیلت

مل جائے؟

رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا: وہی کلمات کہا

کرو جو موزن کہتے ہیں یعنی اذان کا جواب دینے

والا وہی الفاظ دہرائے جو موزن نے کہے پھر

جب تم اذان کا جواب دے چکو تو دعا مانگو جو مانگو

میں اذان کی بس اتنی اہمیت ہے اگر دوران اذان گانا

بج رہا ہو تو اس کی آواز آہستہ کر دیتے ہیں عورتیں

اپنے سروں پر کپڑا ڈال لیتی ہیں اور بس اذان دینے

والے موزن کی حیثیت ہمارے معاشرے میں

ایک معمولی تنخواہ دار ملازم سے زیادہ نہیں ہے ہم

میں سے کتنے لوگ ہیں جن کے دلوں میں اذان اور

موزن کا احترام ہے ہمارے پیارے نبیؐ نے

موزن کی بہت فضیلت بیان کی ہے جس کا اندازہ

درج ذیل احادیث سے لگایا جاتا ہے۔

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے

رسولؐ خدا سے خود سنا ہے آپؐ فرماتے ہیں اذان کہنے

والے قیامت کے دن دوسرے سب لوگوں کے

مقابلے میں دراز گردن یعنی سر بلند ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ

رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تین قسم

کے آدمی مشک کے ٹیلوں پر پھرائے جائیں گے

ایک وہ نیک غلام جس نے دنیا میں اللہ کا حق بھی

ادا کیا اور اپنے آقاؐ کا بھی، دوسرا وہ آدمی جو کسی

جماعت کا امام بنا اور لوگ اس کی نیک عملی اور

پاکیزہ سیرت کی وجہ سے اس سے راضی اور خوش

رہے اور تیسرے وہ جو دن راتوں کی پانچوں

نمازوں کے لیے اذان دیا کرتا تھا۔ رسول کریمؐ

نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے جس بندے نے

سات سال تک اللہ کے واسطے ثواب کی نیت سے

اذان دی اس کے لیے آتش دوزخ سے برأت لکھ

دی جاتی ہے یعنی اس کے لیے اللہ کی طرف سے

یہ غلطی فرما دیا جاتا ہے کہ دوزخ سے اس کا کوئی

واسطہ نہیں اور اس کی آگ اور لپٹ کو اس بندے کو

چھونے کی اجازت نہیں۔ اسلام میں موزن کی

اتنی اہمیت ہے کہ رسولؐ خدا نے نہ صرف موزن کی

فرزاد بیکر کا کہنا

نظم

عشق محبت پر کوئی زور نہیں
یہ کھیل سب قسمت والے ہیں
تسکی کی جھولی عشق سے پڑ
کسی دل میں غم کے ڈیرے ہیں
کسی دل میں محبوب گھر کیے
کسی دل میں دکھ کے ڈھیر لگے
نہ کوئی جانے دل میں کیا چھپا
لگتے سب نظر کے دھوکے ہیں
کوئی چال چلے جب قسمت بھی
ایک لمحے میں سب کچھ ڈھیر کیے
کیسے وعدے تھے جو عشق میں کیے
کون سی قسمیں وعدے سب بھولے
یہ کیسے کھیل ہیں عشق کے
کہ قسمت جن پر وار کیے
کبھی دل الجھے، کبھی ذہن کہے!

مریم ماہ منیر

چھپا دکھ

وقت کے کیلنڈر سے کتنے ہی
برس ماضی کے سمندر
میں گرے اور
ڈوب گئے
مگر میرے صفحہ دل پہ نقش ہے

میرے اندر ہے کیوں
اتنی خاموشی
میری زندگی کی
حالت کیوں ہے
ایسی جیسے
لہروں سے ساحل کی
میں اس قدر کیوں
ہوں تنہا
تم جانا چاہتے ہو تو سنو
اس کی وجہ
اس کا سبب تم ہو
اب بتاؤ تم کیسے ہو؟

سیدہ نور الصبا علی

غزل

میں نے کوئی سورج کوئی تارا نہیں دیکھا
کس رنگ کا ہوتا ہے، اجالا نہیں دیکھا
سننے ہیں کہ اپنے ہی تھے گھر لوٹنے والے
اچھا ہوا میں نے یہ تمنا نہیں دیکھا
حالانکہ مجھے سنورنے کا شوق بہت ہے
اور میں نے بھی اپنا ہی چہرہ نہیں دیکھا
ہے میری ساعت میں نگاہوں کا اثر بھی
کیا تم نے یہ قدرت کا کرشمہ نہیں دیکھا
یہ شہر صداقت بھی عجب شہر ہے امتیاز
میں نے یہاں اک شخص بھی سچا نہیں دیکھا

ایس امتیاز احمد

غزل

پھول سی لڑکی جب اپنے روبرو ہونے لگی
آئینے سے دیر تک پھر گفتگو ہونے لگی
خواب تیرے پیار کے بنے لگیں آنکھیں مری
جب جواں اس دل میں تیری آرزو ہونے لگی

روشنی اور تیرگی کے درمیاں پھر ٹھن گئی
جب چراغوں سے ہوا کی گفتگو ہونے لگی
دو دلوں کے درمیان پھر فاصلہ بڑھنے لگا
جب انا کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی
ناامیدی کا تصور دل پہ غالب آ گیا
رائیگاں آخر ہماری جستجو ہونے لگی
میری آنکھوں میں اچانک آ گیا چہرہ ترا
خوب سے جب خوب تر کی جستجو ہونے لگی
جب کسی کی بے وفائی بڑھ گئی حد سے حکیم
رات بھر دیوار و در سے گفتگو ہونے لگی
حکیم خان حکیم

سرد ہوا

گرم لحاف کے اندر آتی سرد ہوا
کن خوابوں کو، کن سوچوں کو کن باتوں کو
کن کھوں کو کن باتوں کو
برف سا ٹھنڈا کر دیتی ہے
جب میری ٹھنکتی سوچوں کو
جو تیرے خیال کے شانے پر سرد ہر دیتی ہے
تو گرم لحاف کے اندر آتی سرد ہوا
سب کچھ برف سا کر دیتی ہے
فرزانہ شوکت

غزل

وفا کی راہ بڑی پُر خار لگتی ہے
زیست آنسوؤں کی دیوار لگتی ہے
میں نے چاہا نہیں تھا پھر سے کسی کو
ہر سوچ اپنی عملگزار لگتی ہے
زندگی ڈھل گئی پھر غم کے سانچے میں
تیری ہر خوشی ہمیں یادگار لگتی ہے
جا کے کوئی نہیں آتا پھر زمانے میں
تیری یاد بھی اب تو پُر نور لگتی ہے

رواڈ انجسٹ 245 مارچ 2016ء

ابھی تک وہی منظر
جہاں سے ہماری کہتیں بدلیں تھیں
جہاں وہ میرے مقدر کا ستارا ڈوبا تھا
تیری کج ادائی نے جو غم لگایا
ماہ و سال کی گردش سے وہ
نا سو رکا روپ دھار چکا ہے
جس سے محبت کا زہر ٹپک کر
میری روح کو زہر آلودہ کر رہا ہے
میری اندر کی ساری خواہشیں مر چکی ہیں
میرا دل ایک شکستہ حال بزمِ بہ بن چکا ہے
جہاں خوشی کا کوئی پھول نہیں کھلتا
جہاں صرف ببول اگتے ہیں
جس کی چھین سے میری روح پیہ
آبلے بڑھ چکے ہیں
خود سے چھڑنے ہوئے مجھے ایک
عرصہ بیت چکا ہے
میرا شکستہ پاؤں جو ایک ایسا کھنڈر
بن گیا ہے جہاں
عرصے سے صرف تیری یادوں کی
چمکا ڈوروں نے بسیرا کیا ہوا ہے

شہلا گل سحر

نظم

تم جانتے ہو کہ!
میں اس قدر ادا اس کیوں ہوں

رواڈ انجسٹ 244 مارچ 2016ء

سندھ

باوجود ہنسی آگئی۔ اب جاتے جاتے سب کا شکریہ جو میرے ادھورے سے لفظوں کو پسند کرتے ہیں اور صبا جی پسندیدگی پر شکریہ تو مانتا ہے ناں آخر آپ لوگ میرا سہروں خون جو بڑھاتے ہیں۔ رابعہ جی آپ کا بھی شکریہ۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔“

افشاں علی کراچی

ڈھیر ساری محبتوں، نیک تمناؤں، پر خلوص دعاؤں کے ہمراہ ردا کی تمام پیاری قارئین و شہزادیوں پیارے سے دل کی مالک صالحہ اپنا اور خوب صورت آواز کی مالک نورین آپی کو افشاں علی کا خوب صورت سی مسکراہٹ و محبتوں کی خوشبو سے سجا سلام الفت قبول ہو۔ خوب صورت سے سرورق کے ساتھ فروری کا شمار ہاتھ کی زینت بنا۔ ماریہ رضوی من موئی سی صورت لیے اپنے خوب صورت انداز و ڈریسنگ کے ساتھ سرورق پر چھائی نظر آئیں فہرست میں تو افسانوں کی بہار نظر آئی تو وہیں مابدولت کا نام بھی بھللا رہا تھا (آہم) بہت بہت شکریہ آپی میرے ناول کو فروری کی زینت بنانے کے لیے بلاشبہ آج میرے قلم سے نکلا ہر لفظ آپ ہی کی مرہون منت پہچان و نام بناتا ہے۔ اس لیے آپ کے نرم لہجے اور بحر پور تعاون کی میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اب بات ہو جائے خوب صورت سے فروری کے خوب صورت سے شارے کی۔ شروعات ہمیشہ کی طرح ”گوشہ آگہی“ سے کی خوب صورت لفظوں سے سجا گوشہ آگہی منتظر ملا۔ سعید واثق

ماریہ یاسر کراچی

آداب عرض ہے۔ سندھیے کی محفل کی رونق بڑھانے کے لیے ماریہ یاسر پھر سے حاضر خدمت ہے۔ ردا کا ساتھ ہو تو یہ سفر بھی گزری جاتا ہے۔ ردا نوجوان نسل کی لڑکیوں کے مشکل حالات میں ان کا ساتھ دیتا ہے جب جب وہ پریشان ہوتی ہیں انہیں حوصلہ اور بہت دیتا ہے۔ اس میں لکھنے والی تمام ہی رائٹر ز کمال کا ہمتی ہیں جنہیں پڑھ کے ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ اس ماہ کے ردا پر نظر ڈالی تو سرورق نہایت ڈیسٹ سا اور سردیوں کے لحاظ سے موزوں لگا۔ ماڈل میری ہم نام لگی۔ دو تین منٹ تو اس کے بالوں میں ہی کھوئی رہی (اپنے بال گر گر کے آدھے جو رہ گئے) حسرت سے ایک آخری نظر بالوں پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھی تو بالکی سی چیخ نکلی۔ افسانے کی اتنی لمبی لسٹ میرے خیال میں یہ رواں سال کی سب سے ہی افسانوں کی لسٹ ثابت ہوگی۔ فریدہ فرید، سیدہ فرزانہ اور صالحہ آپی کے نام دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ سعدیہ اقبال، زینب ملک، رابعہ افضال، ریسل آرزو اور پانی سب نے اچھا لکھا۔ عائشہ ذوالفقار کے تو کیا کہنے۔ ویسے عائشہ بی بی آپ کا پہلا سلسلہ وار ناول ہے کیا۔ بہت زبردست لکھ رہی ہیں آپ۔ ناولٹ دونوں ہی اچھے تھے۔ میری شاعری کسی لگی یہ بھی سندھیے میں بتائیے گا۔ اس ماہ کی ہری مرچیں میں نوشین جی کا Last والا زبردست تھراپ موڈ میں پڑھنے کے

بے مقصد زندگی بے بسی بے قراری دکھائی دیتا کوئی راستہ نہیں اسکول کالج کمپس اپنی جگہ ہیں سبھی مگر میں کہیں کا رہا نہیں

ساتھی زیر پھیلا

گلن

عجب

ہو

اگر

میرا

رب

گلن

کہہ کر

تمہیں میرا کر دے

سیدہ مول بخاری

غزل

محبت میں آنسو ہو گیا کوئی
لہروں کی طرح بکھر گیا کوئی
اشارہ دیجیے ابھی ہیں یہ آنکھیں کھلی
پچھمی کے پتھرے سے اڑ گیا کوئی
محبت کے ہاتھ کچھ یوں معاملہ رہا
بازی ہوئی کسی کی اور جیت گیا کوئی
اس کے لیے تو فقط ایک تھپڑ تھا
مگر اندر تک ٹوٹ گیا کوئی
پلکیں اٹھا کے دیکھا جو مجھے اس نے
خنجر بھی نہیں چلا اور قتل ہو گیا کوئی
اس کے چہرے پہ لکھی تھی داستانِ غم عامر
لگتا تھا ساتھ اس کے گزرا ہے حادثہ کوئی

عامر عزیز

کسی سے جب ملاقات ہوئی ہے جاوید
اس کی ہر بات پھر ہمیں تلواریں لگتی ہے
محمد اسلم جاوید

غزل

ان سے بھی کرتی ہے دنیا بے وفائی کا گلہ
جو بھٹاتے آ رہے ہیں آج تک عہد وفا
جو بھی پڑتے نہیں ہیں امتحانِ عشق میں
ہو نہیں سکتے کبھی رنج و الم سے آشنا
گامزن رہتے ہیں جو ساری جھکن کو بھول کر
سہل ہو جاتا ہے ان پر منزلوں کا راستہ
غیر کا شکوہ کسی بھی طور کر سکتا نہیں
اپنے لوگوں نے مجھے بخشا ہے مرضِ لا دوا
ایک ویرانا سا ہے حدِ نظر تک دوستو
نہ کہیں سخنِ چمن ہے نہ کہیں موجِ صبا
دھوپ کی چادر تنی ہے دور تک سایہ نہیں
ہے پریشان جس کے ہاتھوں میں ہے پتلا موم کا
کیا گسر باقی رہے برباد ہونے میں قمر
کشتیوں کو جب ڈبوئے پر تلا ہو ناخدا
ریاض حسین قمر

غزل

سنو میرے پاس وفا نہیں
محبت کی مجھے صدا نہیں
دلوں سے کھیلنا میرا مشغلہ
دیتا مجھے کوئی سزا نہیں
دن رات ایک جیسے ہیں میرے
روزگار کا کوئی سلسلہ نہیں
آوارگی میری پہچان ہے اب
مستقبل کا کچھ پتا نہیں
ڈگری دیکھ کر سوچتا ہوں
اس کا کوئی فائدہ نہیں

بھائی کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ شاعری بھی پسند آئی۔ فاطمہ خان ردا میں اچھا اضافہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ”محبت جاوداں ہے“ خوب صورت نام ہی کی طرح خوب صورت تحریر بہت زبردست منظر کشی کی گئی۔ ”عنادل تمہاری ہوئی دل سے“ مکمل ناول بھی کافی پسند آیا۔ عائشہ ذوالفقار کے ناولٹ نے شروعات سے ہی اپنا اسیر بنایا ہوا ہے بہت خوب صورت ناول جا رہا ہے۔ شازیہ جی آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ”میری خوشی کا آغاز تم ہو“ قرۃ العین سکندر نے بھی اچھا ناولٹ لکھا۔ اب آتے ہیں افسانوں کی طرف اس بار ایک سے بڑھ کر ایک افسانے شامل رہے بھی افسانے بہت پسند آئے کچھ ایک تو کافی سبق آموز بھی تھے۔ یوم مجتوں، محبت کے دن ہزار، یہ ویلفائن کے عنوان پر تحریر بھی۔ وہیں سونیا چوہدری نے ویلفائن کی اصلیت بہت اچھے سے واضح کی۔ رابعہ فضال نے بھی افسانے میں اس محبت کے نام و نہادوں کی اصلی شکل پیش کی۔ ثناء کنول، سیدہ فرزانہ حبیب اور اسویر علی کے افسانے دل کو چھو گئے۔ بہت ہی اچھا لکھا۔ فریدہ فرید اور فرح ناز رفیق سمیت مون شاہ آپ تینوں ایک الگ موضوع کے ساتھ حاضر ہوئیں آپ کی تحریریں بھی کافی منفرد تھیں۔ حمیرا قریشی، شہلا گل اور اقراء سیف نے مختصر پیرائے میں سبق آموز افسانہ لکھا۔ صالحہ آپنی آپ کی تحریر ہوا اور پسند نہ آئے ناممکن بہت انوکھی و دلچسپ تحریر بھی۔ ریمل آرزو، زینب ملک ندیم اور سعیدہ اقبال نے بھی کافی اچھا لکھا۔ الغرض اس بار کا ردا خوب سے خوب تر رہا۔ ردا کی ڈائری سے ریمنا نور رضوان، روشنی فاطمہ، ایم جے قریشی، مہرین کنول اور مصباح مسکان کی ڈائری پسند آئی۔ اشعار، اس ماہ میں اور خوشبو سبھی اچھا تھا جب کہ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سبھی کی شاعری چھائی رہی۔

ردا ڈائجسٹ [248] مارچ 2016ء

”سندیے“ میں عائشہ نیازی، صبا عبدالغنی، کیتی آراء، رابعہ افضل نے خوب روشنی بڑھائی۔ صبا عبدالغنی کیا خوب و جامع تبصرہ لکھا۔ زبردست یارا دوستوں کے نام پیغام میں سب کے پیغام اچھے لگے اب ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ افشال علی کو اجازت۔

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

سویت سی صالحہ آپنی، نورین جی اور قارئین کو پیار بھرا سلام۔ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے آپ سب سے معذرت کہ کچھ ذاتی مصروفیات کی بنا پر سندیے میں شامل نہ ہو سکی مگر اب اس بزم میں آپ سب کے ساتھ ہوں (افشال ڈیئر اب تو شکایت دور ہو گئی ناں!)۔ اپنے فوٹو ناول ”تیرے پیار کی خوشبو“ فروش جی بہت ہی خوب صورت انداز میں ہر کردار کو سمیٹا مبارک باد قبول ہو۔ نورین ملک اور صالحہ آپنی کا شکریہ جنہوں نے فون اور اپنے پیغام کے ذریعے مبارک باد اور پر خلوص دعاؤں سے نوازا اور ان تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے زندگی کے اس حسین موقع پر ای میلز، کالز اور فیس بک کے ذریعے مبارک باد دی۔ دانیہ آفرین کا دل کی گہرائی سے شکریہ جو میری شادی میں شریک ہوئی۔

مصباح مسکان رؤف امینہ رؤف۔ جھلم

پیارے پیارے پاکستان اور اس میں بسنے والے سب پیارے لوگوں کو مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف کا محبتوں چاہتوں بھرا السلام علیکم! تو جناب ہم سب خیریت سے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ سب بھی ٹھیک ٹھاک فٹ فاٹ ہوں گے۔ سب سے پہلے تو یہ بتاتے چلیں کہ ہمارا یعنی (مصباح) کا ایم اے اردو اللہ کے فضل و کرم سے مکمل ہو گیا ہے۔ خیر مبارک یہ سب اللہ کا کرم اور میرے سب پیاروں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ اللہ ان

کے لیے۔ ورنہ کچھ نہ لکھوں تو خوشی کے باوجود روح بے چین رہتی ہے۔ میرے اندرونی سکون کے لیے بہت بہت شکریہ اور اگرچہ میں لفظوں کا حق ادا کرنے میں طفل کتب ہوں مگر آپ کی رہنمائی یا حوصلہ افزائی شاید اچھا لکھاری بننے میں مدد دے۔

شبانہ زبیر۔ لہیہ

السلام علیکم! سب سے پہلے اسٹاف ردا، صالحہ محمود، اپنے خاوند زبیر، اپنے کزنز ایم جے قریشی اور پاکستانیوں کو نیا سال 2016ء مبارک ہو۔ اللہ کرے 2016ء پاکستان اور پاکستان میں بسنے والوں کے لیے خوشیوں کی ٹوید لائے۔ ماہ فروری 2016ء کا ردا ڈائجسٹ ہنستا مسکراتا ہزاروں رنگ بکھیرتا بارہ تاریخ کو ہمارے گھر کی دہلیز پر اپنا پیارا قدم رکھ چکا تھا۔ ردا پر نظر پڑتے ہی ساری محنت دور ہو گئی اور مرجھائے چہرے پر بہار آ گئی۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ اس کے بعد حسب عادت فہرست پڑھی۔ پھر آگے چل کر ”خوشبو آگئی“ سے دل کو ٹھنڈک پہنچائی۔ مکمل ناول بہت پسند آئے۔ ناولٹ بھی اچھا رہا۔ افسانے میں گھوڑی، شکستہ آرزو، محبت دکھ دیتی ہے، باقی بھی اچھے تھے۔ ”ردا کی ڈائری“ میں ایم جے قریشی، مہرین کنول، دھنک ناز نمبر لے گئے۔ باقی فریڈ نے بھی اچھا لکھا۔ اشعار میں سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ”اس ماہ میں“ سب نے اچھا لکھا۔ ”خوشبو“ میں ہر لفظ خوشبو کی طرح مہک رہا تھا۔ ”ذرا پھر سے کہنا“ میں سب کا کلام دل کو بھایا۔ سندیے میں سب سکھوں نے خوب محفل بھائی۔ چکن میں جا کر بہت خوب سیکھا۔ سنگھار میں جلد کی حفاظت سیکھی۔ بہت کم وقت میں ردا پڑھ کر یہی کچھ لکھ سکی۔ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اجازت۔“

صبا عبدالغنی۔ کراچی

باد صبا کے سنگ چٹا اور خوشبوؤں سے مہکتا سلام الفت قبول ہو۔ فروری کا شمار جیسے ہی ہاتھوں

سب کی دعائیں اور پیار ہمیشہ یونہی قائم و دائم رکھے، آمین۔ ردا ہمیں اتالیٹ ملتا ہے کہ اس کے آنے تک ردا میں حاضری کی ڈیٹ فریب آ جاتی ہے۔ ہم چاہ کر بھی ہر ماہ ردا کی محفل میں حاضری نہیں دے پاتے لیکن خیر کوئی بات نہیں گزشتہ ماہ کے ناولز تبصرہ کر لیتے ہیں، جن میں سب سے پہلے نیا سلسلے وار ناول ہے جس کا انداز اور موضوع قدرے منفرد اور دلچسپ ہے۔ لگتا ہے کافی مزہ آنے والا ہے۔ آئندہ اقساط سے۔ ویری گلد عائشہ جی۔ فریدہ فرید جی آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ دل کو لگنے والے الفاظ و انداز۔ ماریہ یاسر، صالحہ آپنی، سیدہ فرزانہ بہت اچھا لکھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ریمنا نور رضوان ہمیں اپنی فرینڈ لسٹ میں شامل کرنے کا بہت شکریہ جی۔ فریدہ فرید آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے ہمیں یاد رکھا۔ امید ہے انشاء اللہ جلد ہی حاضر خدمت ہوں گے۔ آپ کے خلوص و محبت کے ہم مشکور ہیں۔ اشعار، خوشبو، ردا کی ڈائری، اس ماہ میں اور ذرا پھر سے کہنا حسب معمول ایک سے بڑھ کر ایک۔ پیاری بہنوں کا پیارا انتخاب دل کو بھلا لگا۔ دلچسپ سندیے پڑھ کر خوشی ہوئی بہت اچھا لگا۔ چلیں نیک تمناؤں اور ڈھیروں محبتوں کے ساتھ اب ہم اجازت چاہتے ہیں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاک وطن پر اپنا کرم کرے اور ہم سب کی تمام مشکلات و پریشانیاں آسان فرمائیں۔

شہلا گل سحر۔ کوہاٹ

سلام محبت اور زور قلم اور زیادہ۔ ایمان، صحت اور آپ کا سایہ سلامت رہے، آمین۔ کیا کروں ردا سے پہلے ملتا ہی نہیں تبصرہ کی حسرت دل میں دبائے بیٹھے ہیں۔ بہت ارمان ہے آپ سے فیس ٹو فیس ملنے اور دیکھنے کا۔ سینکڑوں ردا کے ذریعے ایک نئی پہچان دینے کی اور اتنی پیاری بہنوں سے ملوانے

فردوسِ شہنائی

پیاری دوست کے نام

میری بہت ہی خاص و پیاری سی دوست
کشف ضیاء کے نام میرے دل کی تمام
گہرائیوں سے نکلا یہ چھوٹا سا پیغام کشف ضیاء وہ
نام وہ ذات جو ہر قدم پر موڑ پر میرے سنگ سنگ
ہے جس نے میری زندگی میں اپنی دوستی کے خوب
صورت رنگ بکھرے جو اپنے نام ہی طرح روشنی
بکھیرتی ہے میں اپنی خاص دوست کو اپنے پیارے
ردا کے توسط سے اس خوب صورت دن کی مبارک
باد دینا چاہتی ہوں جس دن وہ اس دنیا میں آئی یعنی
19 مارچ۔ میری پیاری سی دوست، کشف ضیاء کو
ڈھیر ساری محبتوں، پر خلوص دعاؤں اور دل کی
گہرائیوں سے سالگرہ کی بہت بہت مبارک۔
میں نے چاہا کہ کوئی ایسا تحفہ تیری نذر کروں
جسے تو عمر بھر یاد رکھے

پھر ایک لمحے کی سوچ نے میرے ہاتھ بلند کیے
کچھ دعاؤں کے پھول دل کی گہرائیوں سے آزاد کیے
کہ تیری آنکھوں کے دیئے سدا چمکے
خدا تیرا دامن مسرتوں سے ہمیشہ ہمکنار رکھے
بہت سی دُلفریب یادیں
اور گلاب گلوں کی چاندنی تیرے دل کو بھلائے
محبتوں کی چاشنی خدا تیرے آس پاس بکھرائے
تو گزرے محلوں سے پیار کرے

کر دیا کہ محبت صورت کی محتاج نہیں ہوتی۔ شہلا گل
سحر! آپ کی تحریر کمال کی تھی۔ اقراء سیف! آپ کا
افسانہ مختصر پراثر تھا۔ زینب ندیم ملک! آپ کی تحریر
بھی مختصر، پراثر تھی۔ حور پینہ سعد! آپ کی پہلی کہانی
کی طرح دوسری بھی اچھی تھی۔ ردا کے سنگ اپنا سفر
مزید جاری رکھیے گا۔ اسویرہ علی! آپ کا افسانہ
لا جواب تھا۔ فرح ناز رفیق! آپ کا افسانہ بہترین
تھا۔ باقی تمام مستقل سلسلے بہترین تھے۔ ”سندیے“
کی محفل ہر بار کی طرح بارونق تھی۔ ٹاپ پر موجود
عانیہ نیازی کے سندیے کو دیکھ کر خوشگوار حیرت
ہوئی۔ بے شک آپ کو ہم نے بہت مس کیا۔ اب
دوبارہ غائب مت ہو جائے گا۔ اوکے۔ افشاں علی!
مصروفیت کے باوجود آپ کی حاضری نے دل خوش
کر دیا۔ ایسے ہی ردا میں شامل رہیے گا۔ فرح ناز
رفیق! افسانوں کے ساتھ ساتھ سندیے میں بھی
آپ کی شرکت بہت اچھی لگی۔ کینٹی آراء! آپ کا
تبصرہ ہر بار تعریف کا حامل ہوتا ہے۔ رابعہ افضال
خان! میرے دوش کرنے سے آپ کو خوشی ہوئی جان
کر اچھا لگا لیکن صرف خوشی سے گزارہ نہیں ہے
بدلے میں آپ کو بھی مجھے میری برتھ ڈے دوش کر
کے خوشی دینی ہوگی۔ میری برتھ ڈے 2 مئی کو
ہے۔ (یاد رہے کہ گاناں؟) ”دوستوں کے نام پیغام“
میں تمام پیغام اچھے تھے۔ حنا کنول، تبسم فیاض،
اقراء چند اور شازیہ مصطفیٰ آپ سب کی مارچ کے
مہینے میں برتھ ڈے ہے تو میری طرف سے
Many many happy returns of
the day. اور ہاں کشف ضیاء! آپ کی بھی برتھ
ڈے ہے تو میری طرف سے آپ کو سالگرہ کی
ڈھیروں مبارک باد۔ ”پکن“ اور ”سنگھار“ ہر بار
کی طرح بہترین تھے۔ اسی کے ساتھ اجازت
اللہ حافظ۔“

☆.....

کی زینت بنا دل و دماغ کو معطر کر گیا۔ سرورق پر
موجود پیاری سی ماریہ رضوی نے توجہ کھینچی۔ اشتہار
سے، چھلانگ لگا کر فہرست کی طرف بڑھے۔ اتنی
بے شمار تحریریں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ عائشہ
ذوالفقار! آپ کا ناول بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہا
ہے۔ حائقہ کا کردار بہت اثریٹھو ہے لیکن اتنی سی
جان پر اتنا ظلم اچھا نہیں لگا۔ عمیرا تو بہت سنگدل
انسان ہے۔ آپ کا ناول بڑھنے میں بہت مزہ آرہا
ہے، ویلڈن۔ شازیہ مصطفیٰ! آپ کی کمی بہت
محسوس ہوئی۔ افشاں علی! نہایت ہی اعلیٰ تحریر تھی
آپ کی۔ ایس حبیب خان! ردا میں آپ کی پہلی
تحریر ہے تو موسٹ ویلکم۔ فاطمہ خان! آپ کا
ناولٹ بہت عمدہ تھا۔ قرۃ العین سکندر! آپ کی
کہانی کا نام بہت پیارا تھا۔ بے شک یہ دنیا ایک
بہترین انتقام گاہ ہے۔ ہر عمل کا رد عمل ضرور ہوتا
ہے۔ نظیر فاطمہ! آپ کی تحریر بالکل پھلکی بہت اچھی
لگی۔ ماریہ یاسر! آپ کی مسلسل حاضری اچھی لگتی
ہے۔ ثناء کنول! میرے دل کی ملکہ تو آپ ہیں۔
سونیا چوہدری! ردا میں آپ کا آپ نے پہلی بار دروازہ
بجایا ہے تو ہم ردا میں آگے دروازہ کھولتے ہوئے آپ
کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ رابعہ افضال! آپ کا
منفرد انداز بیان آپ کو خاص بناتا ہے۔ فریدہ
فرید! افسانوں میں تشریف آوری فرما کر سندس کی
محفل سے کہاں غائب ہیں؟ ذوق کا انداز محبت
بہت، انوکھا لگا اور بہت اچھا بھی۔ سیدہ فرزانہ
حبیب! آپ کا افسانہ بہترین تھا۔ حمیرا قریشی!
سب سے پہلے تو پہلی حاضری پر خوش آمدید۔ کم عمر،
الہز اور نادان لڑکیوں کے لیے آپ کی تحریر بھینا موثر
ثابت ہوگی۔ ریمیل آرزو! آپ کی تحریر جس سے
بھر پور تھی۔ صالحہ آبی! آپ کی تحریر پر میرا تبصرہ
”چھوٹا منہ بڑی بات“ کے مترادف ہے۔ مجھے
اچھی لگی۔ مون شاہ! آپ نے اپنی تحریر سے ثابت

خداے عزوجل تیری عمر دراز کرے
اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا کرے، آمین
Wish you many many
happy return of the day.
افشاں علی۔ کراچی

میرے سونیٹ Husband
آصف خان کے نام

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں
میرے جذبہ دل کی شدتیں
میرے خواب، میری بصارتیں،
میری دھڑکنیں، میری چاہتیں
جو تیرے قدم میرے کھرچیں
میرے ساتھ جس قدر چلیں
تیری قربتوں میں سمیٹ لوں
رہ زندگی کی مسافتیں
یہ رداے جان تجھے سونپ دوں
کہ نہ دھوپ تجھ کو کڑی لگے
کہیں دکھ نہ تجھ کو عطا کریں
سردشت غم کی تمازتیں
تیرے نام سے میری صبح ہو
تیری یاد سے میری شام ہو
تیری روبرو ہیں سرخرو میرے چشم دل کی عبادتیں
تیرا پیار میری دعا ہے یہی فکر مجھ کو سدا رہے

کہ ہر اہر ہے تیرا نفل جاں کہ
نصیب ہوں تجھے راحتیں
میرے روز و شب کے نصاب میں
میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
تیرا فرض ہے میری زندگی
میری سائیں تیری امتیں

سیدہ فرزین حبیب - کراچی
مجھے چاہئے والوں کے نام
متاثر ہم نہیں ہوتے اتنی جلدی کسی سے مگر نور
کچھ لوگوں کو دل میں اتر جانے کا فن آتا ہے
ریمانو ررضوان - کراچی
میری پیاری بیگم، میری زندگی کے لیے

جان میری جان
تم اگر نہ ہوتے تو
اس دنیا میں ہم بھی نہ ہوتے
بنایا ہے میرے پیارے رب نے
بہت بہت پیار سے میرا پیار
شکر ادا کرتا ہوں پل پل
اپنے سونے رب کا
جب دیکھتا ہوں تم کو میری جان
وہ بل بھی کم لگتے ہیں
شکر ادا کرنے کے لیے
میں تمہارا نام نہیں لیتا میری ریمنا
یہ نظم تمہارے لیے لکھی ہے

نحمدہ رضوان - کراچی
پیاری بہن کے نام، مسکان کا پیار

بہن ہماری جان
کبھی گلاب تو کبھی چینی ہے وہ
بہن کے روپ میں اک مخلص سہیلی ہے وہ

اچھی بھی ہے وہ اتنی پیاری بھی ہے
ہے فخر کہ ایسی بہن ہماری بھی ہے
ہوئی ہے خفا پھر جلدی ہی مان جاتی ہے
ہماری خطاؤں کو وہ ہنس کے نال جاتی ہے
ہے وہ ہمیشہ سے ہمارے دکھ کی ساتھی
دعا ہے رہے وہ سدا بہتی مسکراتی
ملے اسے دنیا کی ہر ایک خوشی
نہ ہو بھی دور اس کے لبوں سے ہنسی
خدا کرے سدا سنگ سنگ یہ رہے مکان
کہ اس بہن میں ہی ہے بسی ہماری جان
مصباح مسکان رؤف - جہلم
پیاری آپنی صالحہ جانی اور دوستوں کے نام
پیاری آپنی صالحہ محمود، تمام اسٹاف، قارئین
اور دوستوں کو السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ سب کی
جھولیوں کو خوشیوں سے بھر دے، آمین۔ پیاری
آپنی صالحہ جانی سب سے پہلے میں آپ کی
نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ فرید باہو،
گوڈی اور انٹروپوشاٹ کر کے آپ نے مجھے خوش
کر دیا۔ امید کرتی ہوں انشاء اللہ ہمارا اور آپ کا
تعلق تا عمر رہے گا۔ جزاک اللہ۔ آپ سمیت
تمام دوستوں کی محبت کا شکریہ مجھ پر فرض تھا
اگرچہ کچھ دیر ہو گئی لیکن میں معذرت خواہ ہوں
اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مختصر لفظوں میں
دوبارہ شکریہ ادا کرتی ہوں۔ دل بہت چاہتا ہے
ہر ماہ ردا میں شرکت کرنے کا لیکن پڑھائی اور
دیگر مصروفیات بند باندھ دیتی ہیں۔ تقریباً دو تین
ماہ بعد میرے فرسٹ ایئر کے امتحانات ہونے
والے ہیں۔ درخواست کرتی ہوں آپ سب
سے کہ میرے لیے دعا کیجیے گا میں کامیابی سے
سال اول مکمل کر لوں۔ آخر میں افشاں علی، ملالہ

اسلم، صبا عبد الغنی، رابعہ افضال خان، ثناء کنول
اللہ دتہ اور راجین ناز کے لیے نیک تمناؤں کا
اظہار..... تمام اچھی دعائیں آپ سب کے نام۔
دعاؤں میں یاد رکھیے گا، و سلام۔

سیدہ مون بخاری - سرگودھا
اپنے سہینڈ کے نام

میری زندگی کے ہمسفر، تجھے کیا پتا تجھے کیا خبر
یہ جو تیرا میرا ساتھ ہے
زرد روشنیوں کے نام ہے
ہو بھی مجھ سے کوئی خطا
نہ ہوتا تم مجھ سے خفا
تجھے پیار کروں میں بے پناہ
تو بھی رکھنا مجھ کو سب سے خاص

یہ جو تیرا میرا ساتھ ہے
زرد روشنیوں کے نام ہے
جب ہوتے ہو تم مجھ سے دور
تجھے یاد کروں میں بے پناہ
میرے دل کا حال تجھے کیا پتا
یہ تو جانے صرف میرا خدا
ہو جب بھی تجھ کو کوئی گلہ
مجھ کو دینا تم صرف اک صدا
سب کچھ میں چھوڑ چھاڑ کے
دور کروں میں تیرا گلہ
تو بھی کرنا مجھ سے بہت ہی پیار
نہ چھوڑ کے تو جانا کہیں
میری زندگی کے ہمسفر
تجھے کیا پتا تجھے کیا خبر
یہ جو تیرا میرا ساتھ ہے
زرد روشنیوں کے نام ہے

یاسر میں ردا ڈائجسٹ کے توسط سے آج

آپ سے یہ اظہار کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کا پیار
اور ساتھ میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے اور ساتھ
ہی آپ کو Thanks بھی کہنا چاہتی ہوں کیونکہ
آپ نے ہی میرے لکھنے کے شوق میں بھرپور
ساتھ دیا۔ آپ کے Motivate کرنے سے
ہی میں نے لکھنے کی ہمت کی اور پیارے ردا کے
ذریعے میرا یہ شوق پورا ہوا۔ ساتھ ہی صالحہ آپنی اور
نورین کا بھی شکریہ جنہوں نے سب سے پہلے
میرے لیے ردا کا روزانہ کھولا۔ اس کے بعد تو ہر طرف
سے راستے کھلتے چلے گئے لیکن پہل تو آپ نے ہی
کی اس لیے شکریہ۔ میں اپنے Husband کو
سر پرانز دینا چاہتی ہوں اپنی اس غزل کے
ذریعے جو میں نے صرف انہی کے لیے لکھی۔

ماریا یاسر - کراچی
مس شمرین صبا کے نام

سب سے پہلے السلام علیکم! امید ہے اب
بالکل ٹھیک ٹھاک اور مزے میں ہوں گی۔ بہت
دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو کیا گفت دوں۔ تو
سوچا کیوں نہ اپنے فیورٹ ردا کے توسط سے آپ
کو اپنے عقیدت مندانہ جذبات اور دعاؤں کو بطور
تختہ پیش کروں اور اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے
کے لیے آج قلم تھاما ہے۔ ہر ٹیچر سے مجھے بہت
عقیدت ہے لیکن آپ سے تھوڑی زیادہ
ہے۔ کیونکہ آپ نہ صرف ہمیں بہت اچھا پڑھائی
ہیں بلکہ آپ ہماری اچھی تربیت بھی کر رہی
ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ بہت اچھی ڈاکٹر
بنیں۔ امید ہے گفت اور سر پرانز دونوں آپ کو
پسند آئے گا۔ گفت کیسا لگا ضرور بتائے گا۔

صبا عبد الغنی - کراچی



بیف قیمہ ہری مرچیں

اجزاء:	بیف قیمہ
پیاز (سلاکس کاٹ لیں)	دو عدد
آٹل	پون کپ
لہسن، ادراک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
گرم مصالحہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
دہی	ایک کپ
ہری مرچیں (چھوٹی)	آدھا کپ
ترکیب:	سوس پین میں کوئنگ آٹل گرم کر کے پیاز ڈال کر فرانی کریں پیاز سنہری ہو جائے تو قیمہ، لہسن، ادراک پیسٹ، نمک اور ہلدی پاؤڈر ڈال کر قیمہ بھون لیں۔ قہے کا پانی خشک ہو جائے تو دہی ڈال کر ڈھک کر ملکی آٹچ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو مصالحہ بھون لیں۔
ہری مرچیں اور کٹا ہوا گرم مصالحہ ڈال کر دم پر رکھیں۔ مزیدار بیف قیمہ ہری مرچیں تیار ہے۔	
سروگوش میں نکال کر چپانی کے ساتھ سرو کریں۔	
چنے کی دال گوشت	

چنے کی دال (اچھی ہوئی)	ایک پیالی
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	دو عدد
پسا ہوا لہسن اور ک	ایک کھانے کا چمچ
پسی ہوئی ہلدی	ایک کھانے کا چمچ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
پسا ہوا گرم مصالحہ	ایک کھانے کا چمچ
تجنہ اور پسی دار چینی	ایک چائے کا چمچ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچ
گرم پانی	چار پیالی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ایک پیالی
پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس، ادراک	
چھڑکنے کے لیے	
ترکیب:	دہی میں بونیاں، 1/2 پانی، پیاز، لال مرچ، ہلدی، لہسن اور کھانے کا ملا کر پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو اس میں دال اور باقی پانی شامل کر کے دال اور گوشت یکجان ہونے تک پکائیں۔ اس میں باقی اجزاء ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار دال گوشت پودینہ، ہری مرچیں، لیموں کا رس اور ادراک ڈال کر پیش کریں۔
پودینے کی چٹنی	

ضروری اشیاء:

پودینہ

آدھا کلو

بکرے کی بونیاں

ہرا دھنیا	آدھی گٹھی	اناروانہ	دو کھانے کے چمچ
ہری مرچیں	دس عدد	سبز مرچ	چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
اناروانہ	پانچ چائے کے چمچ	خشک دھنیا	دو چائے کے چمچ
لہسن کے جوے	چار عدد	کوئنگ آٹل	حسب ضرورت
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ	ترکیب:	اروی کے پتوں کو دھو کر باریک کاٹ لیں۔ ہری مرچیں بھی دھو کر باریک کتر لیں پیاز کو باریک چھون میں کاٹ لیں۔ دھنیے کو توڑے پر ہلکا سا بھون لیں۔ ہرے دھنیے کی پتیاں چن کر باریک کاٹ لیں۔ اناروانے کو چن کر صاف کر لیں۔ اب ان تمام اجزاء کو مین میں ملا دیں۔ نمک مرچ بھی ڈال دیں اور پانی ڈال کر اس آمیزے کی پیسٹ سی بنا لیں۔ پیسٹ دیر رکھا رہنے دیں۔ ایک کڑا ہی میں تیل گرم کر کے اس میں پہلے سے تیار کردہ آمیزے سے پتوں بنا کر تیل لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر کڑا ہی سے نکال لیں اور ہری مرچ اناروانے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔
گاجر آلو بھجیا			

اجزاء

ایک پاؤ

ایک پاؤ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

آلو

گاجر

زیرہ

رائی دانہ

خشک دھنیا پاؤڈر

ہلدی

سرخ مرچ

گرم مصالحہ

اچھور

ہرا دھنیا (چوڑ)

اروی کے پتوں

اجزاء

اروی کے پتے

دو عدد

حسب ضرورت

آدھا پاؤ

آدھی گٹھی

ایک پاؤ

ہرا دھنیا

تین

سنگھار

1- خشک جلد: اگر آپ کی جلد خشک ہے تو سب سے پہلے آپ بغیر چکنائی والی فاؤنڈیشن یا کریم چہرے پر لگائیں۔ خشک جلد کے لیے موچر انرزا یا موچر انرنگ لوشن استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لوشن جلد کو نمی اور روشن فراہم کرتا ہے۔

2- چکنی جلد: چکنی جلد کے لیے جو فاؤنڈیشن استعمال کیا جائے اس میں بنیادی عنصر پانی ہونا چاہیے۔ ایسی جلد والی خواتین کو ویلو اسٹھ لوشن استعمال کرنا چاہیے۔ یہ چہرے کے لیے بہترین اسٹریچٹ ہے۔ روغنی جلد والی خواتین کو اسکن ٹانک کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے بجائے ہلکی ہلکی کلینر سے جلد صاف کر کے ویلو اسٹھ لوشن لگانا بہتر ہوتا ہے۔

3- نارمل جلد: یہ جلد کی سب سے بہترین ساخت ہے۔ جن خواتین کی جلد نارمل ہو انہیں چکنی اور پانی کی آمیزش والی فاؤنڈیشن لگانی چاہیے کیوں کہ یہ اس جلد کے لیے بہت مفید ہوتی ہے۔

4- حساس جلد: حساس جلد سے مراد ایسی جلد ہے جو بہت ہی نازک ہوتی ہے ایسی جلد کو پریشان کن جلد بھی کہا جاتا ہے۔ جن خواتین کی جلد حساس ہو انہیں چاہیے کہ وہ بغیر چکنائی والی فاؤنڈیشن استعمال کریں کیوں کہ ان کی جلد کے مسامات ویسے ہی زیادہ چمکانا ہٹ خارج کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ وہ ادویات پر مشتمل فاؤنڈیشن استعمال کریں جو ان کے لیے مفید ہے۔

جلد کی ساخت کے اعتبار سے میک اپ

میک اپ ہمیشہ جلد کی ساخت اور چہرے کی رنگت کو مد نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔ آپ جلد کی ساخت کے اعتبار سے میک اپ کریں گی تو میک اپ درست ہو سکے گا۔ جلد کی ساخت کی طرح کی ہوتی ہے۔ مثلاً چکنی جلد، خشک جلد، نارمل جلد، حساس جلد اور اسی طرح چہرے کی رنگت بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ گندمی رنگت، سرخی مائل رنگت، سیاہ رنگت، زرد رنگت، زیتونی رنگت۔ ان میں سے خشک، چکنی اور نارمل جلد پر ایک ہی طرح کا میک اپ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح چہرے کی رنگت کے اعتبار سے اشیاء استعمال کرنی چاہئیں۔ چاہے آپ کی رنگت سفید ہو یا گندمی اگر آپ سفید رنگت کی مالک ہیں تو آپ کو ہلکا میک اپ بھی کرنا چاہیے اور تیز میک اپ بھی۔ دونوں طرح کا میک اپ آپ کی سفید رنگت پر نکھار پیدا کرے گا اور اگر گندمی رنگت کی مالک ہیں تو آپ کو نیچرل کلر کا میک اپ کرنا چاہیے اور ہلکے رنگ کے لباس پہننے چاہئیں۔ مثلاً اورنج، ہلکا پیلا، گلابی، ہلکا نیلا، ہلکا گلابی وغیرہ۔ میک اپ کرتے وقت اپنی گردن کو بھی خاص طور پر مد نظر رکھیں۔ میک اپ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چہرے اور گردن دونوں کی رنگت ایک جیسی ہو۔ میک اپ زیادہ گہرا نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ مصنوعی معلوم ہوگا اور آپ بالکل ماڈل نظر آنے لگیں گی۔ ذیل میں ہم مختلف جلدوں پر میک اپ کرنے کے طریقے درج کر رہے ہیں۔

اور گو بھی ایک ساتھ کس کر لیں۔ کالی مرچ اور کوکونٹ شامل کر کے مزید کس کریں۔ دال اور چاول گراؤ کر کے آٹا بنائیں اور ڈرائی روست کر کے گو بھی کے کچر میں کس کر لیں۔ اب آلو شامل کر کے میٹھ کریں اور لعلش بنا لیں۔ پہلے انڈے اور پھر بریڈ کر مزے میں رول کریں۔ دوبارہ انڈے میں ڈپ کر کے گرم آئل میں فرائی کر لیں۔ کچپ یا سوس کے ساتھ سرو کریں۔

سیلڈ سینڈ وچ

اجزا
بریڈ : تین سلاٹس (کنارے کاٹ لیں)
انڈا : ایک عدد (بال کر سلاٹس کاٹ لیں)
ٹماٹر : ایک عدد (سلاٹس)
کھیرا : ایک عدد (سلاٹس)
بند گو بھی (کشی کی آدھا کپ گئی)
سلاڈ پتا (چوڑا) : آدھا کپ
ماونیز : تین کھانے کے چمچ
کالی مرچ پاؤڈر : حسب ذائقہ
نمک : حسب ذائقہ
ترکیب : پہلے سلاٹس پر ماونیز لگا کر انڈے، ٹماٹر اور سلاڈ پتے کی تہ لگائیں۔ دوسرے سلاٹس پر ماونیز لگا کر اوپر رکھیں اور اس پر ٹماٹر، کھیرا اور بند گو بھی کی تہ لگائیں۔ تیسرے سلاٹس پر ماونیز لگا کر نمک اور کالی مرچ چھڑکیں اور اوپر رکھ دیں۔ تیار ہونے پر کٹ کر سرو کریں۔

ادریک : ایک انچ کا کلوا (باریک کاٹ لیں)
نمک : حسب ذائقہ
آئل : حسب ضرورت
ترکیب : گرم آئل میں زیرہ اور رائی دانہ کڑ کڑا کر ادریک کو صرف 20 سیکنڈ بھونیں۔ پھر اس میں آلو اور گاجر شامل کر کے بھونیں۔ اب گرم مصالحہ اور اچھوڑا لیں اور ڈھک کر پکھن دیں۔ تیار ہونے پر ہرے دھنیے اور ادریک سے گارنش کر کے سرو کریں۔

کچپ کلش

اجزا
بند گو بھی : آدھا عدد (چوپ کر لیں)
انڈا : تین عدد (پھینٹ لیں)
پیاز (چھوٹا) : دو عدد (چوڑا)
آلو (چھوٹے) : دو تین عدد (بال کر میٹھ کر لیں)
ہری مرچ : چھ عدد (چوڑا)
کوکونٹ : پون کپ (گریڈ)
بریڈ کر مز : ایک کپ
پٹنگ : ایک چمچ
وال چنا : ایک کھانے کا چمچ
چاول : ایک کھانے کا چمچ
ہرا دھنیا (پتے) : دو کھانے کے چمچ
ثابت کالی مرچ : پانچ چھ عدد
ادریک : ایک انچ کا کلوا
نمک : حسب ذائقہ
آئل : حسب ضرورت

ترکیب : پیاز، ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادریک

رخساروں پر سرخ نشانات قدرے واضح ہوتے ہیں۔ سرخی مائل رنگت رکھنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ پیلاہٹ مائل رنگ کی فاؤنڈیشن استعمال کریں۔ کیوں کہ اس شیڈ کی فاؤنڈیشن چہرے کی سرخی کو بھی چھپائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ چہرہ قدرتی سرخی سے بھی محروم نہیں رہے گا لیکن فاؤنڈیشن سے پہلے پرائمر ضرور لگ لینا چاہیے۔

میک اپ کرنے کا طریقہ

1- میک اپ کرنے کے لیے سب سے پہلے چہرے کی تھریڈنگ کریں گے۔ تھریڈنگ کرنے کے بعد چہرے کا مساج کریں۔ اس کے بغیر آپ خوب صورت نہیں لگیں گے۔

2- Neck پر فاؤنڈیشن ایک ہی لیول میں لگایا جاتا ہے۔ ورنہ زیادہ بام ہونے کی وجہ سے دھبہ نظر آئیں گے۔ گردن پر سامنے کی طرف لگانے کے بعد فاؤنڈیشن گردن کے پیچھے اور کندھوں پر بھی اچھی طرح لگائیں۔ Neck سے اوپر کان پر بھی فاؤنڈیشن لگائیں اور کان کے پیچھے بھی تاکہ تمام حصے ایک جیسے نظر آئیں۔

3- اب فاؤنڈیشن گالوں پر لگائیں۔ گالوں پر لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ہاتھوں کو نیچے سے اوپر کی طرف لے جایا جائے۔ ایک گال پر لگانے کے بعد اسی طرح دوسرے گال پر بھی لگائیں۔

4- Cheeks پر لگانے کے بعد Chin پر لگائیں۔

5- پھر آنکھوں پر لباس کی مناسبت سے شیڈز لگائیں۔ بلشر رخسار کے ابھار سے کان کی لوائیں تک پنک اور پیچ کلر کا لگائیں تو نیچرل لگتا ہے اور پھر صاف رنگت کی خواتین ڈارک کلر کی اور گندی رنگت کی خواتین لائٹ کلر کی لپ اسٹک کا استعمال کریں۔ تھوڑی سی توجہ اور محنت سے آپ کی شخصیت پر کشش اور جاذب نظر ہو جائے گی۔

☆.....

5- سیاہ رنگت: جن خواتین کی رنگت سیاہ ہوتی ہے انہیں ہلکے نارنجی یا گلابی شیڈ کی فاؤنڈیشن استعمال کرنی چاہیے۔ اس سے ان کے چہرے پر صحت مند تازگی کا تاثر نظر آنے لگتا ہے۔ بعض خواتین جن کی رنگت سیاہ ہوتی ہے وہ اپنی سیاہ رنگت کو چھپانے کے لیے بہت ہی بھاری قسم کا میک اپ کر رہی ہیں جو مناسب نہیں ہوتا ہمیشہ ہلکے پھلکے میک اپ سے ہی چہرے پر وقار اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

6- گندی رنگت: سفید رنگت پر چاہے ہلکا میک اپ کیا جائے چاہے بھاری اور تیز میک اپ سفید رنگت پر دونوں طرح کا میک اپ چٹا ہے۔ لیکن گندی رنگت کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔ گندی رنگت رکھنے والی خواتین کو بہت سی احتیاط اور سلیقہ سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ ان کا چہرہ بد نما اور رنگ سیاہ نظر آنے لگے گا۔ گندی رنگت والی خواتین کو ابلیز بھ آؤن کی فیکر لائٹ فاؤنڈیشن کا روزا ویل شیڈ استعمال کرنا چاہیے۔ میک اپ کے ماہرین نے اس فاؤنڈیشن کو بہت مفید قرار دیا ہے اور اس سے چہرے پر نکھار پیدا ہوتا ہے۔

7- زرد رنگت: زرد رنگت یا پیلاہٹ مائل رنگت رکھنے والی خواتین کو گلابی اور ہلکے اورنج شیڈ کے امتزاج والی فاؤنڈیشن استعمال کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اس شیڈ کے فاؤنڈیشن لگانے کے بعد ان کے جسم کی جلد کا رنگ چہرے کے رنگ سے زیادہ متضاد نہیں لگے گا۔ اس کے علاوہ دوسرا شیڈ پیلاہٹ مائل براؤن اور گلابی کا بھی لیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں رنگوں کی فاؤنڈیشن کے استعمال سے چہرے پر قدرتی تازگی اور گلابی پن کا احساس پیدا ہوگا اور یوں چہرے کی دلکشی میں بہت زیادہ اضافہ پیدا ہو جائے گا۔

8- سرخی مائل: رنگت رکھنے والی خواتین کے چہرے پر چھوٹے چھوٹے سرخ دھبے بھی نظر آتے ہیں۔ خصوصاً ناک کی نوک، ٹھوڑی، پیشانی اور